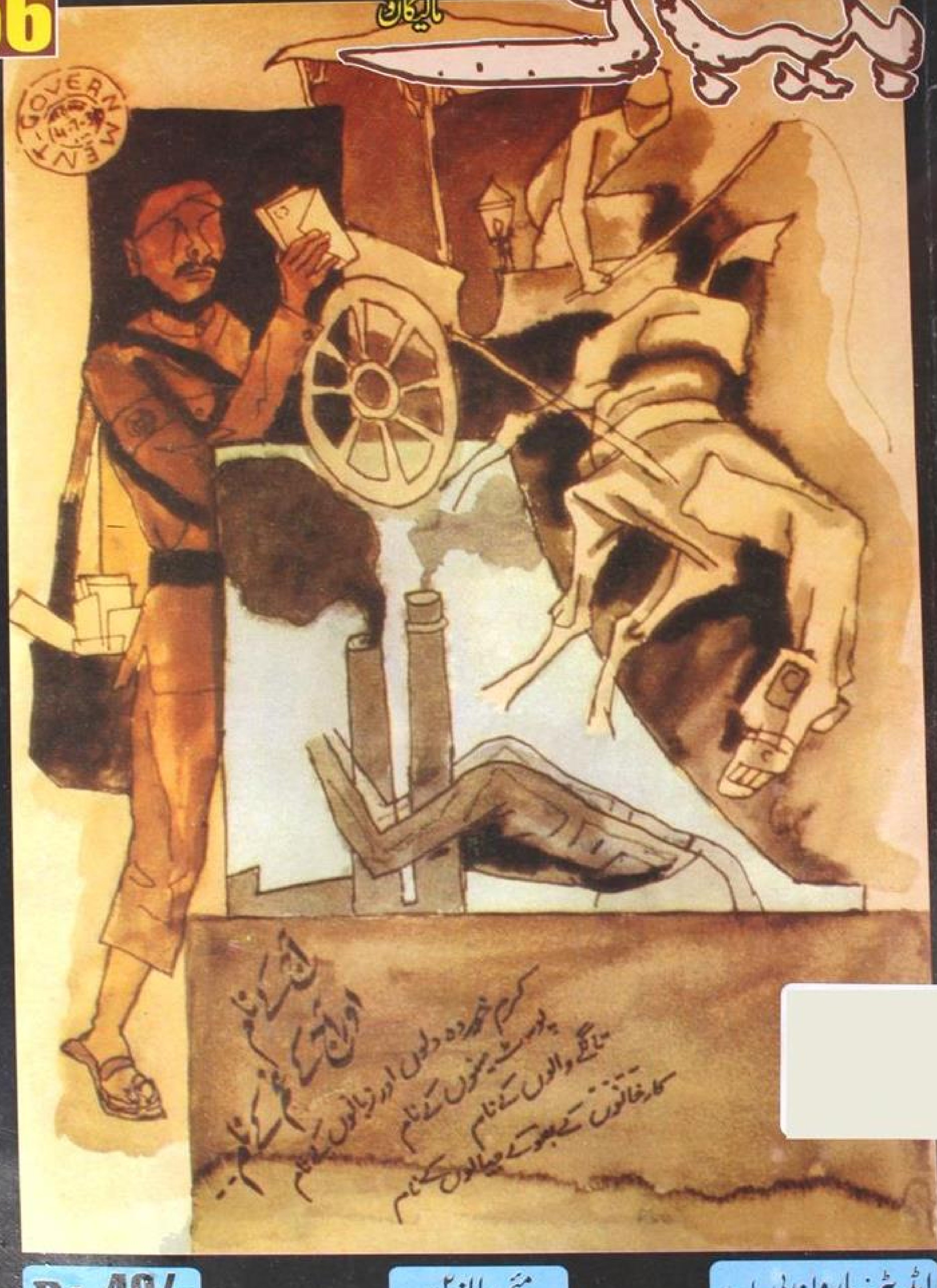
ماہنامہ

بیباک

فیض نمبر

مالیگاؤں

56



Rs.40/-

مئی ۲۰۱۱ء

ایڈیٹر: ہارون بی۔اے

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں کب بات میں تیرا بات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچۂ جاناں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازیٔ عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا! ہارے بھی تو بازی مات نہیں

فیض احمد فیض

ماہنامہ "بیباک" کے لئے نیک خواہشات



(لالہ سیٹھ)

محمد حسن خلیل مومن

پتہ: ۱۰/ بنگال پورہ، بھیونڈی 421320 (ضلع تھانے) فون نمبر: 230643

بقا کی دیکھیے منزل فنا ہے
یہی آئین ہستی ہے تو کیا ہے

ستم ہے ہر ادا گویا ستم ہے
کرم فرما جو مژگاں کی ادا ہے

حریم ذات کے پردے ہٹا دے
بقا کی رمز کیا ہے جانتا ہے

وہ اک جلوہ ہے تیری بے خودی کا
مری رگ رگ میں یہ جس کا نشہ ہے

جمالِ یار میرے روبرو ہو
یہی ہے میری حسرت اور کیا ہے

جدائی بھی ہے اک لذت غضب کی
تڑپنے میں بھی یارو کیا مزہ ہے

غموں کی بھیڑ سے لرزاں ہو عثمان
ابھی تو عشق کی یہ ابتداء ہے

(عثمان جوہری)



عثمان جوہری کے تینوں مجموعے

- **تو ہی تو**
- **روبرو**
- **کو بہ کو**

کے بعد اب عظیم الشان پیمانے پر
طباعت کے مرحلے سے گذرتے ہوئے بہت جلد آپ ملاحظہ فرمائیں گے

جستجو

رابطہ

"آشیانہ" ہیپی ہوم کالونی، اوٹو نگر، نیشنل ہائی وے، جلگاؤں: ۴۲۵۰۰۱ (مہاراشٹر)
موبائیل نمبر: 09371114170

اٹھ کہ اب بزم جہاں کا اور ہی انداز ہے
مشرق و مغرب میں تیرے دور کا آغاز ہے (علامہ اقبال)

ادب اور سماج میں ترقی پسند قدروں کو قدم قدم پر بڑھاوا دینے میں

"ماھنامہ بیباک" کا ایک زبردست رول ھے

"جشن فیض صدی" کے پرمسرت موقع پر میں مدیر محترم

جناب ھارون بی اے

و ادارۂ بیباک کے دیگر اراکین کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں



زاھد حسین عبدالحئی

اسکول بورڈ ممبر، میونسپل کارپوریشن، دھولیہ
صدر پازیٹیو تھنکرس سوسائٹی
سکریٹری جمعیۃ العلماء، دھولیہ

چاند چھوؤ یا سورج پکڑو، رکھو یہ بھی دھیان تنک
میرے عہد کے دانا بچو، بڑوں کا بھی سمان تنک

گاؤں، گلی، یہ کنج یہ سائے کل سپنے ہو جائیں گے
پل بھر ان سے لپٹ کر رو لیں، رک جا گاڑی بان تنک

اپنے ساتھ بھی اک لشکر ہے، یادیں، درد، خلش، احساس
دیکھیں گے ہم بھر کا کس بل، پھیلے تو میدان تنک

مخلص:
زاہد حسین عبدالحئی
تاشہ گلی نمبر ۷، دھولیہ ۴۲۴۰۰۱ (مہاراشٹر)
موبائیل نمبر: 9822295009
آفس: (02562)233185

جشن فیض صدی پر خصوصی نمبر

----- اس شمارے میں -----

Reg No. RNI-MAHURD/2006/18722
Postal Regd.
No.L-1/RNP/MGN-101/2006-2010
Ph:(02554)238844,Cell:9273444155

ماہنامہ **بیباک** مالیگاؤں

جلد نمبر 5 - شمارہ نمبر 56 - مئی ۲۰۱۱ء

ایڈیٹر : ہارون بی اے

معاون مدیر : احمد عثمانی

منیجر و سرکولیشن منیجر : ریاض احمد، آصف اکس

ترتیب و تزئین : فردوس کمپیوٹرس 8149459195

سرورق : فردوس کمپیوٹرس 8149459195

طباعت : اقصیٰ آفسیٹ پریس، ملاباڑ و روڈ، مالیگاؤں

ٹائٹل پرنٹنگ : اقصیٰ آفسیٹ پریس، ملاباڑ و روڈ، مالیگاؤں

زر سالانہ: ● ہندوستان -/150 روپے (فی کاپی -/15 روپے)
● پاکستان -/300 روپے (فی کاپی: -/30 روپے)
● دیگر ممالک -/30 امریکی ڈالر ...... پاؤنڈ -/20
● سرکاری اداروں، اردو اکیڈمیوں اور لائبریریوں سے زر سالانہ -/200 روپے (فی کاپی -/20 روپے)

منی آرڈر اور ڈیمانڈ ڈرافٹ
MAHNAMA BE-BAAK
کے نام ارسال کریں

خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ: ہارون بی اے، ایڈیٹر ماہنامہ "بیباک"
18/6/2، صابر ستار کمپاؤنڈ، اولڈ آگرہ روڈ، مالیگاؤں 423203 مہاراشٹر

Correspondence & Annual Subs. Address:
HAROON B.A.
(Editor Mahnama "Bebaak")
S.No.18/6/2, Sabir Sattar Compound,
Old Agra Road, Malegaon - 423203
Maharashtra (INDIA)
e-mail:mahnamabebaak@yahoo.com

پرنٹر، پبلشر، ایڈیٹر ہارون بی اے نے اقصیٰ پرنٹنگ پریس، ملاباڑ و روڈ، مالیگاؤں سے چھپوا کر سروے نمبر 18/6/2، صابر ستار کمپاؤنڈ، اولڈ آگرہ روڈ، مالیگاؤں سے شائع کیا۔

مقالات و مضامین:

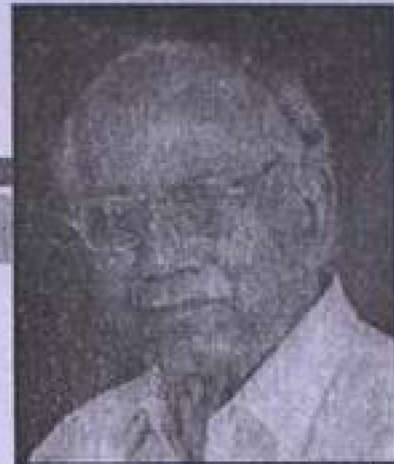
نظمیں و غزلیں:

متفرقات (رپورٹ)

تبصرے — الیاس صدیقی اور احمد عثمانی

☆☆☆

گفتگو



فیض نمبر شائع کرنے کا اصل مقصد

فیض نمبر حاضر خدمت ہے۔ دیکھئے۔۔۔ پڑھئے۔۔۔ سر دھنئے اور فیض کو آج کے تناظر میں تولنے کی کوشش کیجئے۔ ہم نے اپنے اس (مختصر) خصوصی شمارہ میں کوشش کی ہے کہ فیض کے ہم عصر اور بعد کے سینئر اور بزرگ ادیبوں سے زیادہ نئے لکھنے والوں کو یہ نمبر زیادہ متاثر کر سکے۔ نئے ادیب فیض کی زندگی کے مختلف گوشوں کو سمجھ جائیں۔ ملکی اور بیرونی ان کی تعلیمی، سماجی اور سیاسی جدوجہد، عام طبقات سے ان کا ربط، ان کی محنت، غربت، افلاس اور فاقہ کشی پر فیض کا عمیق مشاہدہ اور پھر ان جذبات و احساسات کو خوبصورت اور حسین الفاظ میں شاعری کا جامہ پہنانا فیض کا ہی حصہ تھا۔

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گذرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

”تلخیٔ ایام“ بڑھتی رہی اور ”اہل ستم“ کی ”مشق ستم“ بھی جاری رہی لیکن فیض کے پائے استقلال میں کہیں بھی کمی محسوس نہیں ہوتی بلکہ اہل ستم سے مقابلہ کرتے ہوئے انہوں نے قید و بند کی مصیبتوں کو بھی جھیلا۔ ان پر فوجی حکمرانوں نے پابندیاں بھی عائد کیں۔ نشریہ اور رسالوں اور اخبارات میں شائع ہونے پر پابندی اور آخر انتہا یہ رہی کہ ایک جھوٹے سازشی کیس کے ذریعے انہیں چار سال سے زائد سلاخوں کے پیچھے نظر بند رکھا گیا لیکن جیل کے اندر بھی ان کا سلسلہ شاعری جاری رہا۔ ”زنداں نامہ“ اس کی مثال ہے۔

محنت کشوں سے ان کا رشتہ استوار رہا۔ ایک نظم ”آج کے نام اور آج کے غم کے نام“ اس کی غماز ہے کہ اس میں انہوں نے اس میں انہوں نے ”کلرکوں کی افسردہ جانوں، پوسٹ مینوں، تانگے والوں، ریل بانوں، کارخانے کے بھوکے جیالوں، دہقانوں، دکھی ماؤں، حسیناؤں، بیواؤں، اسیروں کے تمام دکھ درد کو شاعری کا حصہ بنا دیا۔ پھر آنے والے سفیروں سے یوں مخاطب ہیں:

آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں

غرض آج کی ادبی نسل اور خصوصاً شعراء اور شعر و ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو فیض کا گہرا مطالعہ کرنا چاہئے اور سمجھنا بھی چاہئے۔ ”نسخہ ہائے وفا“ ان کی کلیات ہے جس میں ان کے آٹھوں مجموعہ کلام شامل ہیں۔

اب آئیے۔۔۔ فیض نمبر کی جانب۔۔۔ حتی المقدور کوشش کی کہ تمام اعلان شدہ مواد شامل ہو جائیں لیکن ڈیڑھ سو صفحات میں ممکن نہیں۔ سرمایہ اور وقت کی کمی۔۔۔ ایک جانب فیض نمبر کے لئے اشتہارات جمع کرنا اور دوسری جانب ”جشن فیض صدی“ کا بوجھ ہمارے اوپر مسلط رہا۔ آپ کے مدیر کی پچاس ساٹھ سال سے عادت رہی ہے کہ کوئی بھی مشن، پروگرام یا تقریب کا اہتمام کرنا ہو، اسے سمجھا جائے کہ

گفتگو

کرنا ہی ہے۔ وقت کی ضرورت ہے۔ اس کے جیب میں ایک پیسہ بھی نہ ہو، اس کا اعلان پہلے کر دیا جاتا ہے۔ میٹنگ بعد میں بلا کر بجٹ بنایا جاتا ہے۔ اس کے بعد پیسہ بھی جمع ہوتا ہے اور پروگرام بھی کامیاب ہوتا ہے۔

زیر مطالعہ فیض صدی نمبر میں اعلان کے مطابق فیض اور دوسرے ادیبوں کی عکسی تحریریں، مضامین، کارٹون وغیرہ لاکھ کوششوں کے بعد بھی شامل نہیں کئے جاسکے جس کا ہمیں دکھ ہے۔ آئندہ موقع بہ موقع ہمارا وعدہ ہے کہ انہیں شامل کیا جائے گا۔

مجھے فخر ہے کہ ہندوستان کا یہ واحد رسالہ "ماہنامہ بیباک" ہے جو آج اس عظیم شاعر کا خصوصی نمبر شائع کر رہا ہے۔ اس میں دورائے نہیں کہ آج پابندی سے رسالہ جاری رکھنا ہی محال ہے تو خصوصی شمارہ نکالنا تو اور بھی مشکل ہے۔ پھر بھی جہاں تک حوصلہ اور ہمت ہے تو یہ عمل تو جاری رہے گا۔

ہارون بی اے (مدیر)

۲۲ر اپریل ۲۰۱۱ء

ماہنامہ بیباک کا فیض نمبر

درج ذیل رسائل، جرائد اور
خصوصی مضامین سے استفادہ کیا گیا



نقوش (لاہور) .... فیض کا خصوصی نمبر
فن اور شخصیت (ممبئی) .... فیض کا خصوصی نمبر
افکار (کراچی) .... فیض کا خصوصی نمبر
نسخہ ہائے وفا (کلیات فیض)
ترقی پسند ادب نمبر (گفتگو) .... علی سردار جعفری

اور

دیگر مختلف رسائل و مضامین

(ادارہ بیباک)

ادباء، شعراء،
سرپرست حضرات،
عطیہ دہندگان، مشتہرین
اور جشن فیض صدی اراکین کا

شکریہ

آپ تمام حضرات نے میری ہر طرح دامے، درمے، قدمے، سخنے اعانت کی ورنہ اس ناتواں جسم میں تنہا اتنا بڑا بوجھ اٹھانے کی سکت نہ تھی۔ آپ لوگوں کی محبت، مجھ سے وابستگی، میرے کاز سے ہمدردی اور معاونت میرے لئے مددگار بنی کہ 'فیض نمبر' بھی نکل گیا اور اتنا بڑا جشن بھی برپا ہو گیا۔

ہمیشہ آپ کا

ہارون بی اے

(مدیر، ماہنامہ بیباک)





فیض کا شباب۔ ۱۹۳۳ء میں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے کرنے کے بعد

فیض جنیوا کی بین الاقوامی کانفرنس میں پاکستانی مندوب کی حیثیت سے (۱۹۴۹ء)



فیض، ایلس فیض ہمراہ، راولپنڈی سازش کیس سے رہائی کے فوراً بعد (۱۹۵۵ء)



فیض، پاکستان ٹائمز کرکٹ کلب کے بیٹس مین کی حیثیت سے فیلڈ میں (۱۹۵۶ء)

فوٹو البم



منیزہ، فیض، ایلس فیض اور سلیمہ



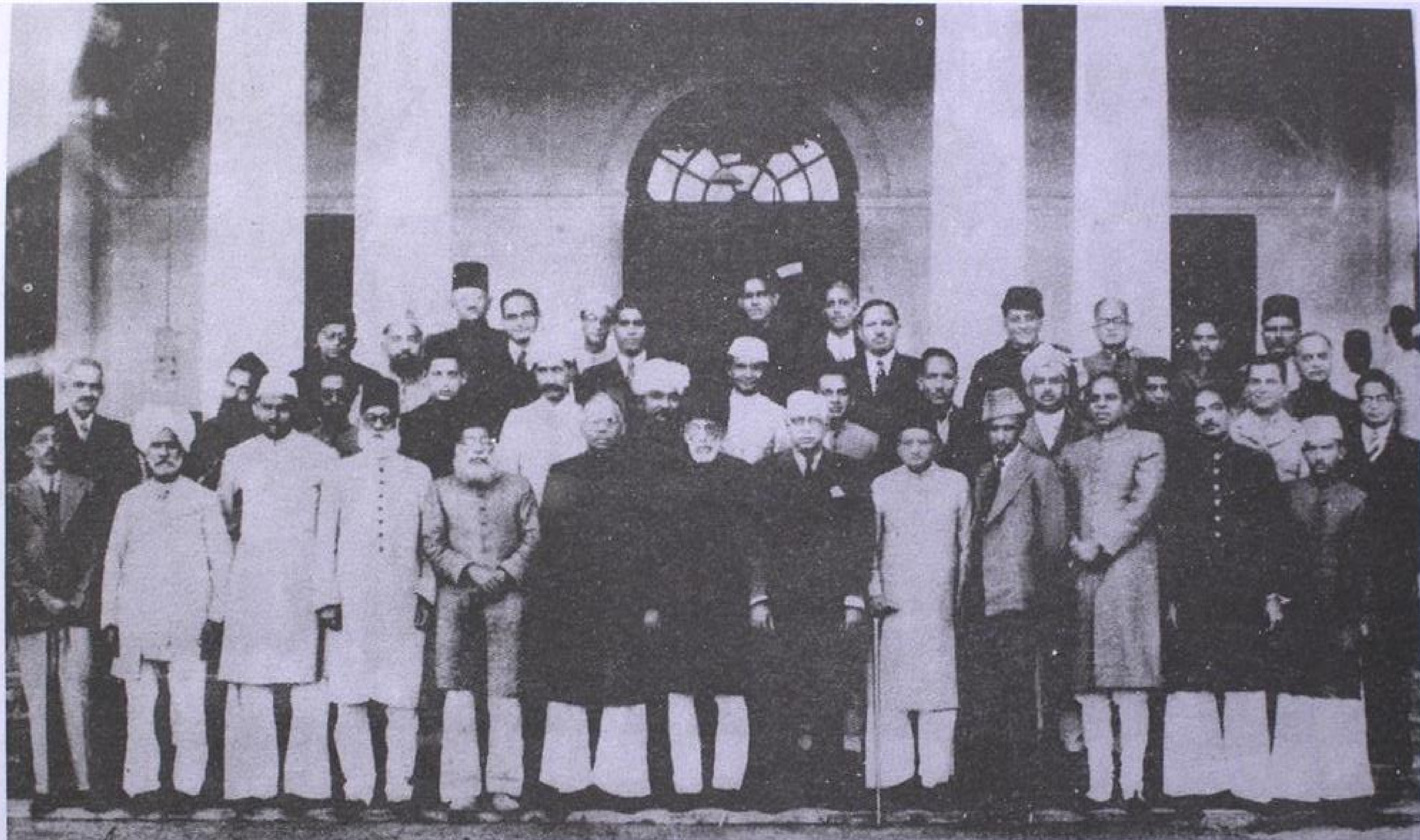
ایلس فیض، منیزہ، سلیمہ اور فیض



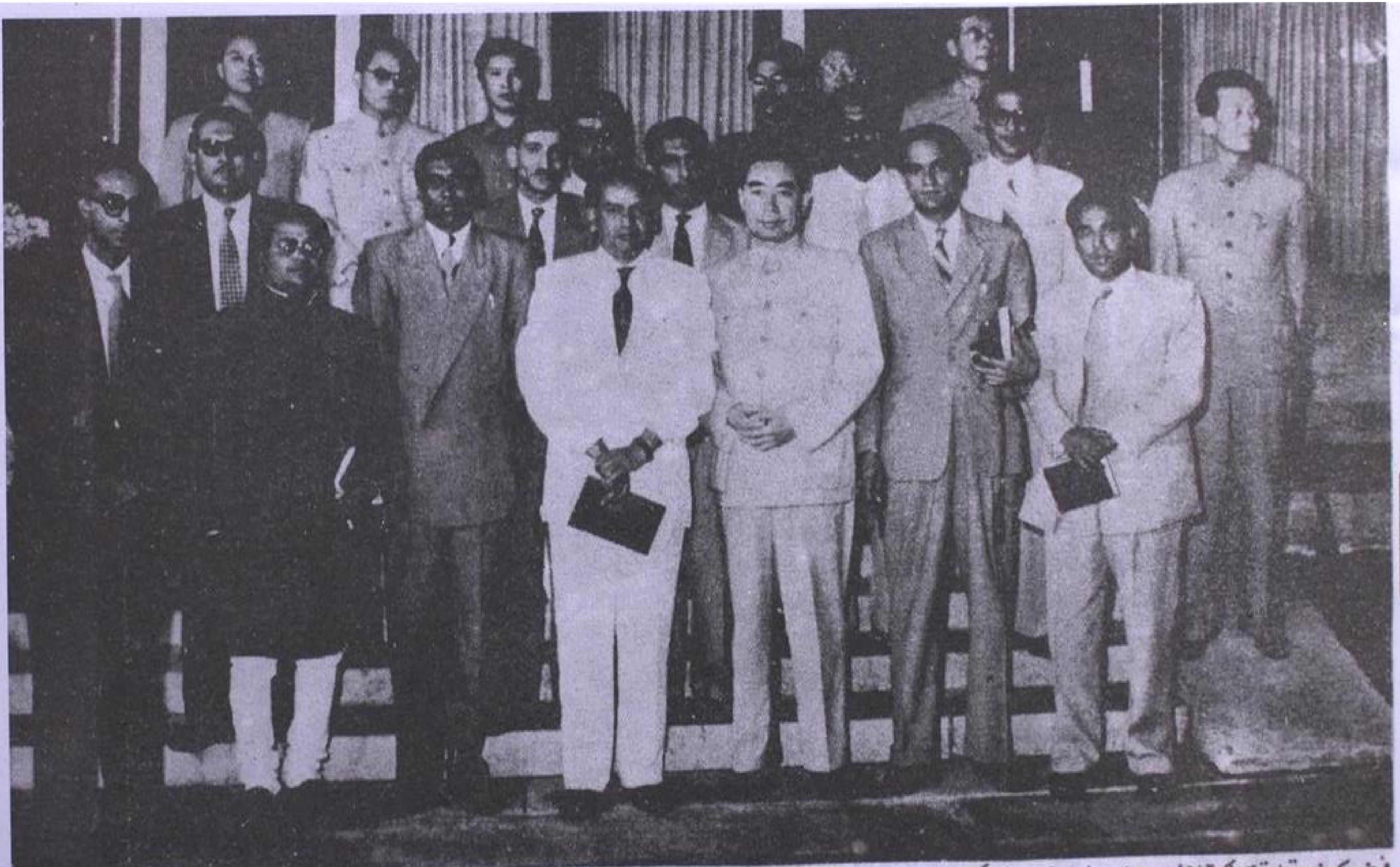
لاہور کے ہوائی اڈے پر روسی ادیبوں کے
وفد کے ہمراہ (۱۹۴۹ء)
دائیں جانب تیسرے نمبر سے:
احمد ندیم قاسمی، حمید اختر، ممتاز حسین اور فیض



کل پاکستان پوسٹ مین یونین کے صدر کی حیثیت سے
لاہور میں کل پاکستان پوسٹ مین یونین کے ایک اجلاس میں
فیض کی صدارتی تقریر (۱۹۴۹ء)



سر سلطان احمد کی قیام گاہ دھلی کے مشاعرہ منعقدہ ۱۹۴۱ء کی ایک یادگار تصویر۔ پہلی صف: (دائیں سے) رَوش صدیقی۔ حیات اللہ انصاری۔ حفیظ جالندھری۔ سیماب اکبرآبادی۔ سر رضا علی۔ ثاقب لکھنوی۔ سر سلطان احمد۔ حسرت موہانی۔ مولوی عبدالحق۔ احسن پکھونڈوی۔ جوش ملسیانی۔ حیرت شملوی۔ دوسری صف: ممتاز حسن۔ مجید ملک۔ جلیل قدوائی۔ اسد ملتانی۔ عبدالعزیز فطرت۔ فیض احمد فیض۔ ڈاکٹر عابد حسین۔ عرش ملسیانی۔ تلوک چند محروم۔ بہزاد لکھنوی۔ حسن فیروز۔ تیسری صف: زاہد حسین۔ غلام محمد۔ خواجہ عبداللہ۔ ایشور دیال۔ شجاعت علی صدیقی۔ اے ڈی اظہر۔ پروفیسر محمد مجیب۔ چودھری محمد علی۔ عبدالرحمن صدیقی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ آنند نرائن ملا۔



فیض کی زیر قیادت پاکستانی صحافیوں کا وفد پیکنگ میں چین کے وزیراعظم چو این لائی کے ساتھ (۱۹۵۶ء) پہلی صف دائیں سے :- ..... میر خلیل الرحمن،
چو این لائی، فیض، محسن علی - اور آخر میں مختار زمن - عقب میں احمد ندیم قاسمی، عمر قریشی، مولوی اختر علی، ظفر نیازی، قطب الدین عزیز اور دوسرے



ایک قطعہ ایک ترجمہ - فیض از فیض (آرٹسٹ ضیا)



فیض - لینن امن انعام کمیٹی کے صدر پروفیسر کیبلٹن کے ساتھ (۱۹۶۲ء)
ماسکو میں تقسیم انعام کی تاریخی تقریب



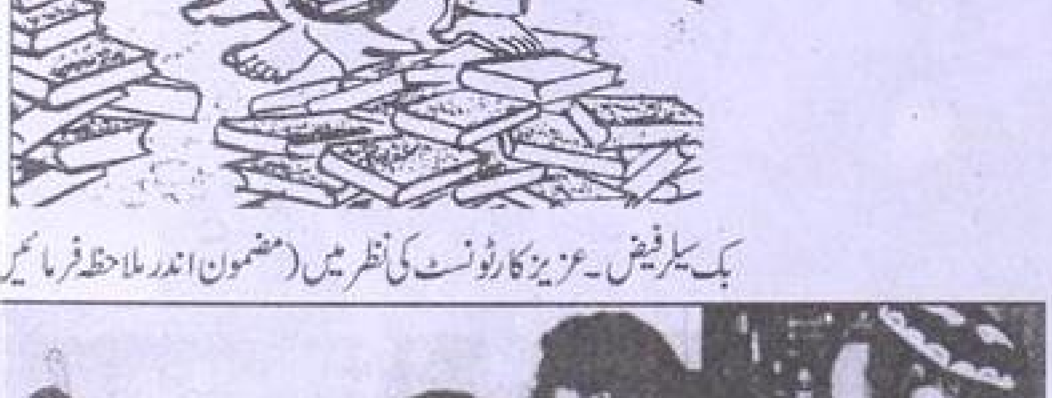
بک سیلر فیض - عزیز کارٹونسٹ کی نظر میں (مضمون اندر ملاحظہ فرمائیں)

Samota

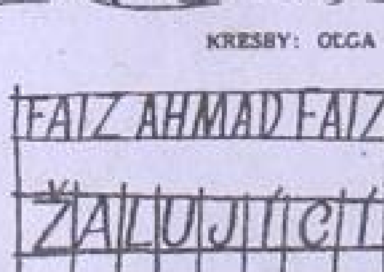
Čuj, srdce moje, ktosi prichádza... Nie... nik.
Snáď pútnik, čo sa niekde inam zberá.
Noc plynie, hviezdy blednú. Krčma žerá,
zo steny padá svit kahancov znavených.
Po dlhom čakaní už cesty zaspali.
Tajomný prach už zavial všetky stopy.
Zhas svetlo, vezmi džbán a víno, dopi,
a zatvor dvere, čo celú noc čakali,
teraz už nikto, nikto nepríde...



KRESBY: OLGA HOFFSTÄDTEROVÁ



تاشقند میں مشہور ادیب موسیٰ ایبک کے گھر ایک دعوت
دائیں سے: موسیٰ ایبک، ان کی صاحبزادی، فیض اور حفیظ جالندھری (۱۹۵۸ء)



فیض کے انتخاب کلام مطبوعہ چیکوسلواکیہ کا سرورق

فیض کی نظم "تنہائی" سلواک زبان میں



بائیں سے: فلم اسٹارراج کپور، سلطانہ جعفری، فیض، سردار جعفری، عصمت چغتائی اور محمد زبیر (بمبئی)



قتیل شفائی، کشمیری لال ذاکر، فیض اور ساحر لدھیانوی (ہندو پاک مشاعرہ دہلی ۱۹۵۶ء)



ایشیائی کانفرنس دہلی کے دوران
دائیں سے: سردار جعفری، نیاز حیدر، فیض،
بیگم قدسیہ زیدی، جتیندر کمار، آل احمد سرور،
بیگم زیدی کے گھر (۱۹۵۶ء)



فیض اور ہندوستان کی مشہور اداکارہ نرگس (ممبئی)



فیض پاکستانی فلم اسٹار یاسمین کے ساتھ (لاہور)

سہرا

فیض

فیض اور سہرا۔ جی ہاں! بات کچھ عجیب سی ہے لیکن اس حقیقت سے کیسے انکار ممکن ہے کہ غالب کی طرح فیض نے بھی سہرا لکھنے کی رسم نباہی ہے اور اس میں بھی اس کا منفرد اسلوب نمایاں ہے۔ اس سہرے کے مخاطب طاہر نعیم (جو فیض کے استعفیٰ دینے کے فوراً بعد آرٹ کونسل لاہور کے سکریٹری مقرر ہوئے) اور یاسمین امتیاز (دختر سید امتیاز علی تاج) ہیں جن کی تقریب شادی ۲۴ر مارچ ۱۹۶۲ء کو لاہور میں منعقد ہوئی۔ یہ غیر مطبوعہ سہرا ابلا شبہ خامے کی چیز ہے جسے "افکار" نے دریافت کر کے "فیض نمبر" کے لئے بدقت حاصل کیا تھا۔ اب آپ کی خدمت میں پیش ہے۔ (ادارہ)

سجاؤ بزم ، درِ مے کدہ کشادہ کرو
اٹھاؤ سازِ طرب ، اہتمامِ بادہ کرو
جلاؤ چاند ستارے ، چراغ کافی نہیں
یہ شب ہے جشن کی شب ، روشنی زیادہ کرو
بساطِ لطف و محبت ، پہ آج یار ملے
دعا کو ہاتھ اٹھاؤ کہ وقت نیک آیا
رخِ عزیز پہ سہرے کے آج پھول کھلے
اٹھاؤ ہاتھ کہ یہ وقت خوش مدام رہے
تمہارا صحن منور ہو مثل صحن چمن
اور اس چمن میں بہاروں کا انتظام رہے

(۲۴ مارچ ۱۹۶۲ء)

فیض کی ایک عکسی تحریر

فیض

دل فگارو چلو

چشمِ نم، جانِ شوریدہ کافی نہیں،
تہمتِ عشقِ پوشیدہ کافی نہیں،
آج بازار میں پا بجولاں چلو
دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو۔
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو،
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو،
خلوتِ خاص بھی، مجمعِ عام بھی،
تیرِ الزام بھی، سنگِ دشنام بھی،
صبحِ ناشاد بھی، روزِ ناکام بھی،
ان کا دمساز اپنے سوا کون ہے،
شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے،
رختِ دل باندھ لو دل فگارو چلو،
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو،

(لاہور ۲۵ر اپریل ۱۹۵۹ء)

بچوں کے لئے - فیض

بہت کم حضرات کو علم ہوگا کہ فیض نے بچوں کے لئے بھی نظمیں کہی ہیں۔ ذیل میں ہم ان کی ایک نہایت خوبصورت اور یادگار نظم پیش کر رہے ہیں۔ یہ فیض کی شاعری کا ایک نیا رخ ہے جو اب تک تاریکی میں تھا۔ (ادارہ)

ایک منیزہ ہماری بیٹی ہے ، جو بہت ہی پیاری بیٹی ہے
ہم ہی کب اس کو پیار کرتے ہیں ، سب کے سب اس کو پیار کرتے ہیں
کیسے سب کو نہ آئے پیار اس پر ، ہے وہی تو ہماری ڈکٹیٹر
پیار سے جو بھی جی چرائے گا ، وہ ضرور اس سے مار کھائے گا
خیر یہ بات تو ہنسی کی ہے ، ویسے سچ مچ بہت وہ اچھی ہے
پھول کی طرح اس کی رنگت ہے ، چاند کی طرح اس کی صورت ہے
جب وہ خوش ہو کے مسکراتی ہے ، چاندنی جگ میں پھیل جاتی ہے
پڑھنے لکھنے میں خوب قابل ہے ، کھیلنے کودنے میں کامل ہے
عمر دیکھو تو آٹھ سال کی ہے ، عقل دیکھو تو ساٹھ سال کی ہے
پھر وہ گانا بھی اچھا گاتی ہے ، گرچہ ہم کو نہیں سناتی ہے
بات کرتی ہے اس قدر میٹھی ، جیسے ڈالی پہ کوک بلبل کی
ہاں کوئی اس کو جب ستاتا ہے ، تب ذرا غصہ آ ہی جاتا ہے
پر وہ جلدی سے من بھی جاتی ہے ، کب کسی کو بھلا ستاتی ہے
ہے شگفتہ بہت مزاج اس کا ، سارا عمدہ ہے کام کاج اس کا

ہے منیزہ کی آج سالگرہ ، ہر طرف شور ہے مبارک کا
چاند تارے دعائیں دیتے ہیں ، پھول اس کی بلائیں لیتے ہیں
باغ میں گا رہی ہے یہ بلبل ، تم سلامت رہو منیزہ گل
امی ابا بھی اور باجی بھی ، آنٹیاں اور بہن بھائی بھی
آج سب اس کو پیار کرتے ہیں ، مل کے سب بار بار کہتے ہیں

پھر یونہی شور ہو مبارک کا
آئے سو بار تیری سالگرہ
سو تو کیا سو ہزار بار آئے
یوں کہو ، بے شمار بار آئے
لائے ہر بار اپنے ساتھ خوشی
اور ہم سب کہا کریں یوں ہی
یہ منیزہ ہماری بیٹی ہے
یہ بہت ہی پیاری بیٹی ہے

(۱۹۵۰ء)

یادوں کے سائے

ایلس فیض
ترجمہ: سید ابوالخیر کشفی

یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ کسی ایسے شخص کے بارے میں معروضی بن کر بات کی جائے جو چوبیس سال تک رگ جاں کی طرح ساتھ رہا ہے۔ ایک ایسا شخص جو میرا شوہر ہے۔

فیض پر لکھتے وقت ذاتی باتیں اور مشترک تجربات کرشمہ کی طرح دامن دل کو کھینچتے ہیں لیکن جب انتخاب کا یہ مرحلہ آجائے کہ "کیا لکھوں" تو وہی باتیں چننی چاہئیں جو دوسروں کی زندگی پر اپنے اثرات مرتب کرسکیں۔ دوسروں کے دلوں کو یوں چھولیں کہ ان کا لمس تبسم اور قہقہہ کی تحریک بن سکے۔ یہی نہیں بلکہ وہ باتیں آنسوؤں کی سرحد تک پہنچادیں۔

میں ماضی کی طرف دیکھتی ہوں اور میری نگاہیں ناگزیر طور پر زنداں کے دروازوں سے ہوکر ماضی تک پہنچتی ہیں۔ جیل کے یہ سال ہماری باہمی زندگی میں ایک رخنہ کی طرح نظر آتے ہیں۔ مگر ان برسوں نے ہم دونوں کو وہ کچھ دیا ہے جو کسی طرح بھی ہم حاصل نہیں کرسکتے تھے۔ چند سال جن میں گھٹنوں چلتی ہوئی ایک بچی، چھوٹی سی لڑکی بن گئی جن میں ایک لڑکی آہستہ آہستہ نوجوان خاتون بن گئی۔ جن میں زندگی کے ایک اچانک موڑ کی طرح "کسی" کے سر کے بالوں پر سفیدی غالب آگئی اور کسی کے چہرے پر جھریاں۔ آہستہ آہستہ اپنا جال بنتی رہیں۔ زنداں کے دروازے ہمارے درمیان حائل تھے لیکن ان دروازوں میں داخل ہوتے ہوئے، ان سے نکلتے ہوئے، زنجیروں کی جھنکار اور تالوں میں کنجیوں کے گھومنے کی آواز کے ساتھ زنجیر و سلاسل کے یہ ایام اپنے جلو میں مسرت سے بھرپور لمحے لے کر آئے۔ ناقابل یقین طور پر خوشیوں سے گل بداماں لمحے۔ میں ان دنوں کے غم بلکہ غموں کی بات نہیں کروں گی۔ کیوں کہ موت (اور غم) نے اپنی خواہشیں ہم دونوں کو دی ہیں۔ میں تو خوشی کے لمحوں کی یاد تازہ کرنا چاہتی ہوں تاکہ سورج کی روشنی سے یہ بیتے ہوئے لمحات جگمگا اٹھیں حالانکہ میں جانتی ہوں کہ سائے بھی اتنے ہی عزیز ہوتے ہیں۔

جب مارچ کی ایک صبح کو فیض نے مجھے اور سوتے ہوئے بچوں کو خدا حافظ کہا تو میرے سامنے سب سے پہلا اور سنگین مسئلہ یہ تھا کہ چار سو روپے ماہانہ کی آمدنی سے گھر کو کیسے چلایا جائے گا؟ بادل ناخواستہ ہم نے شفیع اللہ کے علاوہ دوسرے پرانے نوکروں کو الگ کردیا۔ شفیع اللہ جو اب بھی ہمارے ساتھ ہے۔ فیض کی سراپا اخلاص سوتیلی بہن بالی ہمارے ساتھ رہنے کے لئے آگئی۔ تاکہ وہ بدلے ہوئے حالات میں زندگی بسر کرنے میں میری مدد کرسکے۔ پہلی ضرب ہمارے بچوں پر پڑی۔ کونن میری کالج سے ان کا نام کٹوا کر کنیارڈ مشن اسکول میں داخل کرانا پڑا۔ مجھے تو اس بات کا اندازہ بعد میں ہوا کہ یہ فیصلہ ہماری بچیوں کے لئے کتنا سودمند ثابت ہوا۔ منیزہ اکثر مجھے برا بھلا کہتی۔ "جب ابو یہاں تھے تو میرے پاس ایک آیا تھی۔ اسکول میں جھولے تھے۔ چکر گھنی تھی۔ طرح طرح کے کھیل تھے۔۔۔" اپنے نئے ماحول میں اسے فرش پر بیٹھنا پڑتا لیکن دعا کے نئے طریقوں نے اس میں ایک عجیب سا ذہنی اور نفسیاتی ہیجان پیدا کر دیا تھا۔ میری تند کے احتجاج کے باوجود وہ رات کو سونے سے پہلے اپنے گھٹنوں پر جھک کر نیم رکوع کے سے عالم میں آسمانی باپ کی حمد۔ بگڑی ہوئی اور قدرے مضحک اردو میں سناتی۔ ایک رات جب وہ اپنے خالق سے مصروف کلام تھی اور ہم اسے سلانے کے لئے منتظر تھے، اس نے کہا۔ "اور آسمانی باپ۔۔۔۔ تم جو حیدرآباد جیل میں ہو، جلدی سے واپس آجاؤ۔" جب ہم نے اپنی گھٹی ہوئی ہنسی پر قابو پالیا اور منیزہ کی باقی دعا سن لی تو اسے بستر میں لٹادیا۔ پھر اسے (نیم بیداری کے عالم میں) یہ کہتے ہوئے سنا۔ "باجی۔۔۔۔ بہت جلد سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔"

جیل میں ملاقات کی اجازت مدتوں کے انتظار کے بعد ملتی اور ہر ملاقات کی یاد (اگلی ملاقات تک) ہم سینے سے لگائے رہتے۔ اگلی ملاقات تک ہر پچھلی ملاقات کی ایک ایک نگاہ، ایک ایک لفظ، ایک ایک جنبش کو ذہن و دل ایک متاع عزیز کی طرح محفوظ رکھتے۔ یہ ملاقاتیں دو تین مہینے میں ایک بار ہوتیں۔ ہر ملاقات کے لئے ہمیں صحرائے سندھ کی وسعتوں کو طے کرنا پڑتا۔ یہ سفر تھکا دینے والے بھی تھے اور پھر اس تھکن پر اخراجات کا اضافہ کیجئے۔ جیلر ہر ملاقات کی نگرانی کرتا۔ خاص طور پر میری ملاقات کی نگرانی کیوں کہ مجھے "ممکنہ" معلومات کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا۔ ہم ملاقات کے ان لمحوں کو ہلکے پھلکے واقعات اور دوستوں کے پیغامات سے شیریں تر بناتے تاکہ ان کا بوجھ لطافت تلے دب جائے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک ملاقات کے موقع پر جب میں ایک کہانی سنا رہی تھی ہمارا جیلر اس کہانی کی دلچسپیوں میں یوں گم ہوگیا کہ جب سنتری اور جیلر کی ڈیوٹی کا وقت پورا ہوگیا تو اس نے دوسرے جیلر سے کہا۔ "ابھی تھوڑی دیر ٹھہر جاؤ۔ میں اس کہانی کا انجام تو سن لوں۔"

دوستوں نے مجھ سے اکثر پوچھا کہ بھلا کسی غیر کی موجودگی میں باتیں کیسے ہوتی ہوں گی؟ دو دلوں کی ملاقات کے درمیان ایک تیسرا وجود۔ ہر بات سنتا ہوا آدمی۔ سچ پوچھئے تو ہمیں اکثر کسی اور کی موجودگی کا احساس ہی کب ہوتا تھا۔ ہاں کبھی کبھی حجاب

درمیان کی موجودگی، ملاقات کو آلودہ کردیتی تھی۔ جیسے شروع شروع میں جیلر صاحب میرے اور فیض کے درمیان بیٹھنے پر اصرار فرماتے تھے۔

فیض کی گرفتاری اور ان کی غیر قانونی قید تنہائی (میں غیر قانونی اس لئے کہہ رہی ہوں کہ ایک مقررہ مدت سے زیادہ کسی شخص کو قید تنہائی کے عذاب میں مبتلا رکھنا غیر قانونی ہے) کے تین ماہ بعد میں اپنی دونوں بچیوں کے ساتھ ان سے ملنے لائل پور جیل گئی۔ ہمیں سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں پہنچا دیا گیا۔ اس نے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتادیا۔ پھر اس نے ہم تینوں کو دیکھا۔ مجھے اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس لمحہ ہم بہت تنہا، مایوس وملول اور دل گرفتہ نظر آرہے تھے۔ جیسے ہمارے چہرے ہماری ذہنی کیفیت اور زندگی کے آئینے بن گئے ہوں۔ سپرنٹنڈنٹ نے مجھ سے پوچھا" آپ کی یہی دو بچیاں ہیں؟" میں نے اسے بتایا کہ یہی بچیاں ہماری متاع ہیں۔ ہماری زندگی کا حاصل ضرب۔ اس نے جھجکتے ہوئے سوال کیا "کوئی لڑکا نہیں ہے؟" میں نے نفی میں گردن ہلائی۔ اس نے ایک آہ بھری۔ ایک طویل آہ۔ پھر میری طرف دیکھا اور کہا "کیسے افسوس کی بات ہے۔ کیسی افسوسناک بات۔۔۔" اس کے لہجے سے مجھے یہ احساس ہوا جیسے اب کسی بیٹے کی ماں بننا میرے مقدر میں نہیں جیسے میرا سہاگ لٹ چکا ہو!

اور جب فیض کمرے میں داخل ہوئے تو دونوں بچیاں دوڑتی ہوئی ان کی آغوش میں سما گئیں۔ منیزہ نے جیسے بڑبڑاتے ہوئے کہا" ابو! وہ کہتے تھے کہ آپ کے ہاتھ اور پیر کاٹ ڈالے جائیں گے!" وہ کون تھے یہ مجھے کبھی نہیں معلوم ہوسکا لیکن اس لمحے جب ہماری (میری اور فیض کی) نگاہیں ایک دوسرے سے ملیں تو ہمیں معلوم ہوا کہ بے یقینی کے تجربے اور خوف سے ہم ہی نہیں گزرے تھے (بلکہ ہماری بچیاں بھی بے یقینی کے کرب میں مبتلا تھیں)

حیدر آباد تک ہمارے سفر کا مطلب تھا زیادہ ملاقاتیں۔ ان موقعوں پر ہم سہروردی مرحوم کے ساتھ قیام پذیر ہوتے جو "ملزم" کی قانونی پیروی کررہے تھے۔ سلیمہ اور منیزہ سہروردی صاحب سے جیسے بے ساختہ پیار کرنے لگیں اور ان سے قریب ہوتی گئیں۔ سہروردی مرحوم بچیوں کے لئے رقص کی موسیقی کی دھن پر والٹز کرتے۔ دائرہ میں رقص۔ ایک دن سلیمہ نے اپنے سر کو جھٹکتے ہوئے کہا" آج میں نہیں ناچوں گی" لیکن منیزہ فوراً اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ سہروردی صاحب نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا اور پرانی دنیا کے آداب کی سراپا تصویر بن کر جیسے رقص کی فرمائش کرتے ہوئے قدرے جھکے۔ منیزہ نے ایک نوجوان خاتون کی طرح جھک کر اس درخواست کو قبول کرلیا۔ سہروردی صاحب کا چہرہ بشاشت سے کھل اٹھا اور وہ دونوں کمرے میں ایک آہستہ اور مدھم سے فرانسیسی انداز کے شاہانہ رقص (muret) میں مصروف ہوگئے۔ بعد میں سہروردی صاحب نے گاڑی میں دریائے سندھ تک چلنے کی تجویز پیش کی اور پھر دریا کی موجوں پر کشتی چلاتے ہوئے انھوں نے ہمیں ایک پنجابی لوک گیت سنایا جو لڑکیوں کو پہلے سے یاد تھا۔ یہ سب کچھ کس قدر پر لطف تھا لیکن جب ہم یہ سوچتے کہ یہ ذہین اور صاحب جوہر آدمی کل صبح حصول انصاف کے لئے جیل کی چار دیواری کے اندر اپنی جدوجہد پر شروع کردے گا تو ہر بات مہمل اور بے محل معلوم ہونے لگتی۔

"دربار وطن میں جب اک دن۔۔۔۔"

یہ فیض کی محبوب ترین اور مقبول ترین قوالیوں میں سے ہے۔ مجھے حیدر آباد جیل کی ایک عید یاد ہے۔ جب بیشتر قیدیوں کے خاندان یک جا ہو گئے تھے۔ شوخ رنگوں کے رنگا رنگ اور بھڑکیلے کپڑے پہنے ہوئے اتنے بچے وہاں جمع تھے جنھیں دیکھ کر دیکھنے والا یہ بھی بھول جاتا کہ بلا کسی استثناء کے ان سب کے باپ ایسے الزامات میں ماخوذ تھے جن کی بنا پر استغاثہ سزائے موت تک کا مطالبہ کرسکتا تھا۔

عید کی اس پارٹی میں یہ قوالی جس جوش، چاؤ اور تیز دھن میں گائی گئی۔ اس کا تصور بھی ایک مشکل کام ہے اور جب قوالی ختم ہوئی تو اس وقت تک تمام بچے، بیویاں اور مائیں، سب ہی اس قوالی میں شریک ہوچکی تھیں۔ سب کے ہونٹوں پر صرف یہی بول تھے ؏

"دربار وطن میں جب اک دن۔۔۔۔"

ہم سب نے نہایت پر تکلف دعوت کا اہتمام کیا اور جب ہم گھر یعنی ڈاک بنگلے واپس پہنچے تو بچیوں نے کہا" ایسا کھانا تو ہم نے بہت دنوں سے نہیں کھایا تھا۔ ہے نا امی۔"

کھانے کی بات پر مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب فیض کو سزا دی جاچکی تھی اور وہ اپنی میعاد قید منٹگمری جیل میں پوری کررہے تھے۔ منیزہ اور سلیمہ نے اپنے ابو کو خط میں لکھا" ہم آرہے ہیں۔ آپ دوپہر کے کھانے کے لئے کوئی اچھی سی چیز ضرور پکائیے گا۔" ہمیں ایک ساتھ دوپہر کا کھانا، کھانے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ جب ہم لوگ منٹگمری جیل پہنچے تو نائب سپرنٹنڈنٹ لودھی صاحب نے منیزہ سے کہا" تمہارے ابو نے یقیناً تمہارے لئے کوئی خاص چیز پکائی ہوگی۔"

"آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" منیزہ نے پوچھا۔

"میں نے تمہارے خط میں پڑھا تھا" لودھی صاحب نے جواب دیا۔ جیل کے ارباب حل وعقد یقیناً خطوں کا احتساب کرتے تھے۔ منیزہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی اور بولی۔" تو کیا تم میرے خط پڑھتے ہو؟"

"ہاں" لودھی صاحب نے کہا۔

"اف! بدتمیز کہیں کے۔"

میں نہیں کہہ سکتی کہ یہ جملہ سن کر لودھی صاحب پر کیا بیتی۔ لیکن مجھے یہ اچھی طرح یاد ہے کہ ان کے چہرے پر اس وقت کیسے تاثرات تھے۔ چہرے کا رنگ اڑ گیا تھا۔ بیچارے لودھی صاحب۔

جب ۱۹۵۹ء کے ابتدائی مہینوں میں مارشل لا کے تحت فیض پھر مہمان زنداں بنے تو لاہور جیل سے وہ قلعہ لاہور میں منتقل کردیئے گئے۔ میں نے ان سے ملاقات کی درخواست دی۔ سی آئی ڈی کے ذمہ داروں نے دانستہ جھوٹ سے کام لیا۔ انہوں نے اس بات سے لاعلمی کا اظہار کیا کہ فیض لاہور جیل سے قلعہ میں منتقل کردیئے

گئے ہیں۔ چنانچہ (اس دانستہ جھوٹ کی وجہ سے) میں لاہور جیل گئی اور وہاں پتہ چلا کہ فیض تو وہاں سے جاچکے ہیں اور جب میں نے ملاقات کے لئے دوبارہ درخواست دی تو میں غصہ کے مارے سچ مچ ابل پڑی تھی۔ آخرکار میں اپنی بوڑھی ساس کے ساتھ قلعہ لاہور پہنچی۔ فیض کو ان کی کوٹھری سے بلایا گیا۔ انہیں دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ یا تو انھیں شیو کرنے کی اجازت نہیں دی گئی یا انھوں نے خود ہی داڑھی بنانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کے چہرے سے پتہ چلتا تھا کہ ان کے پچھلے چوبیس گھنٹے خوشگوار ہرگز نہ تھے۔

میں نے پوچھا۔ "تم نے ناشتہ کیا ہے؟"

فیض نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں!"

"کیا؟" یہ تھا میرا دوسرا سوال۔

"او۔۔۔ایک بن۔ایک پیالی چائے۔" فیض نے جواب دیا۔

"بن" کا لفظ سنتے ہی میں جیسے بارود بن گئی۔ جیسے کسی بندوق کی لبلبی پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ میرے مزاج کی یہ کیفیت کیوں کر ہوئی؟ اس کا جواب خود مجھے بھی کبھی نہ مل سکا، لیکن شاید اس وقت "بن" ایک علامت بن گیا تھا۔ ایک اشارہ۔ ان تمام ناانصافیوں، دکھ درد، ذلت، فریب اور دروغ گوئی کا جن میں گزشتہ کئی ماہ سے شکار تھی۔

میں غصہ سے بے قرار ہو کر جیلر کی طرف پلٹی اور چیخ اٹھی۔ "تم نے میرے شوہر کو بن دیا۔ صرف بن" جیلر کا منہ کھلا۔ مگر میں نے اسے ایک لفظ کہنے کا موقع نہ دیا۔ میں پھر برس پڑی۔ "تم کیا جانو۔ انھوں نے اپنی زندگی میں کبھی بن نہیں کھایا۔ تم نے بن ہی تو کہا تھا؟ بن۔ بن۔"

بیچارہ غریب آدمی کچھ نہ بولا لیکن اپنی پرجوش خطابت کے بعد میں نے ایک عجیب سا سکون محسوس کیا۔ ایسا اطمینان جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔ اس وحشت آمیز اور خشمناک ساعت کے ایک گھنٹہ بعد جب میں گھر گئی تو میں نے انڈوں، ڈبل روٹی سے ایک ٹوکری بھری اور جیلر کے نام ایک پرزہ لکھ کر بھیج دیا کہ "ناشتہ اس قسم کی چیز کو کہا جاتا ہے۔"

بعد میں "بن" کے واقعہ پر ہم دونوں بے تحاشہ ہنسا کرتے تھے۔ ایسی ہنسی جو ختم ہونے ہی کو نہ آتی تھی۔ کیوں کہ قلعہ لاہور کی کسی کال کوٹھری میں مقید آدمی کے لئے "بن" کی اہمیت ہی کیا تھی؟ لیکن شاید اس وقت اس بن کی اہمیت اس طویل اور تھکا دینے والی تنہائی اور کھوکھلے پن سے وابستہ ہوگئی تھی جو مستقبل کے دامن میں چھپا ہوا تھا۔

میری ساس نے مجھے بعد میں بتایا کہ میری پرجوش تقریر کو سن کر وہ یہ سمجھی تھیں کہ فیض کو شاید قلعہ میں اذیت پہنچائی گئی تھی جس پر میں بگڑ رہی تھی۔

فیض سے (مختلف جیلوں میں) ملنے کے لئے ہمیں اکثر ریل گاڑی میں سفر کرنا پڑتا تھا۔ ہم لوگ تیسرے یا درمیانی درجے میں سفر کرتے تھے۔ اس لئے بچیوں کو ہم سفروں سے گفتگو بھی ذرا زیادہ ہی کرنی پڑتی تھی۔ (اونچے کلاسوں کے مسافر۔ توبہ۔ کسے را با کسے کارے نباشد) سلیمہ سے جب کوئی پوچھتا کہ اس کے والد کون ہیں اور کیا کرتے ہیں تو وہ جھجک جاتی تھی۔ ایک ایسے موقع پر میں نے اسے یہ کہتے سنا (اس کا چہرہ سرخ ہوگیا تھا۔ کیوں کہ اسے سفید جھوٹ سے نفرت تھی) "ابو حیدرآباد میں کام کرتے ہیں۔" منیزہ اس کی طرف مڑی اور غصے میں اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

"چل جھوٹی کہیں کی۔ وہ جیل میں ہیں۔"

کچھ دن ہوئے مجھے ایک کاپی ملی۔ جس میں جیل سے فیض کی واپسی کے بعد تک کے واقعات ہیں۔ اتنے دنوں کی غیر حاضری کے بعد ہمیں ایک بار پھر فیض کو اپنی گھریلو زندگی کا حصہ بنانا تھا۔ ہماری گھریلو زندگی جو پدری نظام کی بجگہ ایک خالص اور مضبوط مادری نظام بن گئی تھی۔ ہم اس کاپی کو "وحدت کا منصوبہ" (One Unit Plan) کہتے تھے اور ہم میں سے ہر ایک کا نام پاکستان کے کسی سابق صوبہ کے نام پر تھا۔ اس وحدت میں ایک بجانجا بھی شامل تھا۔ ہمارا کام اور فریضہ یہ تھا کہ پرانی اور نئی عادتوں میں اور گھر کے نئے ارکان کے ساتھ اختلاف رائے کا تصفیہ کریں۔ گھریلو زندگی کو بہتر اور خوشگوار بنانے کے لئے۔

ہم ہر ہفتے ایک جلسہ کرتے تھے۔ شکایات پیش ہوتی تھیں اور ان کے حل تلاش کئے جاتے تھے۔

اب میں اس کاپی پر نظر ڈالتی ہوں تو ایسی تحریریں اور یادداشتیں نظر آتی ہیں۔

"میں کچھ سہیلیوں کو چائے پر بلانا چاہتی ہوں؟ کیا اس کی گنجائش نکل سکتی ہے"

"ہمیں گھر پر سالگرہ کی پارٹی کرنی چاہئے۔"

"ابو کو بال روم ڈانسنگ سیکھنے کی مشق ضرور کرنی چاہئے۔"

"نصیر کو اپنی الماری کے خانے خود صاف کرنے چاہئیں۔"

"ابو کو ایک دن میں تیس سے زیادہ سگریٹ نہیں پھونکنے چاہئیں۔ اگر وہ نہیں مانیں گے تو میں یہ شکایت کاپی پر پانچ مرتبہ لکھوں گی۔"

"گھر پر جب کوئی دعوت ہو تو بڑوں کے ساتھ بچوں کو بھی بلایا جائے۔" کبھی کبھی "سرحدی علاقہ" کی طرح منیزہ ہیجان پرور بن جاتی اور شور مچاتی۔ اس کی زندگی میں یہ نئی مطابقت خاموشی کے ساتھ نہیں آئی۔ فیض "سندھ" تھے کیوں کہ سلیمہ کہتی تھی "ابو تو سندھ سے ہی تعلق رکھتے ہیں اور میں "بلوچستان" تھی شاید اس لئے کہ کبھی کبھی میں دوسروں کے لئے زحمت اور تکلیف کا سبب بن جاتی۔ ہمارے مالی وسائل محدود تھے اور مطالبے بڑھتے ہی جاتے تھے اور ہمیں بہت ہی اچھی چیزوں کی تحدید کرنی پڑتی تھی۔ (آسان اردو میں راشن بندی) اور یہ تحدید اس وقت تک لازم تھی جب تک فیض جیل سے لوٹ کر دوبارہ کام شروع نہ کر دیتے۔ لیکن جلد ہی ہمارا نظام کامیاب ہوگیا اور کچھ ہی عرصہ بعد ہمارا گھر اس نہج پر چل رہا تھا جیسے گھر کا سرپرست۔ اس گھر سے باہر کبھی گیا ہی نہ ہو۔

SAYYED ABULKHAIR KASHFI
a

شخص و عکس

سجاد ظہیر

محمود امرتسر میں دو ڈیڑھ سال سے تھے لیکن ان کی یا رشیدہ کی پنجاب کے ادیبوں سے اس وقت تک ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ وہ پڑھانے میں بڑی محنت کرتے تھے اور اسی کام میں مشغول رہتے۔ رشیدہ ڈاکٹری کرتیں یا کبھی کبھی افسانے لکھ لیتیں۔ ہم نے مشورہ کیا کہ لاہور چلیں اور وہاں اپنے مشترک دوست میاں افتخارالدین اور دوستوں سے مدد لے کر ادیبوں سے ملیں۔

لیکن قبل اس کے کہ ہم لاہور جائیں ہمیں غیر متوقع بلکہ غیبی مدد ملی۔ امرتسر میں میرے ایک دو دن کے قیام کے بعد ایک دن رشیدہ نے یکبارگی کہا۔ "محمود! وہ جو تمہارے کالج میں ایک نیا لڑکا آیا ہے نا، انگلش ڈپارٹمنٹ میں، کیا نام ہے اس کا؟"

اور پھر میری طرف مڑ کر "میرے خیال سے تم اس سے مل لو۔"

محمود بہت سنجیدگی سے انگریزی میں بولے۔ "تمہارا مطلب ہے ہمارے انگریزی کے نئے لیکچرر فیض احمد۔"

"انہہ، ہوگا بھئی کوئی بھی نام مجھے یاد نہیں رہتا۔ وہ بولتا تو ہے نہیں۔ تمہارے کالج میں وہی ایک لڑکا سمجھدار معلوم ہوتا ہے۔ بنّے کو اس سے ملنا چاہئے۔"

محمود صاحب نے اس بات کو اپنے کالج اور اس کا وائس پرنسپل ہونے کی حیثیت سے اپنے اوپر ایک حملہ تصور کیا اور ذرا تیزی سے بولے۔ "او تمہیں کیا معلوم میرے کالج میں کون سمجھدار ہے اور کون نہیں؟ تم کتنوں سے ملی ہو؟ اور جن سے تم ملی بھی ہو ان کے نام تک تو تمہیں یاد نہیں۔"

اب کیا تھا رشیدہ بالکل اپنے اصلی رنگ میں آگئیں اور چمک کر بولیں۔ "سب الو بھرے ہیں تمہارے کالج میں جنہیں الف کے نام ب تک نہیں آتا۔ پتہ نہیں کس دنیا میں رہتے ہیں۔ میں اسٹاف کی بات کرتی ہوں۔ لڑکوں کی نہیں۔ نام جاننے کی کیا ضرورت ہے۔ صورت سے ہی پتہ چل جاتا ہے۔"

اس پر ہم سب کو بے ساختہ ہنسی آگئی اور میں نے موقع غنیمت جان کر کہا۔ "اچھا بھئی! یہ طے کرو کہ ان سمجھدار فیض احمد صاحب سے کب ملاقات ہوگی۔"

محمود صاحب نے جواب دیا۔

"میں نے تمہارے آنے سے پہلے ہی فیض سے ترقی پسند مصنفین کے بارے میں باتیں کرلی ہیں اور تمہارا بھی ان سے ذکر کردیا ہے۔" پھر اپنی ڈائری دیکھ کر کہا۔ "آج ساڑھے چار بجے چائے پر فیض آرہے ہیں۔"

"دیکھا تم نے ان حضرت کی باتیں۔" رشیدہ نے مجھ سے فریاد کے لہجہ میں کہا۔

"میں نے بھی تو آخر یہی کہا تھا کہ فیض کو تم سے ملانا چاہئے۔ یہ خواہ مخواہ گھنٹے بھر سے الجھے ہوئے ہیں۔" محمود مسکراتے رہے کچھ نہیں بولے۔ ذرا دیر بعد انہوں نے اعلان کیا۔

"میں اب کالج چلا۔ مہربانی کرکے چائے کے لئے سینڈوچ وغیرہ بنوالینا۔" پھر ڈائری دیکھ کر انہوں نے کہا۔ "اور کل چائے پی کر ہم موٹر سے لاہور کے لئے روانہ ہوں گے۔ فیض بھی ہمارے ساتھ ہوں گے۔ میں نے افتخار کو اطلاع کردی ہے۔ ہم ان کے یہاں ہی ٹھہریں گے۔ فیض اپنے گھر ٹھہریں گے۔"

"اور کچھ طے ہوا ہو تو وہ بھی ابھی بتادو۔ ذرا ڈائری کا اگلا صفحہ تو دیکھو۔ برک فاسٹ اور لنچ کس کے یہاں کھانا پڑے گا؟" رشیدہ نے پوچھ ہی لیا۔

"یو آر جسٹ امپوسبل۔" محمود نے کہا اور ہنستے ہوئے چلے گئے۔

بارے تیسرے پہر جب "فیض احمد صاحب" سے ملاقات ہوئی تو جس کا خطرہ تھا وہی ہوا۔ یعنی فیض نہیں بولے۔ کسی نئے آدمی سے گفتگو شروع کرنے اور اسے جاری رکھنے کا مشکل فن مجھے بھی نہیں آتا۔ اس دن مجھے معلوم ہوا کہ اس میدان میں مجھ سے بھی بڑے اناڑی پائے جاتے ہیں۔

فیض کی رازداری کا کمال یہ تھا کہ اس وقت تک محمود اور رشیدہ کو اس کا بالکل علم نہیں تھا کہ فیض شاعری بھی کرتے ہیں۔ ان کی نظر میں تو بس وہ ادب خاص طور پر انگریزی ادب سے دلچسپی رکھنے والے ایک ذہین نوجوان تھے۔ جن میں کچھ کچھ ترقی پسند رجحانات پائے جاتے تھے۔ محمود نے مجھ سے ان کے ذوق سلیم کی تعریف کی تھی جس کا پتہ انہیں اس طرح چلا تھا کہ وہ محمود کے یہاں سے اچھی اچھی کتابیں مانگ کر پڑھنے کے لئے لے جایا کرتے تھے اور انہیں بڑے شوق سے پڑھتے۔

ہم نے شاید انگلستان کے نئے شاعر اسٹیفن اسپنڈر اور آڈن کا تذکرہ کیا۔ جن کے شعر کے نئے مجموعے ان دنوں شائع ہوئے تھے اور جن کی شاعری میں انگریزی شاعری کے مروجہ ٹی ایس ایلیٹ کے پھیلائے ہوئے تلخی اور نامرادی کے رجحانات سے الگ ہٹ کر انسانیت کے نئے اشتراکی مستقبل اور یوروپی عوام کی فاشسٹ دشمن جدوجہد کی پرامید جھلک تھی۔ مجھے اس پر کافی تعجب ہوا کہ فیض ان شاعروں کا کلام پڑھ چکے تھے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک کے بارے میں ہم نے اس وقت تک جو کیا تھا سب بتایا اور ان سے پوچھا کہ پنجاب میں اس کے کیا امکانات ہیں؟ فیض نے اپنے بشرے سے کسی خاص گرمجوشی یا انہماک کے جذبے کو ظاہر نہیں ہونے دیا بس ایک پشیمان سی مسکراہٹ کے ساتھ بڑی مشکل سے اتنا کہا۔

"لاہور چل کے دیکھتے ہیں۔ میرے خیال میں وہاں پر کچھ لوگ تو شاید ہم سے متفق ہوں گے۔" معلوم ہوتا تھا کہ تہیہ کر کے آئے ہیں کہ نہیں گے، مسکرائیں گے مگر بولیں گے نہیں۔ آخر کو رشیدہ چلا پڑیں۔

"یہ بھی خوب کہی، کچھ لوگ شاید متفق ہوں گے۔ جناب ہمیں اس مینی فیسٹو پر بہت سے لوگوں کے دستخط لینے ہیں اور پھر لاہور میں ترقی پسند مصنفین کی انجمن بنانی ہے۔"

محمود اور میں رشیدہ کی اس حرکت پر گھبرا سے گئے۔ ابھی ہماری فیض سے بے تکلفی نہیں تھی اور میری تو بالکل پہلی ملاقات تھی۔ رشیدہ تھیں کہ اس ہمارے شرمیلے مہمان کی نقلیں کرنے لگیں اور اس پر فقرے چست کر رہی تھیں لیکن انہیں روکنے یا منع کرنے کی کسے ہمت تھی۔ پھر بھی فیض ٹس سے مس نہ ہوئے البتہ اب کی ذرا اور کھل کر مسکرائے اور بولے۔

"لاہور چل کے کوشش کرتے ہیں۔ دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

ہم اپنے پروگرام کے مطابق اس کے دوسرے دن لاہور چل پڑے اور چراغ جلے وہاں پہنچ گئے۔ فیض اپنے گھر چلے گئے اور تینوں سیدھے کینال بنک میاں افتخار الدین کی کوٹھی پر گے۔ وہاں میاں صاحب کے نوکروں نے ہمارا استقبال کیا اور بتایا کہ میاں صاحب اور بیگم صاحبہ کسی پارٹی پر گئے ہیں۔ ہم جاڑے میں شام کے وقت ۳۰، ۴۰ میل موٹر پر چل کر آئے تھے اس لئے کافی ٹھٹھرے ہوئے تھے۔ اندر آتشدان میں بڑی اچھی آگ جل رہی تھی۔ چپ چاپ اس کے گرد جا کر بیٹھ گئے۔ نوکر جلدی سے ہمارے لئے چائے بنا کر لائے۔ آگ کی گرمی اور چائے نے ہمارے موڈ پر اچھا اثر ڈالا۔ رشیدہ ایک نرم کشن میں منہ چھپا کر قالین پر لیٹ گئیں۔ محمود کا ہاتھ آہستہ سے اپنے جیب میں گیا اور انہوں نے پائپ نکال کر پینا شروع کر دیا۔ لیکن وہ وقت ضائع کرنے کے قائل نہیں تھے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے اپنی نوٹ بک برآمد کی اور میرے ساتھ دوسرے دن کا پروگرام طے کرنے لگے۔ ان کے نوٹ بک میں ۲۰، ۲۵ ناموں کی ایک لمبی فہرست تھی۔ لاہور کے ادیبوں، شاعروں، ادب میں دلچسپی لینے والوں ادب کے مددگاروں، آرٹسٹوں، پروفیسروں کی فہرست۔ انہوں نے کہا میرے لئے ضروری ہے کہ ان سب سے فرداً فرداً ملوں۔ اس انکشاف پر مجھے کافی تعجب ہوا اور میں نے ان سے پوچھا "تم تو کہتے تھے کہ تم یہاں کے ادیبوں کو جانتے ہی نہیں پھر یہ اتنی بڑی فہرست کیسے بنالی؟" انہوں نے جواب دیا۔

"تمہارے آنے سے پہلے فیض اور میں اس معاملے کے متعلق کئی بار باتیں کر چکے ہیں۔ میں تو ان میں سے ایک ہی دو سے واقف ہوں لیکن فیض اکثر کو ذاتی طور پر جانتے ہیں۔ یہ فہرست انہوں نے لکھوائی ہے۔"

مجھے محمود کی اس مستعدی سے بڑی خوشی ہوئی۔

"یار تم سے جو بات بھی پوچھتے ہیں، تم یہی کہتے ہو کہ فیض نے اور میں نے پہلے ہی سے طے کر لیا ہے۔ میرے لئے تو تم نے کچھ چھوڑا ہی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ میرے اتنے دور آنے کی کوئی خاص ضرورت نہیں تھی۔" میں نے ہنس کر کہا۔

"بھئی اصل بات یہ ہے کہ فیض کے ساتھ پنجاب میں پروگریسو رائٹرز موومنٹ آرگنائز کرنے کے بارے میں میں نے کئی بار تفصیل سے باتیں کی تھیں اور ہم خود لاہور آتے۔ اتنی جلدی تمہارے یہاں آنے کی تو ہمیں امید بھی نہیں تھی۔"

اس کے بعد چند دن فیض احمد فیض کی رہنمائی میں لاہور کے مختلف ادیبوں سے ان کے گھر جا کر ملنے میں گزرے لیکن افسوس ہے کہ اب ان سے مجھے صرف دو سے ملنا صاف طور پر یاد ہے۔ ایک صوفی غلام مصطفیٰ تبسم اور دوسرے اختر شیرانی مرحوم۔

فیض شاید صوفی صاحب کے شاگرد رہ چکے تھے اس لئے وہ انہیں بہت اچھی طرح جانتے تھے اور غالباً رشیدہ اور محمود بھی فیض کے توسط سے ان سے پہلے سے واقف تھے۔

اختر شیرانی کے یہاں بھی مجھے فیض لے گئے۔

اختر شیرانی کو دیکھ کر میرے دل کو بڑا دکھ ہوا۔ میں نے پریشان ہو کر فیض کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر ہمدردی اور سکون کی ملی جلی کیفیت تھی۔ زبان سے کچھ بولے بغیر جیسے انھوں نے مجھ سے کہہ دیا کہ "ایک اختر شیرانی ہی نہیں، ہمارے زیادہ تر ادیب، شاعر، اہل فن انہیں روح فرسا حالات میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ جبھی تو ہم اس اپنی تحریک کو شروع کر رہے ہیں۔" فیض نے اختر شیرانی سے میرا تعارف کرایا اور ان سے ملنے کا مقصد بتایا میں نے مختصراً ترقی پسند ادب کی مجوزہ تحریک کے بارے میں ان سے کچھ باتیں کیں۔

دو تین دن کی دوا دوش کے بعد جس میں اب میاں افتخار الدین بھی ہمارے ساتھ پورے جوش و خروش سے شریک ہو گئے تھے ہم نے ان پندرہ بیس آدمیوں کو جنہیں ہم سمجھتے تھے کہ ترقی پسند مصنفین کی تحریک میں دلچسپی لیں گے ایک ساتھ مل کر گفتگو اور مشورے کے لئے مدعو کیا۔ یہ اجتماع افتخار کے ہی گھر پر ہوا ان کے مکان کے سامنے کے خوبصورت لان پر چار بجے کے قریب ایک ایک دو دو کر کے لوگ جمع ہونا شروع ہوئے۔ رشیدہ، محمود، فیض، افتخار اور میں وہاں پہلے سے موجود تھے۔ افتخار میزبان ہونے کے ناتے چائے وغیرہ کے انتظام کے لئے اپنے نوکروں کو ادھر سے ادھر بھگا رہے تھے۔ ہماری گھبراہٹ بھی کچھ کم نہیں تھی۔ جس کا اظہار اس وقت ہماری غیر معمولی خاموشی سے ہو رہا تھا۔ فیض حسب دستور بظاہر اطمینان سے سگریٹ پی رہے تھے اور ان کے اس اطمینان پر رشیدہ تو رشیدہ، مجھے بھی جو اپنے کو کافی ٹھنڈے دل و دماغ کا انسان تصور کرتا ہوں کسی قدر غصہ سا آرہا تھا لیکن ہم سب نے اپنے جذبات کو اس وقت دبائے رکھا۔

اب تجویز پیش کی گئی کہ لاہور میں انجمن کی تشکیل کی جائے۔ فیض نے تجویز پیش کی کہ صوفی تبسم کو اسی وقت عارضی طور پر انجمن کا سکریٹری چن لیا جائے جب انجمن کے ممبر بن جائیں گے تو اس کے باقاعدہ عہدے داروں کا انتخاب ہوگا۔ یہ بات اتفاق رائے سے منظور ہوئی۔ صوفی صاحب نے پہلے انکار کیا لیکن بعد کو اصرار کرنے پر راضی ہو گئے۔ اس چھوٹے سے جلسے کے ختم ہوتے ہوتے سورج ڈوب چکا تھا۔ سردی یکبارگی بڑھ

بھی۔ لوگ جلدی جلدی رخصت ہونے لگے۔

ہم خوش اور مطمئن تھے۔ رشیدہ فیض کو چھیڑ رہی تھیں۔ اب وہ حضرت بھی کسی قدر کھلے اور بولنے چالنے پر رضامند سے معلوم ہو رہے تھے۔

(ترقی پسند مصنفین کی پہلی کانفرنس منعقدہ لکھنؤ) کانفرنس کا پہلا سیشن خاتمہ کے قریب رہا ہوگا۔ ساغر نظامی افتاں و خیزاں وارد ہوئے۔ ساغر صاحب نے ہمیں بتایا کہ ان کو کانفرنس میں آنے میں دیر اس وجہ سے ہوئی کہ وہ صبح سے نیاز صاحب (نیاز فتح پوری) کے یہاں بیٹھے تھے اور نیاز صاحب اس کے منتظر تھے کہ کانفرنس کے منتظمین میں سے کوئی ان کے لئے سواری لے کر ان کے مکان پر پہنچے تب وہ تشریف لے چلیں۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے انتظار کے بعد ساغر تو تانگے پر بیٹھ کر خود ہی کانفرنس تک آ گئے لیکن نیاز اس لئے تشریف نہیں لائے کہ کوئی انہیں لانے کے لئے نہیں گیا۔ وہ ہم سے روٹھ گئے تھے۔ ہمیں اپنی کوتاہی پر شرمندگی ہوئی اور اپنی محرومی کا رنج۔ لیکن ہم یہ سوچنے پر مجبور تھے کہ ہماری کانفرنس میں شریک ہونے والے دو ممتاز ادبا پریم چند اور حسرت موہانی بالکل دوسری طرح سے ہماری کانفرنس میں آ کر شریک ہوئے تھے اور ان کے علاوہ بہت سے نوجوان ادیب ملک کے دور دراز علاقوں سے روپے کا خرچ قرض لے کر تیسرے یا ڈیوڑھے درجے میں سفر کر کے لکھنؤ تک پہنچے تھے اور تکلیف دہ جگہوں پر ٹھہرے تھے۔ پنجاب کے نمائندے فیض احمد فیض نے رشیدہ کو چپکے سے بتایا کہ ان کے پاس بس لکھنؤ آنے جانے بھر کا کرایہ تو تھا لیکن اب سگریٹ یا تانگے کے کرائے تک کے لئے جیب میں ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔ یقیناً ان لوگوں اور مولانا نیاز میں نمایاں فرق تھا۔

(ترقی پسند مصنفین پنجاب کی پہلی صوبائی کانفرنس منعقدہ امرتسر) ہم نے بہت کوشش کی کہ مقامی کالجوں یا اسکولوں میں سے کوئی دو دن کانفرنس کرنے کے لئے ایک چھوٹا سا ہال دے دے لیکن کوئی بھی راضی نہیں ہوا۔ آخر کو ہم نے کسان کانفرنس والوں سے کہا۔ وہ بڑی خوشی سے خالی وقت میں اپنا پنڈال دینے کے لئے راضی ہو گئے۔ اچھا ہے۔ پنجاب کے کسان اپنے عوامی مصنفین کی صورتیں تو دیکھ لیں اور مصنفین کے لئے بھی کسانوں کے سائے میں اپنی کارروائی کرنا مفید ہوگا۔ مجھے تعجب اس پر تھا کہ ایم اے او کالج والوں نے بھی ہال نہیں دیا۔ تاثیر اس کے پرنسپل تھے اور فیض وہاں پڑھاتے تھے۔ فیض نے کہا۔ "بس سمجھ لیجیے یہاں کے بعض حلقے ہماری انجمن کے بارے میں کیا سوچتے ہیں۔"

اس کانفرنس کی روداد مجھے یاد نہیں ممکن ہے فیض کو یاد ہو۔ یا ان کے پاس کانفرنس کی تجاویز اور بحثوں کی رپورٹ محفوظ ہو۔

(ترقی پسندوں کے مخالفین سے ایک مناظرہ منعقدہ دہلی) دہلی میونسپل کارپوریشن کے بڑے ہال میں جلسہ ہونا قرار پایا۔ سر رضا علی مرحوم اس کی صدارت کے لئے بلائے گئے۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک پر حملہ کرنے کے لئے دلی کے دو نامور اصحاب تھے۔ خواجہ محمد شفیع، ناول اور افسانہ نگار اور شاعر۔ دوسرے مولوی سعید احمد تھے۔ مولوی صاحب ندوۃ المصنفین (دہلی) کے ایک رکن تھے اور اس ادارے کے ماہانہ علمی اور دینی رسالے "برہان" کے ایڈیٹر تھے۔ ترقی پسندوں کی طرف سے اس حملے کا بچاؤ کرنے کے لئے فیض احمد فیض اور میں چنے گئے تھے۔ جلسے کی کارروائی صدر سر رضا علی کی تقریر ہی سے شروع ہوئی۔ اس کے بعد خواجہ محمد شفیع صاحب نے تقریر کی۔ خواجہ صاحب کی تقریر نہیں تھی ترقی پسندوں پر چوٹوں کا ایک سلسلہ تھا۔ انہوں نے آزاد شاعری کا مذاق اڑایا۔ زبان کی غلطیاں بتائیں۔ ان کے تصورات کو مخرب اخلاق اور غیر شاعرانہ ثابت کرنے کی کوشش کی۔ فحاشی کا الزام بھی ہم پر لگایا گیا۔ ہم ان اعتراضات کے سننے کے عادی ہو چکے تھے گو دلی کی میٹھی زبان اور اتنے پیارے لہجے میں ہم نے اس کے پہلے گالیاں نہیں سنی تھیں۔ مجمع پر خاصا اثر ہوا اور میرا جی راشد اور مخمور جالندھری کی چند نظموں کے ٹکڑے جب پڑھے گئے تو اس پر کافی قہقہہ لگا۔

خواجہ صاحب کے بعد فیض بولے۔ وہ حضرت معلوم ہوتا تھا اپنے فوجی دفتر سے اٹھ کر سیدھے جلسے میں آ گئے ہیں۔ انہیں کپڑے بدلنے کا بھی موقع نہیں ملا تھا۔ اور لفٹننٹ کرنل کی وردی زیب تن تھی۔ ان کا لباس ہی دلی والوں کو غیر ادبی معلوم ہوا ہو گا۔ مجھے کسی قدر گھبراہٹ ہونے لگی۔

فیض سے میں نے کہا۔ "کپڑے تو بدل لئے ہوتے۔"

انھوں نے آہستہ سے جواب دیا۔ "سب ٹھیک ہے کوئی گھبراہٹ کی بات نہیں۔"

فیض تقریر شروع کرتے ہی مسئلے کی تہہ پر چلے گئے اور خواجہ صاحب کے اعتراضات کا براہ راست جواب دینے کی انہوں نے زحمت نہیں کی۔ انھوں نے عالمانہ انداز میں اور بڑی متانت سے یہ ثابت کیا کہ ترقی پسندی ادب میں کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ سماج میں تبدیلی اور ارتقا کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی تبدیلی اور ترقی ہوئی ہے۔ اسے روکنے کی کوشش کرنا فضول ہے۔ ترقی پسند ادب کی تحریک ناگزیر ہے۔ البتہ اس کو بہتر بنانے کی کوشش کرتے رہنا چاہئے۔ فیض کی تقریر میں جوش، زور، طنز یا حملے کا انداز بالکل نہیں تھا۔ اس میں روانی، متانت اور درس دینے کی سی کیفیت تھی۔ مجمع نے توجہ اور خاموشی سے ان کی تقریر سنی۔ نہ قہقہے لگے اور نہ تالیاں بجیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ لاہور کے رسالہ "ادب لطیف" نے ترقی پسند ادب کی خا[redacted]اردو ادب کی عام طور پر بہت اہم خدمت انجام دی ہے۔ ۱۹۳۹ء اور ۱۹۴۰ء میں غالباً فیض امرتسر سے لاہور آ گئے تھے اور ایک کالج میں انگریزی کے لکچرر ہونے کے ساتھ ساتھ اس رسالے کے بھی ایڈیٹر ہو گئے۔ ان کے اداریوں اور تنقیدی مضامین نے ترقی پسند نقطہ نظر کو واضح کیا۔ میرے لئے یہ ممکن نہیں کہ پنجاب میں ترقی پسند ادب کی تحریک کے اس دور کے واقعات کما حقہ بیان کروں۔ یہ کام فیض یا کرشن چندر کے کرنے کا ہے۔

۱۹۳۹ء میں جب عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا تھا اور اس کے ساتھ ساتھ ملک کی عوامی تحریکوں پر حملہ، تو سامراجی تباہ کاری اور جبر و تشدد کی اس فضا کو ہمارے دو شاعروں مخدوم اور فیض نے اپنی دو بڑی حسین اور پراثر نظموں میں پیش کیا تھا۔ مخدوم نے کہا تھا

رات کے ہاتھ میں اک کاسہ دریوزہ گری

یہ چمکتے ہوئے تارے یہ دمکتا ہوا چاند
بھیک کے نور میں مانگے کے اجالے میں مگن
یہی ملبوس عروسی ہے یہی ان کا کفن

لیکن اس نے آخر میں بشارت دی تھی۔

رات کے ماتھے پہ آزردہ ستاروں کا ہجوم
صرف خورشید درخشاں کے نکلنے تک ہے

اور فیض نے وطن کی آزادی کے مجاہدوں سے کہا تھا کہ جبر وتشدد کے اس دور کو صرف شجاعانہ مقاومت سے ہی ختم کیا جاسکتا ہے۔

بول کے لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے

فیض نے اپنی نظم "سیاسی لیڈر کے نام" میں ملک کے ان لیڈروں کی سیاست پر نکتہ چینی کی جو اس عظیم کارزار کی صحیح نوعیت کو نہیں سمجھتے تھے۔ فیض نے ان سے کہا۔

تجھ کو منظور نہیں غلبہ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے

اس دار و گیر کے زمانے میں بھی فرقہ وارانہ فسادات اور ان کے آثار کے موضوع پر جو ادبی تخلیق ہوئی اس میں سے بھی بہترین ترقی پسند مصنفین کی ہی نگارش ہے اور اگر پابندگی حاصل ہے تو انہیں کی بعض نظموں اور انہیں کے لکھے ہوئے چند افسانوں اور مضامین کو۔ فیض کی وہ نظم جو اس مصرعے سے شروع ہوتی ہے

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر

کبھی بھلائی جاسکتی ہے؟ اس میں جذبات کی شدت کے ساتھ جن حقائق کی حسین و نازک مصوری کی گئی ہے وہ ۱۴ راگست ۱۹۴۷ء کے بعد سے شروع ہونے والے پورے دور کی ماہیت کا فنکارانہ تعین کرتے ہیں۔ (روشنائی سے)

SAJJAD ZAHEER

بقیہ: فیض صاحب

ٹھہرتے ہوئے گئے۔ پاکستان رائٹرز گلڈ نے آرٹ کونسل میں ان کے اعزاز میں ایک بہت بڑا جلسہ کیا اس جلسے کی صدارت کا فخر مجھے حاصل ہوا۔ منجملہ اور باتوں کے میں نے اپنی صدارتی تقریر میں اپنی حکومت سے شکوہ کیا کہ فیض صاحب کو اپنی حکومت سے اب تک کوئی انعام یا اعزاز نہیں ملا اور سات سمندر پار کے ایک بہت بڑے ملک نے انہیں امن کے اتنے بڑے انعام کا مستحق سمجھا۔ شاید ہمارے ملک میں زندہ ادیبوں کی قدر دانی کا دستور نہیں ہے۔ جبھی تو پاکستان کا سب سے ہر دلعزیز شاعر محروم التفات ہے۔

جب فیض صاحب روس روانہ ہوگئے تو یہاں افواہ اڑنی شروع ہوگئی کہ واپس آتے ہی وہ گرفتار ہو جائیں گے۔ مگر ایسا کوئی جارحانہ اقدام نہیں کیا گیا اور فیض صاحب شادو بامراد واپس آگئے۔

روس سے واپسی کے کچھ عرصہ بعد سنا کہ فیض صاحب لندن چلے گئے ہیں اور پاکستانی کلچر پر مواد جمع کر کے کتاب لکھیں گے۔ خاصے طویل عرصے تک وہ لندن میں رہے اور یہاں واپس آکر بھی انہیں خاصی مدت ہوگئی مگر وہ کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی۔ شاید ان کی شاعرانہ سہل نگاری مانع ہے۔

سال ڈیڑھ سال پہلے سنا تھا کہ فیض صاحب کراچی یونیورسٹی میں انگریزی کے صدر شعبہ بنائے جارہے ہیں۔ اس خبر سے خوشی ہوئی کہ یہ جگہ ان کے لئے موزوں بھی تھی اور خود یونیورسٹی کے لئے بھی لائق فخر۔ مگر پروفیسر احمد علی کی طرح فیض صاحب کو بھی ارباب لیت و کشاد نے مناسب نہیں سمجھا۔ مگر جو جوہر قابل ہوتے ہیں انہیں قدرداں مل ہی جاتے ہیں۔ اب وہ ایک بہت بڑے مشاہدے پر ہارون کالج کراچی کے پرنسپل ہیں۔ ہر چیز اپنی اصل کی طرف رجوع ہوتی ہے۔ فیض صاحب تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے۔ پھر تعلیمی سلسلے ہی میں آگئے۔ حق بحق دار رسید۔

SHAHID AHMED DEHLVI

بقیہ: کچھ ڈراموں کے بارے میں

کردار اور موثر مکالمہ نگاری پر ہاجرہ مسرور کی قدرت ان سب ڈراموں میں یکساں نمایاں ہے۔ ان کی مخلوق میں بچے، بوڑھے، امیر، غریب، ملازم، آقا، نئے فیشن کی دوشیزائیں اور پرانی وضع کی بیگمیں سبھی شامل ہیں اور یہ سبھی مخلوق دلچسپ اور جیتی جاگتی مخلوق ہے حتیٰ کہ "نوری خالہ" جیسے کردار بھی جو بالکل سامنے ہی نہیں آتے مانوس اور جاندار معلوم ہوتے ہیں۔

ڈرامے کے اصل جوہر تو اسٹیج پر ہی جا کر کھلتے ہیں۔ ان تحریروں کے بارے میں اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ ادبی محاسن کے علاوہ ان میں اسٹیج کا امتحان پاس کرنے کی بھی صلاحیتیں اور لوازم موجود ہیں۔

یہ مجموعہ ہمارے ادب میں بہت ہی قابل قدر اضافہ ہے۔

(دیباچہ "ہم لوگ" از: ہاجرہ مسرور ۱۹۶۱ء)

FAIZ AHMED FAIZ

فیض صاحب

شاہد احمد دہلوی

کوئی تیس سال پہلے کا ذکر ہے کہ دلی میں سجاد ظہیر ایک دفعہ آئے تو ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کی معرفت مجھ سے ملنے کے خواہش مند ہوئے۔ کتاب "انگارے" شائع ہو کر ضبط ہو چکی تھی۔ یہ سانجھے کی ایک باؤلی ہنڈیا تھی جو ادب کے چوراہے پر پھوٹی تھی۔ اس کے ایک ساتھی سجاد ظہیر بھی تھے۔ اس لئے میں ان کے نام سے خوب واقف تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنے گھر چائے پر بلایا اور سجاد ظہیر سے ملوایا۔ بہت ہوشمند آدمی نکلے۔ لندن میں کئی سال رہ کر واپس آئے تھے۔ نہایت سنجیدہ اور بردبار۔ ہنستے بھی تھے تو خندہ دنداں نما سے آگے نہیں بڑھتے تھے۔ انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین دلی میں قائم کرنے کی تجویز پیش کی اور اس انجمن کے مقاصد بیان کئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ازراہ مہربانی مجھے اس کام کے لئے سب سے زیادہ موزوں قرار دیا۔ شاید اس وجہ سے کہ اس وقت ساقی کا سورج چڑھتا چلا جا رہا تھا۔ میں نے کہا "اگر ترقی پسندی اسی کا نام ہے کہ ادب کو زندگی کا آئینہ دار بنایا جائے تو ٹھیک ہے۔ انجمن قائم ہو جائے گی۔" اور انجمن انصار ناصری اور فضیل حق قریشی کی مدد سے قائم ہوگئی۔ دلی کے تقریباً سبھی بڑے ادیب، اردو اور ہندی کے اس کے جلسوں میں شریک ہونے لگے اور مضامین پڑھنے لگے۔ جلسے باری باری مختلف گھروں میں ہوتے تھے۔ کبھی میرے ہاں، کبھی ناصری صاحب کے ہاں، کبھی خیری صاحب کے ہاں اور کبھی جینیندر کمار کے ہاں۔ ایک ایسا ہی جلسہ چاندنی چوک میں نیل کے کٹہرے کے پہلو میں ڈاکٹر شوکت انصاری کے بال خانے میں ہوا۔ یہ ڈاکٹر صاحب مشہور کانگریسی لیڈر ڈاکٹر انصاری کے بہت قریبی عزیز تھے اور انہی کی طرح گاڑھے کے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ حالانکہ برسوں پیرس میں رہ کر آئے تھے۔ اس جلسے میں ایک طرف ایک ایسے صاحب بھی بیٹھے ہوئے تھے جن سے ہم میں سے کوئی واقف نہیں تھا۔ ہماری انجمن کے دو ایک جلسوں کے بعد ہر جلسے میں دو ایک نئے آدمی آنے لگے تھے۔ پہلے تو ہم انھیں ادیب یا شاعر سمجھتے رہے مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سی آئی ڈی والے ہوتے ہیں۔ اگلی دفعہ میں نے انھیں جلسے میں سے نکال دیا اور ان کے محکمے کے افسر عبدالرحمن صاحب سے شکایت کی۔ وہ ایک ہی گرگ باراں دیدہ تھے۔ بولے "آپ کو روس سے کتنی رقم ملتی ہے؟" میں نے کہا "کچھ بھی نہیں۔" بولے۔ "تو پھر ان کمیونسٹوں میں کیسے پھنس گئے؟" میں نے کہا "روس یا کمیونسٹوں سے اس انجمن کا کوئی تعلق نہیں ہے۔" بولے۔ "آپ شریف آدمی ہیں اور آپ کا ریکارڈ بالکل صاف ہے۔ بہتر ہے کہ آپ اس سے الگ ہو جائیں یا کوئی اور انجمن بنالیں۔ ورنہ آپ مصیبت میں پھنس جائیں گے۔" میں نے گھر آ کر سجاد ظہیر کو پوری روداد لکھی اور پوچھا کہ اگر کل کلاں کو میں قید ہو گیا تو آپ میری کیا مدد کر سکیں گے؟ جواب آیا "ہم کسی قسم کی مدد نہیں کر سکیں گے۔" ان کے اس خلوص سے میں اتنا خوش ہوا کہ میں نے دلی کی انجمن فوراً بند کر دی اور اس کی بجائے "انجمن تہذیب ادب" قائم کر دی جس نے اپنی پیش رو انجمن سے کہیں بڑھ چڑھ کر کام کیا اور اس کے جلسوں میں سی آئی ڈی کے لوگ بھی نہیں آتے تھے۔

ہاں تو ڈاکٹر شوکت انصاری کے ہاں جلسے میں جو ایک اجنبی شخص نظر آیا تو میں نے ڈاکٹر صاحب کے قریب جا کر پوچھا "یہ کون ہے؟" ڈاکٹر صاحب کسی قدر حیران اور شرمندہ ہو کر بولے۔ "آپ انہیں نہیں جانتے؟ یہ فیض احمد فیض ہیں۔ اسلامیہ کالج امرتسر میں پروفیسر ہیں۔" میں پھر بھی نہیں سمجھا اور اپنی لاعلمی چھپانے کے لئے خاموش رہا۔ جلسہ شروع ہوا۔ ڈاکٹر صاحب نے صدارت کی۔ مضامین پڑھے گئے۔ ان پر گفتگو ہوئی۔ نظمیں پڑھی گئیں۔ واہ واہ ہوئی۔ آخر میں جناب صدر نے فیض صاحب سے کلام سنانے کی درخواست کی۔ انہوں نے ازراہ انکساری انکار نہیں کیا مگر جب انھوں نے اپنی ایک نظم سنائی تو ہم سب کے کان کھڑے ہو گئے اور دیدے پھٹے کہ یہ بہترین شاعر اب تک کہاں چھپا رہا؟ پھر تو چاروں طرف سے ایک اور، ایک اور کی آوازیں آنے لگیں۔ ہم سب ان کا کلام سن کر بہت خوش ہوئے اور وقت رخصت میں نے فیض صاحب سے ہاتھ ملایا اور ان کی تعریف کی۔

یہ فیض صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔

اس کے بعد، بلکہ تین چار سال بعد لاہور میں مشہور ادیب ایم اسلم صاحب کے مکان پر ڈاکٹر تاثیر مرحوم کے ساتھ فیض صاحب سے دوسری ملاقات ہوئی۔ وہ کم گو آدمی ہیں اور مجھے بھی زیادہ بولنے کی عادت نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام دعا اور مزاج پرسی سے آگے بات نہ چلی۔ ان کے چلے جانے کے بعد اسلم صاحب نے بتایا کہ ڈاکٹر تاثیر کی میم صاحب کے ساتھ جوان کی ایک بہن آئی تھیں، ان سے فیض صاحب کی شادی ہوگئی ہے۔ لہٰذا تاثیر اور فیض اب ہم زلف ہو گئے ہیں۔

جب دوسری عالمگیر جنگ نے زور پکڑا تو یہ عجب کایا پلٹ ہوئی کہ ہمارے بعض ادیب جو فرنگی حکومت کے سخت مخالف تھے فوجی دفتروں میں اعلیٰ عہدے حاصل کرنے کے لئے ایک دم سے چولا بدل کر حکومت کے وفادار ہو گئے۔ سب سے پہلے مجید ملک فوجی وردی پہنے نئی دلی میں دکھائی دیئے۔ مجھے تو جھٹکا سا لگا مگر وہاں آنکھ پر میل تک نہیں تھا۔ ان کے بعد ڈاکٹر تاثیر ایک فوجی دفتر کے ڈپٹی ڈائرکٹر بن کر

آ گئے۔ انھیں دیکھ کر اور بھی زیادہ افسوس ہوا کیوں کہ یہ تو کھدر کا کرتا اور کھدر کا پاجامہ پہنا کرتے تھے۔ ان کے بعد فیض صاحب دکھائی دیئے کپتان کی وردی پہنے ہوئے۔ حد یہ کہ کچھ دنوں بعد چراغ حسن حسرت بھی وردی پہنے ایک فوجی اخباری کی ایڈیٹری کرنے لگے۔ ایک صاحب تھے عارف آل انڈیا ریڈیو میں، انھوں نے بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پہن لی۔ ایک اور صاحب تھے، بدر، وہ بھی وردی میں دکھائی دینے لگے۔ حد یہ کہ ن۔م۔راشد بھی ریڈیو چھوڑ کر وردی پوش ہو گئے۔ وردی میں سب سے بے ہنگم حسرت مرحوم اپنے بے ڈول جسم اور رفت بھر آگے چلنے والی توند کی وجہ سے لگتے تھے۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ انھوں نے وردی کو نہیں بلکہ وردی نے انھیں پہن لیا ہے اور سب سے زیادہ افسوس فیض صاحب کو دیکھ کر ہوتا تھا کہ یہ شریف آدمی کیوں اس چکر میں پھنس گیا؟ اس وقت روایت یہ مشہور تھی کہ تاثیر نے فیض کو پھانسا ہے۔ تاکہ وہ فخر سے یہ کہہ سکے کہ دیکھو میں نے خط غلامی نہیں لکھا۔ مرحوم سے یہ کچھ بعید بھی نہیں تھا کہ

ہم تو ڈوبے ہیں صنم تم کو بھی لے ڈوبیں گے

کہہ کر دوسروں کو بھی اپنے ساتھ لے ڈوبے۔

جنگ کے زمانے میں دلی میں ادیبوں کی اچھی خاصی کھیپ آ گئی تھی۔ احمد شاہ بخاری (پطرس) ریڈیو میں پہلے سے موجود تھے۔ انھوں نے اپنے گرد ادیبوں کا خاصہ بڑا حلقہ قائم کر لیا تھا۔ ن۔م۔راشد، شوکت تھانوی، انصار ناصری، عشرت رحمانی، غلام عباس، محمود نظامی، بہزاد لکھنوی تو جنگ سے پہلے ہی ریڈیو میں آ چکے تھے۔ جنگ کے زمانے میں چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری، منٹو، میرا جی، اوپندر ناتھ اشک، راجندر سنگھ بیدی، حامد علی خاں اور کرشن چندر بھی ریڈیو میں آ گئے۔ فوجی دفتروں میں مجید ملک، تاثیر، فیض اور بدر آ گئے تھے۔ سونگ پبلی سٹی میں حفیظ جالندھری تھے اور پولی ٹیکنک میں حمید احمد خاں، پطرس کے اشارے پر ایک اونچے درجے کا ادبی حلقہ نئی دلی میں بنایا گیا اور اس کے جلسے کبھی پطرس کی کوٹھی پر اور کبھی تاثیر کے بنگلے پر ہونے لگے۔ مجھے بھی خبر نہیں کیوں یاد فرما لیا جاتا تھا۔ پطرس اگر واقعی دل سے کسی کی عزت کرتے تھے تو وہ پروفیسر مرزا محمد سعید تھے جن سے انھوں نے ایک زمانے میں پڑھا تھا۔ ان کی لمبے انداز علمیت کے پطرس قائل تھے اور اکثر ان کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے۔ حلقے کے پہلے جلسے میں مرزا صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ محمود نظامی نے "اردو شاعری میں عورت" کے عنوان سے مضمون پڑھا۔ اس پر گفتگو ہوئی اور کوئی بات ایسی نکلی کہ اس پر پطرس نے مرزا صاحب کو متوجہ کیا۔ مرزا صاحب دو چار لفظ بول کر خاموش ہو گئے۔ پطرس نے فیض صاحب کو اشارہ کیا اور خبر نہیں انھوں نے دانستہ یا نادانستہ آغاز کلام اس فقرے سے کیا "یہ تو مرزا صاحب آپ جانتے ہی ہیں کہ یونان کی تہذیب رومائی تہذیب سے قدیم تر ہے۔" اتنا سننا تھا کہ مرزا صاحب کو جلال آ گیا۔ چمک کر بولے۔ "جی ہاں، میں جانتا ہوں اور اس سے بھی زیادہ جانتا ہوں۔" اور پھر جو ان کے علم کے سمندر میں طوفان آیا ہے تو انھوں نے آدھ گھنٹے میں قدیم تاریخ کو کھنگال کر رکھ دیا۔ بخاری صاحب زیر لب مسکرا مسکرا کر فیض صاحب کی طرف دیکھتے رہے جن کے چہرے پر ایک رنگ آ رہا تھا اور ایک جا رہا تھا۔ پطرس نے چپکے سے میز پر چائے کا سامان لگوایا اور مرزا صاحب کا لیکچر ختم ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ "آئیے حضرات، چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔" فیض صاحب کی طرح ہم سب کو بھی مرزا صاحب کی تقریر میں مزہ آ گیا اور ہمیں اندازہ ہو گیا کہ پطرس جو عزت مرزا صاحب کی کرتے ہیں واقعی مرزا صاحب اس کے مستحق ہیں۔ اس ایک جلسے کے بعد مرزا صاحب پھر کسی جلسے میں شریک نہیں ہوئے۔ ان جلسوں میں فیض صاحب کا کلام اکثر سننے میں آ جاتا تھا۔ ایک دفعہ دلی کے ٹاؤن ہال میں ایک بہت بڑا مشاعرہ ہوا تھا۔ جس کی صدارت پطرس نے کی تھی۔ اس میں فیض صاحب نے "برفاب سے جسم" والی نظم سنائی تھی۔ ایک صاحب جو میرے برابر بیٹھے ہوئے تھے مجھ سے پوچھنے لگے کہ "برف سے جسم تو ہوتے تھے یہ برفاب سے جسم کیا ہوتے ہیں؟" میں نے کہا۔ "جو برف جیسے نہیں بلکہ برف کے پانی جیسے ہوں۔" بولے۔ "لاحول ولاقوۃ۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔" میں نے انھیں اور جلانے کے لئے کہا۔ "بات تو ہوئی۔ جو لطف برفاب میں ہے وہ برف میں کہاں، ستر سال پہلے غالب بھی تو کہہ گئے ہیں۔ خس خانہ و برفاب کہاں سے لاؤں؟ کوئی تو بات ہے جو انھوں نے برف نہیں باندھا۔ برفاب باندھ گئے۔" ناراض ہو کر منہ پھیر لیا۔

جنگ کا ہی زمانہ تھا کہ کرشن چندر ایک شام کو کتب خانہ علم و ادب پر اردو بازار میں آ گئے۔ یہاں مغرب اور عشاء کے درمیان ادیبوں اور شاعروں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ جامع مسجد میں جب عشاء کی اذانیں ہونے لگیں تو ہم سب اپنے اپنے گھر جانے کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ کرشن چندر مجھے باتوں میں لگا کر ایڈورڈ پارک لے گئے اور بہت پس و پیش کے بعد بولے کہ "میں ایک ناول لکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے شائع کریں گے؟" میں نے کہا۔ "ضرور شائع کروں گا۔" بولے۔ "تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ مجھے اس کی قیمت ایک ہزار پیشگی دے دیں؟" میں نے کہا۔ "روپیہ کب چاہیے؟" بولے۔ "جب آپ دے سکیں۔ میں کشمیر جا کر ایک مہینے میں ناول لکھ لاؤں گا۔" اور واقع میں جب ایک مہینے بعد وہ کشمیر سے واپس آئے تو انھوں نے میرے گھر آ کر "شکست" کا مسودہ میرے حوالے کر دیا۔ ڈھائی مہینے بعد یہ ناول شائع ہو گیا اور اس کی دھوم مچ گئی۔ ڈاکٹر تاثیر نے ایک فرضی نام سے اس پر تنقید لکھی، الٹا اثر ہوا کہ ناول کی شہرت اور بھی زیادہ ہو گئی۔ اب جسے دیکھئے وہ کہہ رہا ہے کہ میں بھی ناول لکھوں گا۔ اشک نے کہا۔ "میں نے بھی ناول لکھنا شروع کر دیا ہے مگر پندرہ سو لوں گا۔" میں نے کہا۔ "اگر شکست سے بہتر لکھو گے تو پندرہ سو ہی دوں گا۔" مگر وہ ناول نہیں لکھا گیا۔ عصمت چغتائی نے "ٹیڑھی لکیر" لکھنا شروع کر دیا۔ منٹو نے ایک ناول دھر گھسیٹا اور خود ہی سے ناپسند بھی کر دیا۔ سنا کہ ڈاکٹر تاثیر ناول لکھنے کو کہہ رہے ہیں۔ ان سے مل کر دریافت کیا تو کہنے لگے کہ "ارادہ تو ہے۔ مگر آپ فیض سے لکھوائیے۔" فیض صاحب سے ان کے فوجی دفتر میں ملا۔ بڑی خندہ پیشانی سے پیش آئے۔ بولے۔ "چھ سو پیشگی دے دیجئے۔" میں نے چیک دے دیں کے وہیں ان کے حوالے کیا۔ حسرت صاحب سے ملاقات ہوئی تو بولے۔ "مولانا، یہ آپ نے کیا ناول شائع کیا ہے؟" میں نے کہا۔ "آپ لکھئے نا۔" بولے۔ "دو سو روپے پیشگی دے جائیے۔" ان کی خدمت میں بھی چیک پیش

کر دیا۔ دو تین مہینے بعد فیض صاحب نے روپیہ واپس کر دیا کہ ناول نہیں لکھا گیا۔

حسرت صاحب نے نہ ناول دیا اور نہ روپے واپس کیے بلکہ ان روپوں کا کبھی بھول کر بھی ذکر نہیں کیا اور میں نے بھی انھیں اس خوف سے یاد دلانا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں وہ سچ مچ ناول لکھ ہی نہ دیں۔ فیض صاحب کی تنہا مثال ہے کہ انھوں نے روپیہ واپس کر دیا ورنہ کم و بیش پندرہ ہزار روپیہ انہی پیشگیوں میں ڈوبا اور پاکستان آنے کے بعد تو میں نے پبلشنگ کے کام سے توبہ ہی کر لی۔

رہا کھٹکا نہ چوری کا، دعا دیتا ہوں رہزن کو

فوجی خدمت سے سبکدوش ہونے کے بعد فیض صاحب "امروز" کے ایڈیٹر ہو گئے۔ چراغ حسن حسرت بھی اسی دفتر میں آ گئے۔ ان حضرات نے اس اخبار کو چار چاند لگا دیئے۔ عام اخباروں سے اس کی نمود مختلف تھی۔ خبروں کے علاوہ اس کا ادبی حلقہ بھی بڑا جاندار ہوتا تھا۔ یہ اخبار بڑھتا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ سب اردو کے اخباروں سے بازی لے گیا۔ انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی تھے۔ اردو کے مضامین تو فیض صاحب کے لکھے ہوئے شاذ ہی دیکھنے میں آئے البتہ انگریزی کے مضامین کئی دفعہ دیکھنے میں آئے۔ بہت سلجھے ہوئے اور پرمغز ہوتے تھے۔

افسوس ہے کہ فیض صاحب نے نثر لکھنے کی طرف کبھی سنجیدگی سے غور نہیں کیا اور اپنی تمام اعلیٰ قابلیت کے باوجود اب تک کوئی مستقل تصنیف پیش نہیں کر سکے اور مجھے انجیل کا وہ قصہ یاد آتا ہے کہ ایک آقا جب سفر پر جانے لگا تو اپنے تین غلاموں کو ایک ایک سونے کا سکہ دے گیا۔ ایک غلام نے اسے خرچ کر ڈالا۔ دوسرے نے اسے زمین میں گاڑ دیا اور تیسرے نے اسے کاروبار میں لگا دیا۔ آقا نے سفر سے واپس آ کر پوچھا کہ تم نے سکے کا کیا کیا؟ پہلے غلام نے کہا "میں نے اسے خرچ کر دیا۔" آقا اس پر بہت بگڑا اور اسے سزا دی۔ دوسرے نے کہا "میں نے اسے زمین میں گاڑ دیا تھا۔ یہ لیجئے یہ موجود ہے۔" آقا اس سے بھی ناخوش ہوا اور بولا کہ "تم نے اسے ضائع نہیں کیا مگر تم نے اس سے فائدہ بھی نہیں اٹھایا۔ یہ تم نے بہت برا کیا۔" تیسرے نے سکہ بھی پیش کر دیا اور منافع بھی جو کاروبار میں اسے لگانے سے حاصل ہوا تھا۔ آقا اس سے بہت خوش ہوا۔ اس کی ستائش کی اور اسے انعام بھی دیا۔ کاش فیض صاحب بھی اپنے ٹیلنٹ کو بروئے کار لاتے اور دوسروں کو اس سے مستفیض ہونے کا موقع دیتے۔ سنا ہے کہ ان کا ایک چھوٹا سا مجموعہ چند مضامین کا بھی شائع ہوا تھا۔ اب تو وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آتا اور اکثر لوگوں کو اس کا نام بھی یاد نہیں رہا۔ انگریزی اخبار پاکستان ٹائمز کی ادارت بھی فیض صاحب ہی کو سونپی گئی تھی۔ اس کے بعد ایک بڑا شاندار ہفتہ وار پرچہ "لیل و نہار" بھی امروز اور پاکستان ٹائمز کے ادارے سے شائع ہونا شروع ہوا تھا۔ اس کے ایڈیٹر بھی فیض صاحب ہی مقرر کیے گئے تھے مگر ان کا نام شاید برائے نام ہی دے دیا گیا تھا۔ لیل و نہار میں نہ تو فیض صاحب بالالتزام کچھ لکھتے تھے اور نہ انھیں اس پرچے کے دفتر میں کبھی کام کرتے دیکھا۔ ایک اور معروف ادیب و صحافی تھے سبط حسن۔ یہی اس پرچے کا سارا کام کرتے تھے۔ کچھ عرصہ بعد سبط حسن کو علیحدہ کر دیا گیا۔ شاید اس وجہ سے کہ وہ کمیونسٹ مشہور ہو گئے تھے۔ "لیل و نہار" جس تیزی سے بڑھا ان کی علیحدگی کے بعد اسی تیزی سے گرنا شروع ہو گیا۔ پروفیسر صوفی تبسم نے اسے بہت سنبھالنے کی کوشش کی لیکن صوفی صاحب کا عہد "لیل و نہار" کا سنبھالا ہی ثابت ہوا اور ایک لائق فخر ہفتہ وار جریدہ موت کی آغوش میں جا سویا۔

کمیونسٹ تو فیض صاحب بھی مشہور ہو گئے تھے مگر ان کی تخریبی سرگرمیاں کبھی دیکھنے میں نہیں آئیں۔ وہ تو ایک خاموش اور مرنجان مرنج قسم کے آدمی تھے اور ہیں۔ مگر کمیونسٹ ہونے کا کلنک کا ٹیکا اگر ایک دفعہ کسی کے لگ جائے تو شاید پھر ساری عمر چھٹائے نہیں چھوٹتا۔ غالباً اسی "داغ بدنامی" کی وجہ سے فیض صاحب "پاکستان ٹائمز" سے، احمد ندیم قاسمی "امروز" سے اور سبط حسن "لیل و نہار" سے علیحدہ کر دیئے گئے۔

جب راولپنڈی کانسپریسی کیس میں بعض بڑے فوجی افسروں کے ساتھ فیض صاحب بھی گرفتار کر لیے گئے تو میری طرح بے شمار لوگوں کو تعجب ہوا کہ یہ شریف آدمی اس زنغے میں کیسے آ گیا؟ یہ کوئی بہت اونچے درجے کی سیاست ہے جسے معمولی عقل کے لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ لہٰذا ہم نے ع

رموز مملکت خویش خسروان دانند

کہہ کر صبر کر لیا۔ غالباً تین سال فیض صاحب قید و بند میں رہے۔ اس زمانہ میں ان کی بیگم نے مردانہ وار ابتر حالات کا مقابلہ کیا۔ ملازمت کی اور اپنی بچیوں کے معیار زندگی میں فرق نہیں آنے دیا۔ ان کی تعلیم بھی جاری رہی اور ان کے اعلےٰ خرچ بھی چلتے رہے۔ میں نے بیگم فیض کو اخبار کے دفتر میں پسینے میں شرابور نہایت انہماک سے کام کرتے دیکھا ہے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں ان کے قریب جا کر انھیں اس حوصلے کی داد دیتا۔ دور سے انھیں دیکھتا اور بھاری دل اور بھاری قدموں کے ساتھ چلا آیا۔ بارے یہ ابتلا کا دور بھی ختم ہو گیا اور فیض صاحب بری ہو کر اپنے گھر آ گئے۔ ان کے جیل میں رہنے کا ایک فائدہ فیض صاحب کو ہوا ہو یا نہ ہوا ہو، ہمیں یہ ہوا کہ ان کی منظومات کے دو مجموعے "زنداں نامہ" اور "دست صبا" ہمیں مل گئے۔

بے روزگاری کے زمانے میں فیض صاحب نے ایک فلم کے مکالمے وغیرہ لکھے تھے اور بین الاقوامی انعام ملا تھا۔ مگر فلم سازی اور فلم بازی سے کسی بھلے آدمی کو کیا سروکار؟ فیض صاحب دراصل تعلیمی سلسلے کے آدمی تھے۔ مگر کسی یونیورسٹی نے کوئی پیش کش نہیں کی۔ شاید اہل اختیار ان کے کلنک کے ٹیکے سے ڈرتے تھے۔ بارے جب لاہور میں آرٹس کاؤنسل کی شاخ قائم ہوئی تو فیض صاحب اس کے سکریٹری مقرر ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انھیں لینن پرائز دینے کا اعلان روس نے کیا۔ یہ تقریباً وہی زمانہ تھا جب پاسٹرناک کو اس کی کتاب ڈاکٹر ژواگو پر نوبل پرائز دیئے جانے کا اعلان ہوا تھا اور حکومت روس نے اس بوڑھے مصنف کی حالت کتے سے بدتر کر دی تھی۔ اب اسی کمیونزم کے منبع سے فیض صاحب کو انعام دینے کا اعلان کیا گیا تھا۔ سب نے دم سادھ لیا کہ اللہ خیر کرے۔ دیکھئے اب کیا گل کھلتا ہے؟ مگر حکومت پاکستان نے اس غیر ملکی اعزاز پر روس کی طرح تنگ دلی کا مظاہرہ نہیں کیا اور شکر ہے کہ ہمارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔ جب فیض صاحب انعام لینے کے لئے روس جانے لگے تو کراچی

(بقیہ صفحہ نمبر 22 پر)

فیض - ایک پیاری شخصیت

ڈاکٹر ملک راج آنند
ترجمہ: سید رضا کاظمی

جھکی ہوئی کشادہ پیشانی، ہلکی زرد آنکھیں، ہونٹوں پر گریزاں تبسم اور اس کا سراپا کمرے کی خواب آلود فضا میں ڈوبا ہوا جس پر نیم وا پردہ سے چھن کر صبح صادق کی دھندلی روشنی پڑ رہی تھی۔ یوں میں نے فیض کو پہلی بار دیکھا۔ رات کی گاڑی سے میں الٰہ آباد سے امرتسر پہنچا تھا اور اسٹیشن سے سیدھا ڈاکٹر تاثیر کے مکان گیا جہاں فیض بھی ٹھہرے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر تاثیر اور ان کی بیگم ابھی محوِ خواب تھے اس لئے ان کا نوکر مجھے اس کمرہ میں لے گیا تھا جس میں کنوارا شاعر بطور مہمان قیام پذیر تھا۔ چوں کہ میں نے تمام رات ایک کمبل میں گذاری تھی اس لئے میں سردی میں ٹھٹھر سا گیا تھا۔ جب میں نے فیض سے اپنی پریشانی کا تذکرہ کیا تو وہ فوراً اپنے بستر سے اٹھ کھڑے ہوئے اور مجھ سے کہا کہ میں ان کے بستر میں سو رہوں۔ یہ کہہ کر وہ میرے لئے چائے کا انتظام کرنے چلے گئے۔ میں نے ان کے مشورہ پر عمل کیا اور بستر پر لیٹ گیا لیکن ہندوستان کے ایک عظیم شاعر سے ملاقات کی مسرت میرے لئے کچھ اتنی ہیجان انگیز تھی کہ میں کوشش کے باوجود نہ سو سکا۔ جب چائے آئی اور فیض نے صبح کا پہلا سگریٹ جلایا تو ہم دونوں ایک دلچسپ بحث میں پوری طرح الجھ چکے تھے۔ میرا استدلال تھا کہ جلد یا بدیر ہندوستانی زبانوں کی شاعری اپنے روایتی بندھن توڑ کر آزاد ہو جائے گی تاکہ صحیح جذبات کی ادائگی اور ترجمانی ممکن ہو سکے۔ فیض کو میری رائے سے اختلاف تھا۔ ان کا خیال تھا کہ روایت سے انحراف نہ مناسب ہے نہ ممکن۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس سلسلہ میں ان کی توجہ فرانسیسی شاعر آرتھر رمباں کی جانب مبذول کرائی تھی جو ایسے ملک کا شاعر تھا جہاں روایت پسندی اور پرانی قدروں کا رجحان بے حد قوی ہے لیکن اس کی آزاد شاعری اس ملک کی شاعری میں انقلاب لے آئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی میں نے فیض کو ٹی ایس ایلیٹ کی مشہور نظم "الفریڈ روفراک کا نغمہ محبت" کا پہلا بند بھی پڑھ کر سنایا تھا۔

تو آؤ ہم دونوں چلیں
ان نیم سنسان گلیوں میں
جو جانی پہچانی ہیں
جن میں برادہ والے ریستوران ہیں اور مونگے موتی کی دوکانیں
اس کمرہ میں جس میں عورتیں آتی جاتی ہیں
اور مائیکل انجیلو کا تذکرہ کرتی رہتی ہیں

جواباً فیض نے میرے بے تحاشا بڑھے ہوئے سر کے بالوں کو دیکھا اور صرف ایک لفظ کہا۔ "بوہیمین"

یہ حقیقت ہے کہ فیض کا طنز بالکل بجا اور درست تھا۔ میں تقریباً دس گیارہ سال سے امرتسر سے جلاوطن تھا۔ اس دوران میں لندن، پیرس، ایتھنز، ویانا اور برلن میں گھومتا رہا تھا اس آوارہ گردی کے باوجود میں نے کچھ نہ کچھ ضرور حاصل کیا تھا۔ مضطرب متلاشی اور خوفزدہ ہونے کے باوجود میں نے ہمت نہ ہاری تھی۔ میرے دل میں دنیا کا درد تھا۔ لیکن زندگی اور اس کی نیرنگیوں میں میری دلچسپی برقرار تھی۔ اس ردعمل کے تحت جو میرے چچیرے بھائی کی جواں مرگی سے میرے دل میں اس وقت پیدا ہوا تھا، جب میں خود کمسن تھا اس وقت میری عمر صرف گیارہ سال تھی۔ میری ابتدائی انگریزی تصانیف کا کسی نے نوٹس نہ لیا تھا۔ میرے منحنی جسم میں آتشیں روح بسی ہوئی تھی۔ بلاشبہ میں بوہیمین تھا! لیکن میں اپنے جذبات بے حد حساس فیض تک کیوں کر پہنچاتا؟ فیض جو خاموش طبع اور سنجیدہ تھا جس نے اس وقت تک پنجاب سے باہر کا سفر بھی نہ کیا تھا۔ میں اسے کیوں کر بتاتا کہ اس کے ارد گرد وسیع دنیا پھیلی ہوئی ہے۔ ایسی دنیا جسے ابھی پوری طرح دریافت نہیں کیا گیا ہے۔ اس حقیقت نے دنیا کے وسیع حصہ میں غم و آلام بکھرے ہوئے ہیں۔ جو ستم رسیدہ ہے اور تباہی کے دہانے پر کھڑی ہے۔ مجھے اظہار سے روک دیا اور میں فیض سے یورپ کی ترقی کی بات نہ کر سکا۔ اس کے باوجود مجھے اس بات کا احساس تھا کہ فیض جیسے شعراء کے لئے غزل یا نظم سے والہانہ عشق و وابستگی ایک قسم کی سہل انگاری ہے۔ چوں کہ میں مغربی شعراء کا ذکر چھیڑنا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے اقبال کا نام لیا جس کے کلام نے فیض کو کافی متاثر کیا تھا اور جس نے مجھے بھی فلسفہ کی جانب راغب کیا تھا اور میں سچائی کی تلاش میں یورپ چلا گیا تھا۔ فیض نے کہا کہ عمر کے ساتھ ساتھ اقبال میں بھی روایت پسندی کا رجحان بڑھتا گیا۔ میں نے کہا کہ میں اقبال کی شاعری کے اس دور کی جانب اشارہ کر رہا ہوں جب وہ شاندار ماضی کو دوبارہ واپس لانے کی کوشش میں اسلام کی جانب متوجہ نہ ہوئے تھے۔ میں نے فیض کو بتایا کہ میں اس اقبال کو جو بانگ درا کا متلاشی ہے ترجیح دیتا ہوں اس مسافر شاعر پر جو اپنی منزل پر پہنچ چکا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ میں بہرحال گوئٹے کو اقبال پر ترجیح دیتا ہوں۔

(۲)

ہماری بحث جاری رہی۔ الفاظ کے اس پردہ کے باوجود میں نے خود اپنی ندامت چھپانے کے لئے کھڑا کر دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ فیض روایتی شاعری سے والہانہ لگاؤ رکھتا ہے اور کچھ عرصہ بعد کشمیر میں جہاں ہم دونوں نے پورا موسم گرما ساتھ گذارا مجھے ان احساسات و جذبات کا اندازہ ہونے لگا۔ جن پر فیض کی شاعری کی اساس تھی۔

میں ان تمام مشاعروں میں موجود تھا جہاں فیض نے اپنی غزلیں پڑھیں اور مجھے احساس ہوا تھا کہ اپنی محبت کے اظہار میں فیض کا شعور بہت پختہ تھا۔ اس کے الفاظ کہیں زیادہ پرخلوص محسوس ہوئے ان گھسے پٹے الفاظ اور جملوں کے مقابلہ میں جو اردو کی روایتی شاعری میں آج تک سنائی دیتے رہے ہیں۔ جذبات کی ترجمانی میں سچائی اور خلوص کی ایک ایسی کھنک تھی، جو سننے والوں کے دلوں کو چھو لیتی تھی جب کہ الفاظ کی ظاہری اور صوتی خوبیاں واہ واہ اور تعریفوں کے ڈونگرے سمیٹ لیتی تھیں۔

میں نے فیض کی شاعری کو محض اس لئے پڑھنا شروع کیا تاکہ میں مشاعروں کے جھوٹے اور مصنوعی ماحول سے اسے الگ کر کے اس کی صحیح پذیرائی کر سکوں اور اس طرح میں فیض کے دل کے نقشہ پر سفر کرتا ہوا اس کی تنہائیوں کی حدود میں داخل ہوسکا۔ وہ انتہائی نرم انداز میں ان تمام عورتوں کو اشارے کر رہا تھا جو رخصت سے پہلے ہی ان تاریکیوں میں گم ہوتی جا رہی تھیں، جہاں ہندوستان کی خواتین مرنے کے لئے گم ہو جاتی ہیں اور نہ جانے کیوں مجھے گمان ہوتا کہ انہوں نے فیض کو کھا لیا ہے ان لمحات میں جب وہ دبے پاؤں تاریکی کی جانب بڑھ رہی تھیں۔ اس کے بعد فیض کی تنہائیوں کا ساتھی کوئی خیال ہوتا یا کوئی پرندہ یا پھول۔ غزل نے اپنے حسن سے فیض کو مسحور کر رکھا تھا۔ اس دور کی شاعری پر غالب اور اس کے پیش روؤں کی شاعری کا اثر قائم تھا اور فیض بھی اس ہمہ گیر اثر سے باہر نہ نکل سکتا تھا۔ وہ بھی قیدی تھا ناکام محبت کے جذبات کی ترجمانی کا!

(۳)

یورپ واپس جانے سے پہلے میں نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ فیض اپنے چمن زار شاعری میں نئے نئے نورانی بیج بونے لگا ہے۔ سیاسی حالات کے تحت پہنچنے والے صدموں نے گویا اس کی آنکھیں کھول دی تھیں۔ اب اس کی شاعری مقامی حدود سے باہر نکل رہی تھی گو کہ تشبیہیں اور استعارے وہی پرانے تھے لیکن اب فیض نے انہیں ایک وسیع سمندر میں اچھال دیا تھا۔ شاعر کے ہونٹوں کا تبسم راتوں پر چھا گیا تھا لیکن اس کا چہرہ، جس پر حیا کی سرخی بکھری ہوئی تھی انسانیت کے سامنے آئینہ بن کر ابھر آئی تھی۔ اس مقام پر تنہا کھڑے ہو کر وہ کبھی ستاروں کو دیکھتا کبھی زمین کو۔ اور اس طرح حقیقت اور عمل کے درمیان فاصلوں کو ناپنے کی کوشش کرتا۔ اب یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ فیض تمام بندشوں سے آزاد ہو کر اپنے دور کی جدوجہد میں شامل ہو گیا ہے۔

مجھے معلوم ہوا کہ اس نے مسز کرسٹوبل تاثیر کی چھوٹی بہن ایلس سے شادی کر لی ہے۔ میں فیض کی اس انتہائی حساس جوان خاتون سے لندن سے واقف تھا اور مجھے یہ سوچ کر بڑی مسرت ہوئی کہ اب فیض ان مقامی جذبات سے آزاد ہو گیا ہے جو اسے غیروں سے قریب تر ہونے کے تجربوں میں مانع تھے۔ میری یہ توقعات بھی صحیح تھیں کہ اب حسین ایلس، فیض کو مغرب کے حسن سے آشنا کر دے گی اور دونوں خود کو بے تکلفی کی ایسی سطح پر پا کر جو عورت اور مرد کے حقیقی تعلق سے پیدا ہوتی ہے ہمیشہ مسکراتے رہیں گے۔

(۴)

جب میں سات سال بعد جو کہ دوسری جنگ عظیم کا خونریز زمانہ تھا۔ یورپ سے واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ فیض بالکل آزاد ہو گیا ہے۔ مجھے معلوم نہیں کہ کن واقعات یا حادثات نے اسے اس کی تنہائیوں کے گھیرے سے اس طرح باہر نکال پھینکا کہ اب اس کی جوانی عظمت کی راہ پر چل پڑی تھی۔ اس میں پہلی جیسی جھجک نہ تھی۔ اس کے برعکس میں نے ڈاکٹر تاثیر کو ہمیشہ مصلحت پسند اور غیر متوازن پایا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان لوگوں کا جو جھوٹے الفاظ اور نمود و نمائش کے ذریعہ اپنی عظمت برقرار رکھنا چاہتے ہیں نام و نشان تک باقی نہیں رہتا اس لئے کہ دیوتا انسانوں کے بہت قریب ہیں اور ان پر کڑی نظر رکھتے ہیں۔ مابعد جنگ فیض کا کلام اس حقیقت کی نشاندہی کرتا ہے کہ ہر شے تصورات کے دائرے میں فتح کی جا سکتی ہے۔ یہاں تک کہ ہم حیرت و استعجاب کے عالم میں پکار اٹھتے ہیں۔ "واقعی؟ میرا بھی یہی خیال ہے" یا "میں نے بھی یہی محسوس کیا تھا" اور اس قسم کی شاعری کی سچائی اور اس کے خلوص کا اندازہ اس بات سے بآسانی لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہماری زندگیوں اور اس کے بدلتے ہوئے رجحانات سے کس قدر مطابقت رکھتے ہیں۔ اس کے بعد ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہو گیا اور ہندوستان پاکستان آزاد ہو گئے۔ آزادی کے فوراً بعد انسانیت سوز اور شرمناک فسادات کی آگ پھیل گئی جن سے فیض کی روح بھی لرز کر رہ گئی اور اس نے ہمیں ایسے نوحے سنائے جن میں زخم خوردہ انسانیت کا ماتم تھا۔ کیوں کہ انسانی اقدار اور عالمگیر اخوت پر فیض کے خیالات کسی سے ڈھکے چھپے نہیں تھے۔ انسانیت کی تحقیر و تذلیل پر وہ بھی غمگین و آبدیدہ تھا۔

اس کی شاعری اب اس شعلہ کے مانند تھی جو غم و الم کی ٹھنڈی راکھ سے ابھرتا ہے اور خود جلتا ہوا پڑھنے والے کے دل میں ان کے جذبات کا خیال کئے بغیر در آتا ہے۔ مشترک درد و الم کا احساس دو بھائیوں کو بھی متحد کر دیتا ہے چنانچہ دیوار نے اگرچہ گھر کے دو حصوں کو تقسیم کر دیا لیکن اگر کوئی اپنا مقدر خود پسند کرنے کی جرات کر سکے اور غم و الم کو جوانمردی سے سہار بھی سکے تو لین دین کا غیر منقسم تجربہ ضرور کامیاب رہے گا اور اس طرح ایک دل دوسرے کا آئینہ بن جائے گا۔

(۵)

پچھلے دس سال میں فیض سے میری ملاقات صرف بین الاقوامی اجتماعات میں اسٹاک ہوم، بمبئی، ماسکو اور ہوانا میں ہوئی ہے۔ ایسے اجتماعوں میں ذاتی دوستی کا تعلق برقرار رکھنا قدرے دشوار ہوتا ہے لیکن اسکے باوجود ہر بار جب ہم ملے تو ہم نے ان بڑی کانفرنسوں کو بے تکلف دوستی کی اس فضا میں تبدیل کر دیا جو ہماری پہلی ملاقات میں اس چھوٹے سے کمرے میں قائم ہوئی تھی اور اس طرح ہم نے ایک دوسرے کو صرف الفاظ سے چھوا۔۔۔ ان الفاظ سے جو ہماری بربادی کی تلخ یادوں کے ساتھ اب بھی کبھی کبھی ہمارے لب پر آ جاتے ہیں اور جو اس آگاہی کے ساتھ آتے ہیں کہ یہ دنیا بڑی بے وفا ہے لیکن ہمارے جذبات و احساسات اتنے گریزاں اور تغیر پسند ہیں کہ انھیں حرف آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ جام ہمیشہ ہمارے ہاتھوں میں ہوتے ہیں جو ہمیں اپنے دور کی تکلیف دہ اور گھٹی ہوئی فضا سے اوپر اٹھا کر مستقبل کے پر اسرار دھندلکے میں لے جاتے ہیں اور ہم امید کرنے لگتے ہیں کہ ہم پھر ملیں گے اور ستاروں کو چھو لیں گے۔

SAYYED RAZA KAZMI

چند یادیں چند تاثرات

ڈاکٹر عبادت بریلوی

یادش بخیر لکھنؤ یونیورسٹی بھی کسی زمانے میں خوب جگہ تھی۔ ادب کے چرچے اور سیاست کے ہنگامے شاید ہی کسی یونیورسٹی نے اس طرح دیکھے ہوں جیسے کہ لکھنؤ یونیورسٹی نے دیکھے ہیں۔ میں جس زمانے میں وہاں پڑھتا تھا تو اس زمانے میں تو ادب کے یہ چرچے اور سیاست کے یہ ہنگامے اپنے شباب پر تھے۔ بڑی جاندار اور صحت مند فضا تھی۔ گوشے گوشے سے زندگی کے طوفان امڈتے تھے۔ دلوں میں نئی امنگیں انگڑائیاں لیتی تھیں اور نئے جنوں کے لئے نئے ویرانوں کی تلاش کا خیال ہر طرف برسات کے بادلوں بلکہ ساون کی گھٹاؤں کی طرح چھایا ہوا نظر آتا تھا۔

۱۹۴۰ء کے آس پاس کا زمانہ ہے کہ اس زمانے میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریکیں شروع ہو چکی تھیں اور اپنے عنفوان شباب کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ ہر طرف جدید ادب کا چرچا تھا۔ ادبی محفلوں اور مقامی اخباروں میں نئے ادب اور ترقی پسند ادب پر گرما گرم بحثیں ہوتی تھیں۔ یونیورسٹی میں جدید ادب کے کئی علمبردار موجود تھے۔ ڈاکٹر علیم، احمد علی، سید احتشام حسین، علی سردار جعفری اور علی جواد زیدی وغیرہ کی موجودگی سے وہاں جدید ادب کا اچھا خاصا ماحول پیدا ہو گیا تھا۔ نئے رسالے آتے تھے اور ان میں نئے لکھنے والوں کی جو تخلیقات شائع ہوتی تھیں ان کو نہ صرف شوق و اشتیاق سے پڑھا جاتا تھا بلکہ ان کی جانچ اور پرکھ بھی ہوتی تھی۔ ایک ایک نظم پر اور ایک ایک کہانی پر ہفتوں اور مہینوں بحثوں کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

جدید شاعروں میں فیض، راشد اور میراجی اس زمانے میں سب سے زیادہ نمایاں تھے۔ ان کی نظمیں اس زمانے کے رسالوں میں بڑے اہتمام سے شائع ہوتی تھیں اور جدید شاعری کے پرستار انہیں بڑے شوق سے پڑھتے تھے اور بلاشبہ ان نظموں میں انہیں ایک نئے رنگ و آہنگ کا احساس ہوتا تھا۔

مجھے فیض کی شاعری سے اسی زمانے میں آشنا ہونے کا موقع ملا۔ اسی زمانے میں ان کی کچھ ہلکی پھلکی رومانی نظمیں لاہور کے بعض ادبی رسالوں میں شائع ہوئیں۔ بعض ترقی پسند دوستوں پر ان نظموں کا کوئی خاص اثر نہیں ہوا بلکہ ان میں انقلاب کی گھن گرج کے فقدان سے وہ کچھ مایوس سے ہوئے اور انھوں نے یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ ان نظموں میں جدت ضرور ہے لیکن ان میں فرار کا احساس ہوتا ہے اس لئے ان کو اہمیت نہیں دی جا سکتی لیکن مجھ پر نظموں کا گہرا اثر ہوا۔ میں نے انہیں دلچسپی سے پڑھا۔ تنہائی میں گنگنایا، احباب سے ان کی خوبیوں پر گفتگو کی۔ ترقی پسند مخالفین کی رائے کو ان کی جذباتیت پر محمول کیا اور ادبی محفلوں میں اس موضوع پر خاصے تنقیدی ہنگامے کئے۔

فیض کی ان رومانی نظموں کو ابھی میں مزے لے لے کر پڑھ رہا تھا اور ان میں سے بیشتر مجھے ازبر ہو چکی تھیں کہ ان کی نظمیں "مجھ سے پہلی سی محبت میرے محبوب نہ مانگ" "چند روز اور میری جان فقط چند ہی روز اور" اور "رقیب سے" شائع ہوئیں۔ ان نظموں میں زندگی کا جو نیا شعور اور اس شعور کے ابلاغ میں جو نیا رنگ و آہنگ تھا اس نے بہت ہی لطف دیا اور اب وہ جذباتی قسم کے ترقی پسند بھی فیض کے قائل ہو گئے۔ جو اس سے قبل ان کی رومانی نظموں کے خلاف تھے۔ اب انہیں فیض کی نظموں میں رومان و حقیقت کا سنگم نظر آیا اور وہ بھی ان کو اعلیٰ درجے کا شاعر ماننے اور ان کی شاعری کو سراہنے پر مجبور ہوئے۔

ابھی ان نظموں کو رسالوں میں شائع ہوئے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ ان کی کتاب "نقش فریادی" چھپ کر آگئی اور اس مختصری کتاب نے ادبی حلقوں میں دھوم مچا دی۔ میں نے بھی اس کا ایک نسخہ خریدا اور اس میں جو نظمیں اور غزلیں شائع ہوئی تھیں ان کو بار بار پڑھا۔ یہاں تک کہ تقریباً تمام نظمیں مجھے زبانی یاد ہو گئیں۔ ان نظموں میں رومانیت اور حقیقت کی جو دھوپ چھاؤں تھی اس نے مجھے اس طرح محسوس کرنے پر مجبور کیا جیسے ان میں ہماری ہی باتیں پیش کی گئی ہیں۔ دراصل ان نظموں کی سب سے اہم خصوصیت ہی یہ تھی کہ اس زمانے کے نوجوان کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی پوری طرح عکاسی کرتی تھیں۔ وہ نوجوان جو رومان و حقیقت کے سنگم پر کھڑا تھا۔ جس کو اپنی روایت سے رومانیت اور جذبات پسندی ملی تھی لیکن جس کو نئی زندگی کے احساس و شعور نے حقیقت پسندی کی دولت سے بھی مالا مال کیا تھا۔ اسی لئے ہر نوجوان کو نقش فریادی کی نظموں میں ایک طرح کا آفاقی آہنگ نظر آتا تھا اور اس میں اپنے ہی جذبات و احساسات کی تھرتھراہٹ محسوس ہوتی تھی۔ آج چوبیس پچیس سال گزر جانے کے بعد جب مجھے نقش فریادی کی اشاعت کا وہ دور یاد آتا ہے تو یہ مصرعے میرے ذہن کی پہنائیوں میں ایک دفعہ پھر گونجنے لگتے ہیں اور میں انہیں گنگنانے کے لئے مجبور ہو جاتا ہوں ۔

اے کہ تو رنگ و بو کا طوفان ہے
اے کے تو جلوہ گر بہار میں ہے
پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہار شباب

آ کہ کچھ دل کی سن سنا لیں ہم
آ محبت کے گیت گا لیں ہم

سو رہی ہے گھنے درختوں پر   چاندنی کی تھکی ہوئی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے   کہہ رہی ہے حدیث شوق نیاز
ساز دل کے خموش تاروں سے
چھن رہا ہے خمار کیف آگیں   آرزو ، خواب ، تیرا روئے حسین

☆

نہ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں   ہجوم شوق سے اک دل ہے بیقرار بھی

☆

پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں
راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا

راہرو ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سوگئی راستہ تک تک کے ہر ایک راہگزار

ان مصرعوں میں عنفوان شباب کے مخصوص جذبات کا جوارتعاش ہے جو آج بھی اسی طرح اثر کرتا ہے جیسے آج سے برسوں پہلے کیا کرتا تھا۔ آج بھی ان کو پڑھ اور گنگنا کر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آنکھوں کے سامنے حد نظر تک مسحور کر دینے والی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے اور زندگی نے اس چاندنی میں اپنے آپ کو کچھ اس طرح غرق کر دیا ہے کہ دور دور تک اس کو کچھ اور نظر ہی نہیں آتا۔ زندگی کے یہ لمحے بھی کتنے حسین ہوتے ہیں؟ اس میں شبہ نہیں کہ یہ ہمیشہ باقی نہیں رہتے۔ وقت کا دھارا انہیں بہا کر نہ جانے کہاں لے جاتا ہے لیکن یادوں کا روپ اختیار کر کے وہ پھر بھی زندگی کے ساتھ رہتے ہیں اور کسی حال میں بھی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتے۔

ابھی نقش فریادی کو شائع ہوئے کوئی سال بھر ہوا تھا کہ فیض ایک مشاعرے میں شرکت کے لئے لکھنؤ آئے اور اس طرح انہیں دیکھنے اور پھر ان سے ملنے کا مجھے موقع ملا۔

یہ تو مجھے یاد نہیں کہ یہ مشاعرہ کن لوگوں نے کیا تھا لیکن اتنا یاد ہے کہ اس میں پرانے شعراء کے علاوہ نئے اور جدت پسند شاعروں کو بھی مدعو کیا گیا تھا اور یہ خبر سن کر کہ فیض بھی اس میں شریک ہو رہے ہیں میں بھی اس میں گیا تھا۔ لکھنؤ کے گنگا پرشاد میموریل ہال میں مشاعرے کی یہ محفل ترتیب دی گئی تھی۔ گلابی جاڑوں کے دن تھے۔ بڑی ہی خوشگوار خنکی تھی۔ رات کے آٹھ بجے کے قریب مشاعرہ شروع ہوا۔ مولانا حسرت موہانی، حضرت جگر مرادآبادی، مجاز، جاں نثار اختر، جذبی اور فیض اس محفل میں موجود تھے۔ مشاعرہ شروع ہوا۔ مختلف شعراء اپنا کلام سناتے رہے۔ جب صدر نے فیض سے کلام سنانے کی درخواست کی تو ایک صاحب سیاہ شیروانی اور سفید پاجامے میں ملبوس ایک طرف سے اٹھ کر اسٹیج پر آئے اور انھوں نے صدر کی اجازت سے اپنا کلام پڑھنا شروع کیا۔ اس زمانے میں ترنم سے پڑھنے کا بڑا زور تھا۔ جگر صاحب نے اپنے دلآویز ترنم سے مشاعروں کی فضا میں ایک انقلابی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ ان کے علاوہ اس وقت کے نظم گو شعراء تک ترنم سے پڑھتے تھے۔ حفیظ، ساغر، روش، احسان دانش سب نے اپنے ترنم سے مشاعروں کی فضا کو رنگین اور پرکار بنا رکھا تھا لیکن بعض نوجوان شعراء تحت اللفظ بھی پڑھتے تھے۔ فیض نے بھی اس مشاعرے میں اپنا کلام تحت اللفظ پڑھا لیکن سامعین ان کے معنی خیز کلام اور پڑھنے کے مخصوص، معصومانہ انداز سے بے حد متاثر ہوئے۔ ایسی داد ملی کہ سماں بندھ گیا۔ فیض کا کلام تو اس زمانے میں خاصا مشہور تھا۔ آج ان کی زبان سے ان کے کلام کو سن کر لوگ بہت محظوظ ہوئے۔ مجھے بھی ایمان کی بات ہے کہ ان کے کلام اور پڑھنے کے انداز دونوں نے بہت لطف دیا۔

مشاعرے کے بعد وہ چند روز لکھنؤ میں اور ٹھہرے اور ان دنوں میں مجھے ان کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع بھی ملا۔ ملاقات تو اس کو نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ میں بغیر کسی تعارف کے خود کسی سے ملنے میں بہت کمزور واقع ہوا ہوں۔ بڑی مشکل سے کھلتا ہوں اس وقت بھی یہی صورت حال پیش آئی۔ اب یہ بھی یاد نہیں رہا کہ اس وقت فیض سے کہاں اور کس کے مکان پر ملاقاتیں ہوئیں بہر حال اتنا یاد ہے کہ ہم چند طالب علم اپنے چند شاعر قسم کے احباب کے ساتھ فیض سے ملنے کے لئے گئے اور ان سے کئی ملاقاتیں بھی ہوئی تھیں۔ یہ بھی یاد ہے کہ فیض بولتے بہت کم تھے۔ میرے نوجوان ساتھیوں میں بعض بڑے تیز اور چرب زبان لوگ تھے۔ انھوں نے فیض سے ہر پہلو سے بات کرنے کی کوشش کی۔ خدا جانے کتنے سوال پوچھ ڈالے لیکن جواب ہوں، ہاں کے سوا کچھ بھی نہ ملا۔ خاصی دیر تک باتیں کرنے کے بعد صرف اتنا معلوم ہوا کہ فیض کا وطن سیالکوٹ ہے اور وہیں تعلیم حاصل کی ہے۔ شاعری بچپن سے کر رہے ہیں۔ لیکن گورنمنٹ کالج لاہور کی فضاؤں میں ان کی شاعری کو پھلنے پھولنے کا موقع دیا ہے۔ آج کل ام اے او کالج امرتسر میں انگریزی زبان وادب پڑھاتے ہیں۔ نئے ادب اور ترقی پسند ادب کی تحریک سے متاثر ہیں لیکن روایت سے کسی حال میں بھی رشتہ نہیں توڑنا چاہتے لیکن یہ تمام باتیں فیض نے خود نہیں کہیں۔ ہم میں سے بعض لوگوں نے مختلف سوال کر کے یہ معلومات فراہم کیں لیکن یہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ سوال طویل تھے لیکن فیض نے جو جواب دیئے ان میں حد درجہ اختصار تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یا تو وہ باتیں کر نہیں سکتے یا کرنا نہیں چاہتے۔

میں نے اس وقت یہ محسوس کیا کہ فیض نہایت شرمیلے آدمی ہیں۔ خواہ مخواہ باتیں نہیں کرتے۔ شاید کر بھی نہیں سکتے۔ طولانی سوالوں کا جواب بھی ہوں، ہاں سے دیتے ہیں۔ اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں گفتگو تو انہیں ذرا بھی پسند نہیں تعلّی سے تو وہ دو، بلاواسطہ بھی نہیں رکھتے۔ برخلاف اس کے ان کے مزاج میں مجھے عجز وانکسار کے عناصر نسبتاً زیادہ نمایاں نظر آئے اور میں نے یہ محسوس کیا کہ ان کی طبیعت میں وہ خصوصیات موجود ہیں جو ایک اعلیٰ درجے کے شاعر وادیب میں ہونی چاہئیں۔ مثلاً انہیں اپنی شاعری کے بارے میں غلط فہمیاں نہیں ہیں۔ وہ یہ نہیں سمجھتے کہ انہوں نے اپنی شاعری سے زندگی اور ادب میں کوئی انقلاب برپا کر دیا ہے۔ وہ تو بس اس لئے

شعر کہتے اور شاعری کرتے ہیں کہ ان کا جی چاہتا ہے اور کوئی نامعلوم سی خلش انہیں ایسا کرنے کے لئے مجبور کرتی ہے۔

فیض سے اگرچہ میری یہ ملاقات مختصر تھی لیکن اس ملاقات نے مجھے بہت لطف دیا۔ کیوں کہ آج مجھے ایک ایسے شاعر کو دیکھنے اور اس سے ملنے کا موقع ملا جس کی شاعری کو میں نے مزے لے لے کر پڑھا تھا اور جس میں مجھے انسانی جذبات و احساسات کے نشیب وفراز اور سماجی زندگی کے مدوجزر کی ایک واضح تصویر نظر آئی تھی۔

دوسرے ہی دن فیض امرتسر واپس چلے گئے۔

اس وقت دوسری جنگ عظیم اپنے شباب پر تھی۔ ہندوستان میں ایک ہنگامہ تھا۔ برطانوی حکومت یہ کہتی تھی کہ یہ جنگ امن اور انسانیت کے لئے لڑی جارہی ہے۔ ہندوستان کے لیڈروں کو اس سے اختلاف تھا۔ بڑے بڑے رہنما جیل میں تھے۔ اسی زمانے میں اشتراکیوں اور ترقی پسندوں نے یہ اعلان کیا کہ یہ جنگ واقعی امن اور انسانیت کی جنگ ہے۔ چنانچہ بہت سے اشتراکی اور ترقی پسند ادیب تو رہا کر دیئے گئے لیکن دوسرے سیاسی لیڈر جیلوں میں رہے۔ عجیب الجھن اور کش مکش کا زمانہ تھا۔ ہندوستان کو اس جنگ سے زیادہ اپنی جنگ آزادی سے دلچسپی تھی۔ لوگوں کو اس حقیقت کا احساس تھا کہ اس جنگ کو جیتنے کے لئے برطانوی حکومت نہ صرف ہندوستان کی دولت پانی کی طرح بہاتی جارہی ہے بلکہ ان کے سپوت بھی صرف چند سکوں کے عوض جنگ کے مختلف میدانوں کو اپنے خون سے سیراب کر رہے ہیں۔ اس احساس نے نوجوانوں کے دلوں میں برطانیہ کے خلاف نفرت کی ایک آگ سی بھڑکا دی تھی۔

اسی زمانے میں یہ خبر آئی کہ فیض نے کالج کی ملازمت چھوڑ کر فوجی ملازمت کرلی ہے اب وہ لیفٹننٹ کرنل فیض احمد فیض ہو گئے ہیں اور دلی میں ان کا تقرر محکمہ تعلقات عامہ کے اس محکمہ میں ہوا ہے۔ جس کو برطانوی حکومت نے جنگ کی پبلسٹی اور پروپیگنڈے کے لئے قائم کیا ہے۔

یہ خبر سن کر افسوس بھی ہوا اور کسی حد تک غصہ بھی آیا۔ اس خیال سے کہ فیض کے ایسے حساس اور لطیف مزاج رکھنے والے شاعر کو ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا۔ مہینوں اس پر لکھنؤ کے ادبی حلقوں میں بحثیں ہوتی رہیں۔ ترقی پسندوں نے اس کو سراہا۔ اس لئے کہ اس جنگ میں روس بھی شامل تھا اور ان کے لئے یہ جنگ امن اور انسانیت کی جنگ ہوگئی تھی لیکن میں اس خیال سے مطابقت پیدا نہ کرسکا اور فیض کی یہ فوجی ملازمت مجھے کچھ اچھی نہیں معلوم ہوئی لیکن پھر ان خیالات سے اپنے آپ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ انسان مجبور ہوتا ہے۔ جنگ نے حالات خراب کر دیئے ہیں معاشی اور اقتصادی نظام درہم برہم ہوگیا ہے۔ گرانی بڑھ گئی ہے، جینا دوبھر ہوگیا ہے۔ زیست دشوار ہے۔ یونیورسٹی اور کالج کی ملازمت میں کیا ملتا ہے۔ حالات نے فیض کو مجبور کر دیا ہوگا۔

اسی زمانے میں مجاز نے ریڈیو کے ایک مشاعرے میں اپنی وہ نظم پڑھی جس کا مصرعہ تھا

کرنل نہیں ہوں خان بہادر نہیں ہوں میں

اور جس کی وجہ سے عرصہ تک ریڈیو میں ان کا داخلہ بند رہا۔ دراصل اس میں فیض کی اس ملازمت ہی کی طرف اشارہ تھا اور مجاز کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی۔ چنانچہ انھوں نے نہ صرف کسی عام مشاعرے میں بلکہ ریڈیو کے مشاعرے میں یہ نظم پڑھی اور اس پر خاصے عرصہ تک ہنگامہ ہوتا رہا۔

فیض کئی سال دلی میں رہے۔ اسی زمانے میرا تقرر بھی اردو کے لیکچرار کی حیثیت سے اینگلو عربک کالج دہلی میں ہوگیا۔ دلی کے ادیبوں اور شاعروں کے علاوہ اس زمانے میں لاہور کے بھی بہت سے ادیب اور شاعر دلی میں قیام پذیر تھے۔ بخاری صاحب (پطرس) تاثیر، حامد علی خاں، حمید احمد خاں، حفیظ، فیض، راشد، میراجی، مختار صدیقی، اعجاز بٹالوی، ضیا جالندھری، اتفاق سے یہ سب لوگ اس وقت بہ سلسلہ ملازمت دلی میں جمع تھے اور ان کی وجہ سے جدید ادب کا خاصا چرچا تھا۔ اس زمانے میں نوجوان ادیب حلقہ ارباب ذوق کے جلسوں میں ہر اتوار کو مل بیٹھتے تھے۔ شروع شروع میں یہ جلسے میں نے میراجی کی فرمائش پر اینگلو عربک کالج ہال کے اسٹیج پر ترتیب دیئے لیکن کچھ عرصہ بعد کالج کے ارباب اختیار کو اس پر کچھ اعتراض ہوا تو یہ جلسے کالج ہی میں میری جائے قیام پر ہونے لگے۔ راشد اور تاثیر تو ان جلسوں میں آتے تھے لیکن فیض ان جلسوں میں کبھی شریک نہ ہوئے۔ غالباً اس کی وجہ ان کی سرکاری مصروفیت تھی لیکن اس زمانے میں بخاری صاحب اور تاثیر صاحب نے بھی ایک حلقہ احباب قائم کر رکھا تھا اس کے جلسے بھی کبھی کبھی بخاری صاحب یا تاثیر صاحب کے مکان پر یا پالی ٹیکنک وغیرہ میں ہوتے تھے۔ تاثیر صاحب مجھے اکثر ان جلسوں میں شریک کرتے تھے۔ یہاں کبھی کبھی فیض بھی آتے تھے اور دلی میں انہیں جلسوں میں ان سے ملاقاتیں ہوئیں لیکن ان جلسوں میں بھی میں نے یہی دیکھا کہ فیض بولتے بہت کم ہیں۔ بخاری صاحب اور تاثیر صاحب تو باغ و بہار قسم کے لوگ تھے اور اپنی باتوں سے گل وگلزار کھلاتے تھے لیکن فیض نے ان جلسوں میں بھی کبھی دو ایک جملوں سے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ ان کی اس کم سخنی ہی نے مجھے ان سے دور رکھا اور میں بھی اس زمانے میں ان سے کھل کر باتیں نہ کرسکا۔ تاثیر صاحب سے مجھ سے خاصی بے تکلفی تھی اور وہ گھنٹوں مجھ سے مختلف موضوعات پر باتیں کرتے تھے۔ کبھی کبھی میں ان کے دفتر میں اولڈ سکریٹریٹ بھی چلا جاتا تھا اور وہ سرکاری کام کو چھوڑ کر ادبی باتیں شروع کر دیتے تھے لیکن فیض کے ساتھ کبھی ایسا اتفاق نہیں ہوا۔ ان کی کم سخنی ہمیشہ ہمارے درمیان حائل رہی۔ میرے مزاج کی بھی یہ کیفیت ہے کہ ذرا مشکل سے کھلتا ہوں چنانچہ اسی مزاج نے مجھے اس زمانے میں فیض کے ساتھ بے تکلف نہیں ہونے دیا۔ ان سے ملنے اور بے تکلفی کے ساتھ باتیں کرنے کی آرزو ہمیشہ دل میں رہی لیکن اس آرزو کی تکمیل سے ہمکنار ہونے کا موقع ذرا کم ہی ملا۔

چند سال اسی طرح گزرے۔ اس زمانے میں پاکستان کی تحریک اپنے شباب پر تھی اور قیام پاکستان سے بہت پہلے لوگوں کو اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ دنیا کی کوئی طاقت پاکستان کے قیام میں راہ کا روڑا نہیں بن سکتی۔ چنانچہ بصیرت رکھنے والے لوگوں نے اسی زمانے میں پاکستان کے لئے مختلف قسم کی تیاریاں شروع کر دی

(بقیہ صفحہ نمبر 43 پر)

لکھنؤ کی ایک رات - فیض کے ساتھ

سردار جعفری

دیکھا آکر کوچہ چاک گریباں کی بہار

وہ رات بڑی طوفانی تھی۔ دسمبر ۱۹۴۱ء کا مہینہ تھا اور سرد ہوا کا جھکڑ چل رہا تھا۔ قندھاری لین میں ہمارے گھر کے سامنے کھڑا ہوا املی کا پرانا تناور درخت کسی عظیم اور قد آور دیو کی طرح جھوم رہا تھا۔ اس کی شاخیں ایک دوسرے سے ٹکراتی تھیں اور سائیں سائیں کی مسلسل آوازوں کے ساتھ بے شمار چھوٹی چھوٹی پتیاں برسنے لگتی تھیں۔ ہوا ہزاروں پروں سے پرواز کر رہی تھی۔ سڑکوں کی بجلی کی بعض روشنیاں جو کھمبوں کے بجائے تاروں سے لگی ہوئی تھیں، لمبی لمبی پینگیں لے رہی تھیں اور سائے دیوانہ وار ناچ رہے تھے۔ خود ہمارے سائے بھی کبھی پیچھے اور کبھی آگے آکر ناچنے لگتے۔ رات اپنے شباب پر تھی اور ہمارے دلوں میں ایک احساس فتح مندی تھا۔ ہم آل انڈیا ریڈیو سے نووارد شعراء کا مشاعرہ پڑھ کر واپس آرہے تھے۔

نووارد شعراء کا مشاعرہ منتظم تھے آل انڈیا ریڈیو لکھنؤ کے اسٹیشن ڈائرکٹر سمناتھ چب معشوق عاشق پیشہ، صدارت کے فرائض شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی نے انجام دیئے۔ آج خود ان کے نظم سنانے کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ وہ نوعمر ترقی پسند شاعروں کا کلام سننے آئے تھے۔ وجیہہ اور سرخ وسپید رنگ، دل نواز اور معصوم تبسم، آنکھوں میں شفقت، محبت اور غرور، باقی سارے انداز میں ایک باوقار رندی ؎

جوش کی بحث صدارت میں پس وپیش نہ کر
جوش تو قبلۂ رندانِ جہاں ہے ساقی

مشاعرہ سننے والے لکھنؤ کے صاحبان ذوق، وہ نئی شاعری کے پرستار تھے اور وہ بھی جن کے ماتھے پر بل پڑے رہتے تھے، آج وہ بھی دیکھنے آئے تھے کہ نووارد شعراء پر کیا بیتتی ہے۔ انہیں کے ہجوم میں سجاد ظہیر، ترقی پسند تحریک کے بانی اور میر کارواں، ابھی نوعمر ہیں۔ انگلستان سے تعلیم ختم کرکے واپس آئے ہیں۔ جیل میں رہ چکے ہیں۔ بیماری کی وجہ سے رہا کر دیئے گئے ہیں لیکن چہرے پر طالب علمی کی معصومیت باقی ہے۔ بھاری بھر کم جسم ہے، بہت نازک ہاتھ ہیں۔ شخصیت میں مٹھاس ہے، رضیہ ان کی بیوی ہیں، گندمی رنگ، چھریرا جسم، الہ آباد یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا ہے۔ مایا سرکار میلا ودیالے میں انگریزی پڑھاتی ہیں، بنگالی ہیں، لیکن لکھنؤ کی نفیس اردو بولتی ہیں۔

پروفیسر ڈی پی مکرجی بنگالی زبان کے مستند ادیب اور نقاد، موسیقی کے پرستار، شعروشاعری کے دلدادہ، انتہائی ترقی پسند لکھنؤ یونیورسٹی میں معاشیات اور سماجیات کی تعلیم دیتے ہیں۔ بولتے ہیں تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔ نفیس بنگالی دھوتی اور کرتا پہن رکھا ہے۔ کندھوں پر ایک کشمیری شال ہے، ہونہار طالب علموں کی تلاش میں رہتے ہیں اور انہیں اپنے گھر پر بلا کر چائے پلاتے ہیں۔ اپنی باتوں سے محظوظ کرتے ہیں اور کتابیں پڑھنے کے لئے دیتے ہیں۔ اردو کم سمجھتے ہیں لیکن بلا کی ذہانت ہے۔ اچھے اور برے شعر میں تمیز کر لیتے ہیں، انہیں خوشی ہے کہ نووارد شعراء میں ان کی یونیورسٹی کا ایک طالب علم بھی ہے۔ احمد علی، جو ابھی ابھی انگلستان سے واپس آئے ہیں، اردو میں چند افسانے لکھے ہیں اور انگریزی میں ایک ناول جس پر فاسٹر کا دیباچہ ہے۔ بڑے ادیب سمجھے جاتے ہیں۔

گوہر سلطان جس کے گلے کی دھوم ہے۔ حیات اللہ انصاری، اردو کے مشہور افسانہ نگار اور ہندوستان، ہفتہ وار کے ایڈیٹر، نئے شاعروں کے طرفدار لیکن ناقدانہ انداز لئے ہوئے۔ انور جمال قدوائی اپنے مخصوص بہکے ہوئے انداز کے ساتھ سیاست میں عملی دلچسپی نہیں لیتے، ادب کی تخلیق نہیں کرتے لیکن نظریاتی اور جذباتی طور سے دونوں کے معاملے میں انتہائی انقلابی۔ اور سبط حسن، سر سے پاؤں تک عشق کا مجسمہ کسی افسانوی سرزمین کے شہزادے کی طرح جو جادو کے محلوں اور بارہ دریوں سے سوئی ہوئی شہزادیوں کو جگا لاتے ہیں۔ حسین چہرہ، جامہ زیب جسم، نفیس ترشے ہوئے ہونٹ، بڑی بڑی بے قرار آنکھیں اور نہایت مہذب اور سلجھی ہوئی زبان۔ شاعر ان کے دوست نہیں درباری ہیں۔

ان سب کے علاوہ یونیورسٹی کے اور بھی اساتذہ اور طالب علم اور لکھنؤ کے قدیم اساتذہ جامعہ کی شیروانیاں پہن کر آئے ہیں اور دوزانو بیٹھے ہیں۔ اس سے پہلے اردو ادب کی تاریخ میں کبھی بزرگ اور معمر شعراء نوعمر شاعروں کا کلام سننے نہیں آئے تھے۔

سب ہمہ تن انتظار ہیں کہ نووارد شعراء سمناتھ چب کے ساتھ اندر داخل ہوتے ہیں۔ یہ اس عہد کے باغی ہیں، سر پھرے عیش ونشاط کے دلدادہ مگر کفن بردوش۔ یہ ابھی عظیم نہیں ہیں، لیکن ان کے نام افسانے بن چکے ہیں۔ اردو شعروادب کے نئے دھارے اب ان کے نام پر بہیں گے۔ یہ نیا جذبہ، نیا احساس، نئی زبان لے کر آئے ہیں۔ ماضی کا سارا ورثہ ان کے پاس ہے، جدید تعلیم کی اعلیٰ ترین ڈگریاں ان کے پاس ہیں۔ اس لئے قدیم اور جدید کا امتزاج ان کے یہاں خود بخود پیدا ہوگیا ہے۔ یہ پرانے ہیروں کو نئی طرح تراش رہے ہیں، ہجرووصال کی داستانیں ان کو آتی ہیں، محبوب کے وعدۂ فردا کی لذت سے واقف ہیں۔ لیکن ہندوستان کی آزادی ان کی سب

سے بڑی محبوبہ ہے اور اس محبوبہ کے سامنے نئی شاعری پر اعتراض کرنے والوں کی گردن بھی جھک جاتی ہے۔ نوادر شعراء کی طرف بے شمار نگاہیں اٹھتی ہیں۔ نگاہیں جن میں محبت کی گرمی ہے۔ نگاہیں جن میں سرد مہری ہے۔ عاشقانہ نگاہیں، رقیبانہ نگاہیں لیکن ہر نگاہ میں ایک سوال ہے۔

کون کون ہے؟

یہ مجاز ہے۔ خوش پوش مگر چاک گریباں، آنکھوں کی گہری اداسی میں شوخی کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔ اس کے باریک ہونٹوں کی نرم مگر شریر مسکراہٹ کو لکھنؤ میں کون نہیں جانتا۔ اس کے گلے اور شعر میں بقول فیض کے مغنی کے نغمت کا وفور ہے۔ جوش نے اس کی شخصیت کو ایک فقرے میں سمیٹ لیا ہے "وہ ایک نگاہ میں دنیا کے سارے حسن کو اور ایک گھونٹ میں دنیا کی ساری شراب کو پی جانا چاہتا ہے۔"

اس محفل کیف و مستی میں اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

اور یہ فیض احمد فیض ہے۔ لاہور کے گلی کوچوں کی تخلیق، چہرے کی مسکراہٹ اداس ہے لیکن آنکھیں نرم اور محبت بھرتی آواز میں ہلکا سا گداز اور شعروں میں دل کی دھیمی دھیمی آنچ جو لفظوں کے سنگیت کو پگھلا کر رنگ بنا دیتی ہے اور ہر مصرع ایک پینٹنگ بن جاتا ہے۔ ایک حسین و جمیل تصویر جو دل میں آویزاں ہو جاتی ہے۔ تشبیہیں اور استعارے نرم رو شعروں کے اندر بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں، مگر یہ وہ بجلیاں ہیں جو صرف فیض ننھے ننھے شراروں سے بنا سکتا ہے۔

دل کے ایوانوں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نور خورشید سے سہمے ہوئے، اکتائے ہوئے
حسن محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

اور یہ جذبی ہے۔ سب سے بے نیاز اور سب سے الجھتا ہوا۔ حساس چہرے پر عمر بھر کے مصائب اور مفلسی کی تلخی، آنکھوں میں محبت کی بے پناہ بھوک اور حسین ترنم میں ایک دل دوز کیفیت جس کو اس کی آواز کی رچی ہوئی سرشاری بھی نہیں چھپا سکتی۔ کسی کا احسان اٹھانے کو تیار نہیں ہے۔ زندگی کو بھی دھتکارتا ہے اور موت کو بھی۔

نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں
یہ نام ہوگا غم روزگار سہہ نہ سکا

اور یہ مخدوم محی الدین ہے۔ حیدر آباد کا انقلابی۔ سنگ اسود سے تراشا ہوا۔ آبنوسی چہرہ، بلند پیشانی، شگفتہ آنکھیں، مسکراہٹ میں گرم جوشی اور باتوں میں بے انتہا یقین اور اعتماد۔ ترنم بے پناہ ہے، جس میں صرف نشاط ہی نشاط ہے۔ انقلاب اور رومان کے دوراہے پر کھڑا ہوا انتظار کر رہا ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ یہ دکن کی کسی سانولی سلونی محبوبہ کا انتظار کر رہا ہے یا ہندوستان کی آزادی کا۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

پتیاں کھڑکیں تو میں سمجھا کہ آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو وہ پا ہی گئے
آ گئی تھی دل مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانہ میں شہنائی سی

اور یہ جاں نثار اختر ہے، نوادر شعراء کے ہجوم میں تنہا جسے شاعری اپنے والد مضطر خیر آبادی سے ورثہ میں ملی ہے۔ اپنے آپ سے الجھا ہوا، خود ہی سنجیدہ ہو جاتا ہے اور خود ہی مسکراتا ہے۔

آسماں جیسے جلے لاشے کی دھول
چاند جیسے ایک بے امت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اور یہ سردار جعفری ہے۔ کرشن چندر کا یہ کہنا ہے کہ "اس کے چہرے پر جیسے ہتھوڑے کا نشان ہے۔" پروفیسر محمد مجیب کی رائے ہے کہ وہ رنگین تصویریں نہیں بناتا، بلکہ پتھروں سے بت تراشتا ہے۔

سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے
وہ زیر افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانی افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

نوادر شعراء کے اس مشاعرے میں ن۔م۔ راشد کے بھی آنے کی خبر تھی جس کے سر اردو شاعری میں آزاد نظم کا سہرا ہے، پطرس کے نزدیک وہ ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان راشد کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جب ہم آدھی رات کو گھر واپس پہونچے تو آندھی اور طوفان کا زور کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ سردی بھی بلا کی تھی۔

گھر میں فرنیچر کے نام پر ایک میز، بید کی چند کرسیاں اور موجح کے تین پلنگ تھے۔ انہیں کنارے سرکا کر زمین پر چٹائیوں کا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اس کے اوپر کارنس تھی اور کارنس کے اوپر دیوار پر اسپین کی ایک مجاہد خاتون کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، سینہ ابھرا ہوا تھا جس کی دوشیزگی کو فوجی لباس بھی نہیں چھپا سکتا تھا۔ چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور ہونٹ شدت جذبات سے اینٹھے ہوئے تھے اور تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا To Death دو اونچی بالٹیوں پر جلتی ہوئی موم بتیوں کی روشنی میں وہ تصویر اور بھی زیادہ پر حوصلہ اور دل آویز معلوم ہو رہی تھی۔ کارنس کا سایہ تصویر کے ابھرے ہوئے سینے تک پہونچا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پر جوش شکل موت کے اندھیرے سے زندگی کا پیغام لے کر ابھر رہی ہے۔ ایک طرح وہ تصویر ہمارے رومانی اور انقلابی جذبات کی ترجمان تھی۔ ہم بھی موت سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے۔ اسپین ہمیں اپنا ملک معلوم ہوتا

تھا یعنی کہ وہ فاشزم کے خلاف آزادی اور انسانیت کے حسین خوابوں کے لئے لڑ رہا تھا۔ اسپین کی آزادی اپنی آزادی تھی، اور وہ مجاہد خاتون آج کی رات ہماری محفل میں شریک تھی، اور ہندوستان کی آزادی کے متوالوں کا حوصلہ بڑھا رہی تھی ۔

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ مانیست

کمرے میں سکون تھا۔ آگ اور دلوں کی حرارت تھی۔ کبھی کبھی باہر چلنے والی طوفانی ہوائیں اپنے ہزاروں ہاتھوں سے ہمارے دلوں کو جھنجھوڑ دیتی تھی اور کھڑکھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ بالٹیوں پر جلتی ہوئی موم بتیوں کی لوئیں تھرتھرا جاتی تھیں۔ ہم بالٹیوں کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے تھے اور جلتی ہوئی موم بتیوں کی نرم روشنی میں ایک دوسرے کے جذبات اور محبت سے بھرے چہروں کو دیکھ رہے تھے۔ جوش ملیح آبادی زیادہ دیر تک قبلہ رندان جہاں کے فرائض انجام نہ دے سکے۔ رات کے جاگنے کے معاملہ میں وہ ہمیشہ کچے ہیں۔ اس لئے جب جماہیوں نے انہیں زیادہ ستایا تو وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہو گئے کہ رات کو جاگنا الو کی خاصیت ہے۔

محفل کی گرمی بڑھتی گئی۔ دلوں کا سرور بڑھتا گیا، چہرے زیادہ روشن ہوتے گئے۔ اب یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ یہ شاعری کا دور ہے یا جاموں کی گردش۔ سب ہم عصر تھے، سب نوادر تھے، سب ایک حلقے میں بیٹھے تھے، سب کا الگ الگ انداز تھا۔ انفرادیت پہچانی جاتی تھی۔ کسی قسم کے رشک، حسد یا معاصرانہ چشمک کا پتہ نہیں تھا۔ ایک دوسرے کی تعریفیں اس طرح ہو رہی تھیں جیسے عاشق معشوق سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

فیض نے کہا۔ ”بھئی لاہور میں ایک بہت اچھا شعر سنا تھا، معلوم نہیں کس کا ہے ۔

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جذبی کا اداس چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ یہ جذبی کا شعر تھا جو اس سے پہلے لاہور پہونچ کر مشہور ہو چکا تھا۔ فیض اور جذبی گلے ملے۔

ابھی فیض کو بیٹھنے کی مہلت نہیں ملی کہ جذبی نے بغیر کسی تمہید کے فیض کی نظم ”موضوع سخن“ کو اپنے بے پناہ اور انتہائی دلنواز ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا، جو ہم نے چند ماہ قبل ”نیا ادب“ میں شائع کی تھی ۔

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترستے ہوئے ہات

باہر ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں، اور اندر جذبی کا ترنم طوفان برپا کر رہا تھا۔ فیض کے چہرے پر ایک معصوم اور تشکر آمیز مسکراہٹ تھی۔ ایک شاعر کے لئے اس سے بہتر داد اور کیا ہو سکتی تھی۔

جذبی نے پہلا بند پڑھا تھا کہ مجاز نے دوسرا بند اٹھا لیا اور اپنا راگ چھیڑ دیا

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

اب دونوں نے باری باری ایک ایک بند گا کر نظم مکمل کی۔

جذبی کے ترنم کا تار ٹوٹنے نہیں پایا تھا کہ مخدوم کا راگ بلند ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دیوان حافظ تھا جس کی ایک غزل وہ گنگنا رہا تھا ۔

شاہ شمشاد قداں ، خسرو شیریں دہناں
کہ بہ مژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں
بر جہاں تکیہ مکن گر قدحے می داری
شادیٔ زہرہ جبیناں خورد نازک بدناں

اس غزل نے محفل کو اور ہی رنگ دے دیا۔ زہرہ جبینوں اور نازک بدنوں کے نام کا جام کون نہیں پینا چاہے گا اور اب مخدوم کی آواز تنہا نہیں تھی۔ سریلی اور بے سری سب آوازیں مل گئیں۔ حافظ کی غزل کا کورس دیر تک جاری رہا۔ دیوار پر اسپین کی مجاہد خاتون موت کی دعوت دیتی رہی۔ باہر ہوائیں دیوانہ وار دروازے کو کھٹکھٹاتی رہیں مگر ہم لوگ سب سے بے نیاز حافظ شیرازی کے لفظوں میں حسینوں کے جام صحت پیتے رہے۔ نہ جانے کس کے دل میں کون سا حسین جھانک رہا تھا۔

یہ طوفان تھما ہی تھا کہ جذبی پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اب ناچ ناچ کر ”موضوع سخن“ کو گانے لگا ۔

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلیں ہاتھوں پہ دھندلی سی حنا کی تحریر

اس کی آواز میں خستگی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے اور بھی دل دوز ہو گئی تھی۔ اب وہ ایک ایک لفظ کو اتنا کھینچ کر گاتا تھا کہ سانس کا تار ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔

ہم نے بہ مشکل اسے بٹھایا لیکن وہ تڑپ کر پھر کھڑا ہو گیا۔ فیض کی ”موضوع سخن“ پھر محفل پر چھا گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جذبی کی آواز نے ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر بھی وہ نظم سنانے پر اصرار کر رہا تھا۔

اب تک فیض کی ایک ہی نظم اور وہ بھی جذبی کی زبان سے اتنی بار سنی جا چکی تھی کہ سب لوگ تھک گئے تھے، اس لئے کسی نے خیال کو دوسری طرف موڑنے کے لئے جذبی سے اس کی نئی نظم ”موت“ کی فرمائش کر دی اور جذبی کی ٹوٹی ہوئی آواز اور تھکے ہوئے ترنم نے اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ۔

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جام مے تند چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

(بقیہ صفحہ نمبر 35 پر)

سے بڑی مجوبہ ہے اور اس مجوبہ کے سامنے نئی شاعری پر اعتراض کرنے والوں کی گردن بھی جھک جاتی ہے۔ نووارد شعراء کی طرف بے شمار نگاہیں اٹھتی ہیں۔ نگاہیں جن میں محبت کی گرمی ہے۔ نگاہیں جن میں سرد مہری ہے۔ عاشقانہ نگاہیں، رقیبانہ نگاہیں لیکن ہر نگاہ میں ایک سوال ہے۔

کون کون ہے؟

یہ مجاز ہے۔ خوش پوش مگر چاک گریباں، آنکھوں کی گہری اداسی میں شوخی کی بجلیاں چمک رہی ہیں۔ اس کے باریک ہونٹوں کی نرم مگر شریر مسکراہٹ کو لکھنؤ میں کون نہیں جانتا۔ اس کے گلے اور شعر میں بقول فیض کے مغنی کے نغمت کا وفور ہے۔ جوش نے اس کی شخصیت کو ایک فقرے میں سمیٹ لیا ہے "وہ ایک نگاہ میں دنیا کے سارے حسن کو اور ایک گھونٹ میں دنیا کی ساری شراب کو پی جانا چاہتا ہے۔"

اس محفل کیف و مستی میں اس انجمن عرفانی میں
سب جام بکف بیٹھے ہی رہے ہم پی بھی گئے چھلکا بھی گئے

اور یہ فیض احمد فیض ہے۔ لاہور کے گلی کوچوں کی تخلیق۔ چہرے کی مسکراہٹ اداس ہے لیکن آنکھیں نرم اور محبت بھرتی آواز میں بلا سا گداز اور شعروں میں دل کی دھیمی دھیمی آنچ جو لفظوں کے سنگیت کو پگھلا کر رنگ بنا دیتی ہے اور ہر مصرع ایک پینٹنگ بن جاتا ہے۔ ایک حسین و جمیل تصویر جو دل میں آویزاں ہو جاتی ہے۔ تشبیہیں اور استعارے نرم رو شعروں کے اندر بجلیوں کی طرح کوندتے ہیں اور آنکھیں چکا چوند ہو جاتی ہیں، مگر یہ وہ بجلیاں ہیں جو صرف فیض ننھے ننھے شراروں سے بنا سکتا ہے۔

دل کے ایوانوں میں لئے گل شدہ شمعوں کی قطار
نور خورشید سے سہمے ہوئے، اکتائے ہوئے
حسن محبوب کے سیال تصور کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے لپٹائے ہوئے

اور یہ جذبی ہے۔ سب سے بے نیاز اور سب سے الجھتا ہوا۔ حساس چہرے پر عمر بھر کے مصائب اور مفلسی کی تلخی، آنکھوں میں محبت کی بے پناہ بھوک اور حسین ترنم میں ایک دل دوز کیفیت جس کو اس کی آواز کی رچی ہوئی سرشاری بھی نہیں چھپا سکتی۔ کسی کا احسان اٹھانے کو تیار نہیں ہے۔ زندگی کو بھی دھتکارتا ہے اور موت کو بھی۔

نہ آئے موت خدایا تباہ حالی میں
یہ نام ہوگا غم روزگار سہہ نہ سکا

اور یہ مخدوم محی الدین ہے۔ حیدرآباد کا انقلابی۔ سنگ اسود سے تراشا ہوا۔ آبنوسی چہرہ، بلند پیشانی، شگفتہ آنکھیں، مسکراہٹ میں گرم جوشی اور باتوں میں بے انتہا یقین اور اعتماد۔ ترنم بے پناہ ہے، جس میں صرف نشاط ہی نشاط ہے۔ انقلاب اور رومان کے دوراہے پر کھڑا ہوا انتظار کر رہا ہے۔ کہنا مشکل ہے کہ یہ دکن کی کسی سانولی سلونی محبوبہ کا انتظار کر رہا ہے یا ہندوستان کی آزادی کا۔

رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے
سانس کی طرح سے آپ آتے رہے جاتے رہے

پتیاں کھڑکیں تو میں سمجھا کہ آپ آ ہی گئے
سجدے مسرور کہ مسجود کو وہ پا ہی گئے
آ گئی تھی دل مضطر میں شکیبائی سی
بج رہی تھی مرے غم خانہ میں شہنائی سی

اور یہ جاں نثار اختر ہے، نووارد شعراء کے ہجوم میں تنہا جسے شاعری اپنے والد مضطر خیر آبادی سے ورثہ میں ملی ہے۔ اپنے آپ سے الجھا ہوا، خود ہی سنجیدہ ہو جاتا ہے اور خود ہی مسکراتا ہے۔

آسماں جیسے جلے لاشے کی دھول
چاند جیسے ایک بے امت رسول
دوست سب کچھ بھول جانے دے مجھے

اور یہ سردار جعفری ہے۔ کرشن چندر کا یہ کہنا ہے کہ "اس کے چہرے پر نصفے ہتھوڑے کا نشان ہے۔" پروفیسر محمد مجیب کی رائے ہے کہ وہ رنگین تصویریں نہیں بناتا، بلکہ پتھروں سے بت تراشتا ہے۔

سرمائے کے سمٹے ہوئے ہونٹوں کا تبسم
مزدور کے چہرے کی تھکن ہے کہ نہیں ہے
وہ زیر افق صبح کی ہلکی سی سپیدی
ڈھلتے ہوئے تاروں کا کفن ہے کہ نہیں ہے
پیشانیٔ افلاس سے جو پھوٹ رہی ہے
اٹھتے ہوئے سورج کی کرن ہے کہ نہیں ہے

نووارد شعراء کے اس مشاعرے میں ن۔ م۔ راشد کے بھی آنے کی خبر تھی جس کے سر اردو شاعری میں آزاد نظم کا سہرا ہے، پطرس کے نزدیک وہ ایشیا کا سب سے بڑا شاعر ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اردو زبان راشد کو کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

مشاعرہ ختم ہونے کے بعد جب ہم آدھی رات کو گھر واپس پہونچے تو آندھی اور طوفان کا زور کچھ اور بڑھ گیا تھا۔ سردی بھی بلا کی تھی۔

گھر میں فرنیچر کے نام پر ایک میز، بید کی چند کرسیاں اور موج کے تین پلنگ تھے۔ انہیں کنارے سرکا کر زمین پر چٹائیوں کا فرش بچھا دیا گیا تھا۔ آتش دان میں آگ جل رہی تھی۔ اس کے اوپر کارنس تھی اور کارنس کے اوپر دیوار پر اسپین کی ایک مجاہد خاتون کی بڑی سی تصویر لگی تھی۔ اس کی مٹھیاں بھنچی ہوئی تھیں، سینہ ابھرا ہوا تھا جس کی دوشیزگی کو فوجی لباس بھی نہیں چھپا سکتا تھا۔ چہرہ آسمان کی طرف اٹھا ہوا تھا اور ہونٹ شدت جذبات سے اینٹھے ہوئے تھے اور تصویر کے نیچے لکھا ہوا تھا To Death دو اوندھی بالٹیوں پر جلتی ہوئی موم بتیوں کی روشنی میں وہ تصویر اور بھی زیادہ پر حوصلہ اور دل آویز معلوم ہو رہی تھی۔ کارنس کا سایہ تصویر کے ابھرے ہوئے سینے تک پہونچتا تھا اور ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے یہ پر جوش شکل موت کے اندھیرے سے زندگی کا پیغام لے کر ابھر رہی ہے۔ ایک طرح وہ تصویر ہمارے رومانی اور انقلابی جذبات کی ترجمان تھی۔ ہم بھی موت سے نبرد آزما ہونا چاہتے تھے۔ اسپین ہمیں اپنا ملک معلوم ہوتا

تھا یوں کہ وہ فاشزم کے خلاف آزادی اور انسانیت کے حسین خوابوں کے لئے لڑ رہا تھا۔ اسپین کی آزادی اپنی آزادی تھی، اور وہ مجاہد خاتون آج کی رات ہماری محفل میں شریک تھی، اور ہندوستان کی آزادی کے متوالوں کا حوصلہ بڑھا رہی تھی ؎

کسے کہ کشتہ نہ شد از قبیلۂ ما نیست

کمرے میں سکون تھا۔ آگ اور دلوں کی حرارت تھی۔ کبھی کبھی باہر چلنے والی طوفانی ہوائیں اپنے ہزاروں ہاتھوں سے ہمارے دلوں کو جھنجھوڑ دیتی تھیں اور کھڑکھڑاہٹ کی آواز کے ساتھ بالٹیوں پر جلتی ہوئی موم بتیوں کی لوئیں تھرتھرا جاتی تھیں۔ ہم بالٹیوں کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے تھے اور جلتی ہوئی موم بتیوں کی نرم روشنی میں ایک دوسرے کے جذبات اور محبت سے بھرے چہروں کو دیکھ رہے تھے۔ جوش ملیح آبادی زیادہ دیر تک قبلہ رندانِ جہاں کے فرائض انجام نہ دے سکے۔ رات کے جاگنے کے معاملہ میں وہ ہمیشہ کچے ہیں۔ اس لئے جب جمائیوں نے انہیں زیادہ ستایا تو وہ یہ کہتے ہوئے رخصت ہوگئے کہ رات کو جاگنا الو کی خاصیت ہے۔

محفل کی گرمی بڑھتی گئی۔ دلوں کا سرور بڑھتا گیا، چہرے زیادہ روشن ہوتے گئے۔ اب یہ فرق کرنا مشکل تھا کہ یہ شاعری کا دور ہے یا جاموں کی گردش۔ سب ہم عصر تھے، سب نووارد تھے، سب ایک حلقے میں بیٹھے تھے، سب کا الگ الگ انداز تھا۔ انفرادیت پہچانی جاتی تھی۔ کسی قسم کے رشک، حسد یا معاصرانہ چشمک کا پتہ نہیں تھا۔ ایک دوسرے کی تعریفیں اس طرح ہو رہی تھیں جیسے عاشق معشوق سرگوشیاں کر رہے ہوں۔

فیض نے کہا: "بھئی لاہور میں ایک بہت اچھا شعر سنا تھا، معلوم نہیں کس کا ہے ؎

جب کشتی ثابت و سالم تھی ساحل کی تمنا کس کو تھی
اب ایسی شکستہ کشتی پر ساحل کی تمنا کون کرے

جذبی کا اداس چہرہ پھول کی طرح کھل گیا۔ یہ جذبی کا شعر تھا جو اس سے پہلے لاہور پہونچ کر مشہور ہو چکا تھا۔ فیض اور جذبی گلے ملے۔

ابھی فیض کو بیٹھنے کی مہلت نہیں ملی کہ جذبی نے بغیر کسی تمہید کے فیض کی نظم "موضوع سخن" کو اپنے بے پناہ اور انتہائی دلنواز ترنم کے ساتھ پڑھنا شروع کر دیا، جو ہم نے چند ماہ قبل "نیا ادب" میں شائع کی تھی ؎

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مس ہونگے یہ ترستے ہوئے ہات

باہر ہوائیں چنگھاڑ رہی تھیں، اور اندر جذبی کا ترنم طوفان برپا کر رہا تھا۔ فیض کے چہرے پر ایک معصوم اور تشکر آمیز مسکراہٹ تھی۔ ایک شاعر کے لئے اس سے بہتر داد اور کیا ہو سکتی تھی۔

جذبی نے پہلا بند پڑھا تھا کہ مجاز نے دوسرا بند اٹھا لیا اور اپنا راگ چھیڑ دیا

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

اب دونوں نے باری باری ایک ایک بند گا کر نظم مکمل کی۔

جذبی کے ترنم کا تار ٹوٹنے نہیں پایا تھا کہ مخدوم کا راگ بلند ہوا۔ اس کے ہاتھ میں دیوان حافظ تھا جس کی ایک غزل وہ گنگنا رہا تھا ؎

شاہ شمشاد قداں، خسرو شیریں دہناں
کہ بہ مژگاں شکند قلب ہمہ صف شکناں
بر جہاں تکیہ مکن گر قدحے می داری
شادیٔ زہرہ جبیناں خورد نازک بدناں

اس غزل نے محفل کو اور ہی رنگ دے دیا۔ زہرہ جبینوں اور نازک بدنوں کے نام کا جام کون نہیں پینا چاہے گا اور اب مخدوم کی آواز تنہا نہیں تھی۔ سریلی اور بے سری سب آوازیں مل گئیں۔ حافظ کی غزل کا کورس دیر تک جاری رہا۔ دیوار پر اسپین کی مجاہد خاتون موت کی دعوت دیتی رہی۔ باہر ہوائیں دیوانہ وار دروازے کو کھٹکھٹاتی رہیں مگر ہم لوگ سب سے بے نیاز حافظ شیرازی کے لفظوں میں حسینوں کے جام صحت پیتے رہے۔ نہ جانے کس کے دل میں کون سا حسین جھانک رہا تھا۔

یہ طوفان تھما ہی تھا کہ جذبی پھر اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور اب ناچ ناچ کر "موضوع سخن" کو گانے لگا ؎

آج پھر حسن دل آرا کی وہی دھج ہوگی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلیں ہاتھوں پہ ہلکی سی حنا کی تحریر

اس کی آواز میں خنکی پیدا ہو گئی تھی۔ اس لئے اور بھی دل دوز ہو گئی تھی۔ اب وہ ایک ایک لفظ کو اتنا کھینچ کر گاتا تھا کہ سانس کا تار ٹوٹ ٹوٹ جاتا تھا۔

ہم نے بہ مشکل اسے بٹھایا لیکن وہ تڑپ کر پھر کھڑا ہو گیا۔ فیض کی "موضوع سخن" پھر محفل پر چھا گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جذبی کی آواز نے ساتھ چھوڑ دیا۔ پھر بھی وہ نظم سنانے پر اصرار کر رہا تھا۔

اب تک فیض کی ایک ہی نظم اور وہ بھی جذبی کی زبان سے اتنی بار سنی جا چکی تھی کہ سب لوگ تھک گئے تھے، اس لئے کسی نے خیال کو دوسری طرف موڑنے کے لئے جذبی سے اس کی نئی نظم "موت" کی فرمائش کر دی اور جذبی کی ٹوٹی ہوئی آواز اور تھکے ہوئے ترنم نے اس میں ایک عجیب کیفیت پیدا کر دی ؎

اپنی سوئی ہوئی دنیا کو جگا لوں تو چلوں
اپنے غم خانے میں اک دھوم مچا لوں تو چلوں
اور اک جام مے تند چڑھا لوں تو چلوں
ابھی چلتا ہوں ذرا ہوش میں آ لوں تو چلوں

(بقیہ صفحہ نمبر 35 پر)

فیض - شخصیت کی چند جھلکیاں

حمید اختر

فیض کے متعلق گفتگو کے دوران، ایک دفعہ ایک نامور مغنیہ نے مجھ سے کہا تھا کہ "میں فیض پر مرتی ہوں لیکن یہ فیصلہ نہیں کر سکتی کہ وہ میرے کیا لگتے ہیں، میں انہیں اپنا معشوق سمجھوں یا عاشق، باپ تصور کروں یا بیٹا یا شوہر، یہ فیصلہ کرنا میرے لئے مشکل ہے۔ بہر حال میں فیض کو اتنا چاہتی ہوں، اتنا چاہتی ہوں کہ تم اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔"

فیض کی شخصیت (بلکہ محبوبیت) پر اس سے بہتر تبصرہ شاید ممکن نہیں ہے۔ ان کی شاعری پر تبصرہ کرنا میرا کام نہیں ہے مگر میں اتنا ضرور کہہ سکتا ہوں کہ فیض کی زندگی اور شخصیت پیار اور محبت کی ہر معصوم شکل کا مجموعہ ہے۔ ہمارے ایک مرحوم دوست نے جن کا تقاضا ہمیشہ یہ ہوتا تھا کہ میں ہر شام فیض کو گھیر کر ان کے گھر لے جاؤں۔ ایک دفعہ بھری مجلس میں یہ اعلان کر کے پوری محفل کو حیرت میں ڈال دیا کہ فیض کا کلام ان کی سمجھ میں نہیں آتا مگر وہ فیض کے عاشق ہیں۔ یہ دوست زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے مگر یاروں کے یار تھے۔ فیض کو مرحوم کی یہی ادا پسند تھی یہی وجہ ہے کہ جب ایک دفعہ بیگم فیض نے ان کے گھر جانے سے محض اس لئے انکار کیا کہ ان کی نظر میں یہ دوست بڑے بور تھے تو فیض تلملا اٹھے۔ یہاں بوروں کے بارے میں موصوف کے اس مقدمے کا ذکر بھی بے جا نہ ہو گا کہ "کوئی بور ہرگز قابل برداشت نہیں ہے۔" ماسوا اس بور کے جو آپ کا دوست ہے۔

دوستی محبت اور خلوص کا یہی سرچشمہ اگر نامور فن کاروں، دانشوروں اور ان پڑھ لوگوں کی محبت کا مرکز ہے تو اس کی وجہ بڑی آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ فیض کے دوستوں میں اہل علم، کم علم بلکہ بے علم لوگ بھی بڑی کثیر تعداد میں شامل ہیں۔ وہ محکمے بھی جن کا کام ایسے لوگوں کی نگرانی کرنا ہے جو دوستوں اور ہمدردوں سے بھرے پڑے ہیں۔ ان کے دوستوں میں فلم آرٹسٹ، گانے والے، ادیب، شاعر، طلباء، سرکاری محکموں کے ملازم، فوج اور پولس بلکہ خفیہ پولس کے افسروں غرض کہ ہر طبقے اور ہر قسم کے لوگ شامل ہیں۔ کبھی کبھی تو یوں لگتا ہے جیسے لوگوں نے فیض کو پڑھا کم ہے، ان سے محبت زیادہ کی ہے۔ وہ بڑے شاعر ہیں۔ انھوں نے شعراء کی ایک پوری نسل کو متاثر کیا ہے اور جدید شاعری کو ایک نیا اسلوب دیا ہے لیکن بحیثیت انسان کے وہ اس شاعر سے بھی بڑے ہیں جس سے لوگ صرف اس کے کلام کے واسطے سے ملتے ہیں۔ وہ اگر شعر نہ کہتے تب بھی اتنے ہی بڑے آدمی ہوتے۔ دوستوں کی کمزوریوں کو نظر انداز کرنے میں ان کا ثانی مشکل ہی سے ملے گا۔

لوگوں کو دھوکہ دینے والے پیشہ وروں کے لئے صلائے عام ہے کہ وہ فیض کے پاس پہنچیں کیوں کہ وہ ان کو پہچان کر بھی دھوکہ کھا جائیں گے اور بعد میں معاف کر دیں گے لیکن اگر آپ ان کے پاس تمتماتا ہوا چہرہ اور کھولتا ہوا خون لے کر جائیں گے اور کسی بدطینت اور ذلیل دشمن کے مکروہ کارناموں کا ذکر کرنے کے بعد ہمدردی کے طالب ہوں گے تو آپ کو مایوسی ہوگی کیوں کہ آپ کی الم ناک داستان سن کر سب سے پہلے تو وہ سگریٹ کا ایک لمبا کش لگائیں گے پھر ایک لمبی سی ہوں کی آواز آئے گی اور اگر آپ اس کے بعد بھی اس بارے میں ان کی رائے معلوم کرنے پر مصر ہوں گے تو آپ کو "چلو چھوڑو" کے سوا کچھ سننے کو نہیں ملے گا۔

یہ بات نہیں ہے کہ فیض کو غصہ نہیں آتا۔ غصہ ان کو بھی دوسرے خاکی انسانوں کی طرح آتا ہے مگر غصہ ضبط کرنے میں انہیں جو کمال حاصل ہے وہ بہت کم لوگوں کی قسمت ہے۔ ہم نے بڑے بڑے بدباطنوں کی خباثتوں کا مظاہرہ بھی دیکھا ہے جنھوں نے فیض پر کیچڑ اچھالنے کی ہر ممکن کوشش کی مگر آخر میں منہ کی کھا گئے۔

تین برس پہلے جب ان پر دل کی بیماری کا حملہ ہوا تو اکثر دوستوں کا خیال تھا کہ یہ عارضہ اس غیر معمولی ضبط و تحمل کا نتیجہ ہے۔ ہو سکتا ہے یہ اندازہ صحیح ہو لیکن حساس آدمی کے لئے اپنے بارے میں غلط الزام سن کر خاموش رہنا بھی بڑا مشکل کام ہے۔ اور فیض یہ کام بڑی مدت سے کر رہے ہیں۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں بڑے سے بڑے محب وطن، دانشور اور محبوب ترین افراد بھی مفاد پرستوں، غرض مندوں اور کرائے کے ٹٹوؤں کے حملوں کا شکار ہو جاتے ہیں اور ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ ان کے مخالفوں میں طرح طرح کے لوگ شامل ہیں۔ مثلاً حال ہی میں ایک مشہور صحافی نے جو ابتداء ایک روزنامے کے مالک تھے، بعد ازاں ایک اخبار کے مدیر اعلیٰ ہوئے اور ان دنوں مختلف اخبارات میں ہفتہ وار کالم لکھنے پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس بات پر سخت غم و غصہ کا اظہار کیا تھا کہ فیض کو لندن اور ماسکو سے واپس آئے ہوئے کئی مہینے ہو گئے ہیں لیکن ان کے اعزاز میں ہونے والی دعوتوں کا سلسلہ رکنے ہی میں نہیں آتا۔ انھوں نے اس بات پر سخت تشویش ظاہر کی تھی کہ فیض کے اعزاز میں ایسی دعوتیں بھی ہو رہی ہیں جن میں کوئی نہ کوئی مغنیہ گا کر ان کا کلام سناتی ہے۔

ایسے بیمار لوگ ہر معاشرے میں موجود ہوتے ہیں مگر ہر معاشرہ ایسے لوگوں کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ شرفا کی پگڑیاں اچھالتے رہیں۔ ہمارے ہاں بدقسمتی سے سرکار دربار میں رسوخ حاصل کرنے کے لئے بھی لوگ فیض جیسوں کو تختہ مشق بنانا

شروع کر دیتے ہیں حالانکہ اگر یہ لوگ اس ضمن میں فیض سے مشورہ حاصل کریں اور ان سے صاف کہہ دیں کہ آپ کی ذات پر حملہ کرنے سے ہمیں ذاتی طور پر فائدہ پہنچ سکتا ہے تو فیض انہیں خود اپنے خلاف نظمیں اور مضامین لکھ دیا کریں لیکن جب یہ لوگ بے خبری میں حملہ کرتے ہیں تو اس کا دکھ فیض کو بھی ہوتا ہے۔ اس کا اظہار وہ بھلے ہی نہ کریں۔

دوستوں اور چاہنے والوں کی حد تک فیض بڑے خوش قسمت واقع ہوئے ہیں۔ ان کے دشمنوں کی صفیں بھی چاہنے والوں سے بھری پڑی ہیں۔ اس کی ایک وجہ دوستی کے تصورات کے سلسلے میں ان کی روایت پرستی ہے۔ وہ اپنے دوستوں کے لئے ہر ممکن قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ چند برس پہلے ان کے ایک پرانے دوست بے روزگار ہوئے تو فیض ان کے لئے کام مہیا کرنے کی فکر میں مدتوں غلطاں و پیچاں رہے۔ آخر میں جو کام ان کی کوششوں سے ملا وہ مشکل تھا چنانچہ ان کے بعض قریبی دوستوں نے اندیشہ ظاہر کیا کہ یہ کام آپ کے دوست کے بس کا نہیں ہے اور اگر وہ اپنے فرائض بخوبی انجام نہ دے سکے تو آپ کی پوزیشن خراب ہوگی۔

فیض نے حسب معمول سگریٹ کا ایک لمبا کش لگایا اور صرف یہ کہنے پر اکتفا کیا۔ "کوئی بات نہیں ہے بے چارے کو روٹی تو ملنے لگے گی، بعد میں دیکھ لیں گے کیا ہوتا ہے۔"

کسی وجہ سے یہ موقع ہاتھ سے نکل گیا تو فیض نے دو تین مہینے کی باقاعدہ جدوجہد کے بعد ان کے لئے ایک نیا ادارہ قائم کرایا اور یہ دوست کئی برس تک اس با تنخواہ ادارے کے ساتھ منسلک رہے۔ اس ڈرامے کا ڈراپ سین بڑا دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ یہ بزرگ پہلی آزمائش ہی میں لڑھک گئے اور فیض کے دشمنوں کی طرف سے شروع کی جانے والی ایک مہم میں باقاعدہ شامل ہو گئے۔ اس وجہ سے فیض کے اکثر دوست ان سے ناراض ہیں مگر حضرت فیض کے آج بھی ان سے ویسے ہی مراسم ہیں اس لئے انھوں نے "چلو چھوڑو کوئی بات نہیں۔" کہہ کر انھیں معاف کر دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آئندہ بھی جب یہ دوست فیض کی مدد طلب کریں گے انھیں مایوسی نہ ہوگی۔

انسان اتنی کمزور مخلوق ہے اور حالات نے اسے اس حد تک بے بس کر رکھا ہے کہ اسے معاف کئے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے لیکن معاف کرنے والا بھی انسان ہی ہو اور اسے اپنے آپ پر اتنا قابو ہو تو اس کے حوصلے کی داد دینی ہی پڑتی ہے۔ فیض تو ایک اتھاہ سمندر ہے جس کی گہرائی کا کوئی اندازہ نہیں ہے۔ ان کے پاس بیٹھ کر مجھے ہمیشہ سمندر کے قرب کا احساس ہوتا ہے بے پایاں وسعت اور کشادگی کا احساس ہوتا ہے۔ یہ سمندر تلاطم اور امواج سمندر نہیں ہے۔ اس کی سطح پر سکون اور ٹھہراؤ اور روشنی کے نمونے نشان ملتے ہیں۔ اس ناپید اکنار سمندر کی گہرائی میں کون سے اسرار پوشیدہ ہیں اس کا اندازہ کرنا بہت مشکل ہے۔

یہ بات بڑی عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ایسا شخص جسے درد سہنے اور اس کا بوجھ اٹھانے کا اس حد تک ملکہ حاصل ہے کہ اس کی پوری شاعری اس کے آہنگ میں ڈوبی ہوئی ہے بظاہر اس قدر پرسکون اور مطمئن نظر آتا ہے۔ فیض کو کسی سے جھگڑتے کبھی پر

ناراض ہوتے یا کسی کی مخالفت کرتے بہت کم لوگوں نے دیکھا ہوگا، اصل میں وہ چاہتے ہیں کہ دنیا کا ہر آدمی مطمئن و مسرور نظر آئے۔ اس کوشش میں وہ اکثر اپنا سکون بھی برباد کر لیتے ہیں۔ لندن سے واپس آئے ہوئے انھیں بمشکل چار چھ ماہ ہوئے ہیں مگر ان کے شناسا اور شناساؤں کے جاننے اور ان سے واقفیت رکھنے والے اکثر اصحاب جن میں ہر قسم اور ہر طبقے کے لوگ شامل ہیں ان کے پاس روزگار اور کام حاصل کرنے کے لئے پہنچ رہے ہیں اور فیض کے دوستوں کو اس بات کا بخوبی علم ہے کہ کیسے کیسے لوگ اس عرصے میں ان کی سفارشی چٹھیاں لے کر پہنچے ہیں۔ بے روزگاری ہمارے ہاں اس حد تک عام ہے کہ اس کے متعلق لوگوں نے غور و فکر کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ ہر شہر، ہر گاؤں اور ہر گھر میں بے روزگار موجود ہیں۔ ہمارے آپ کے لئے یہ ممکن نہیں ہے کہ تمام تر نیک خواہشات کے باوجود ان کے لئے کام مہیا کریں مگر فیض ساری دنیا کو خوش دیکھنا چاہتے ہیں اور جب ایسا نہیں ہوتا تو وہ اداس ہو جاتے ہیں۔ ایلیس (بیگم) فیض اگر دو اور دو چار کی طرح سوچنے کی عادی نہ ہوتیں یا اپنی صلح کل طبیعت کی وجہ سے وہ بیگم کی ہر بات مان لینے کی عادت نہ ڈال لیتے تو ان کے گھر میں دنیا بھر کے بیکار، بے روزگار اور رنگا رنگ قسم کے بے فکر لوگ جمع ہوتے۔ بزرگ کہتے ہیں کہ جب دو روحوں کا ملاپ ہوتا ہے۔

تو قدرت ایک دوسرے کی کمی پوری کر کے جوڑوں میں توازن پیدا کرنے کا خود اہتمام کر دیتی ہیں۔ میاں اگر بے فکر یا فضول خرچ ہے تو بیوی جزرس ہوگی۔ ایک کی ناعاقبت اندیشی دوسرے کی دوررس نگاہوں کی وجہ سے اپنا اثر کھو بیٹھے گی۔ فیض اور بیگم فیض کی حد تک یہ مقدمہ معجزانہ طور پر صحیح معلوم ہوتا ہے۔ فیض کی بیگم اگر ایلیس کی بجائے کوئی اور خاتون ہوتیں تو معلوم نہیں موصوف کا کیا حشر ہوتا۔

HAMEED AKHTAR

بقیہ لکھنؤ کی ایک رات فیض کے ساتھ

ایسا لگ رہا تھا جیسے گذرتی ہوئی رات کے ساتھ جو آندھیوں کی رفتار نے صبح کی طرف جاری تھی۔ جذبی سفر کر رہا ہے۔ نجانے کتنی بار اس نے یہ نغمہ سنایا۔ بس اتنا یاد ہے کہ جب صبح ہوتے ہوتے آندھیاں تھم گئیں اور بالٹیوں پر جلتی ہوئی موم بتیاں چھوٹے چھوٹے سکوں میں تبدیل ہوگئیں اور ان کی تھرتھراتی ہوئی لوئیں دم توڑنے لگیں اور کھانے کے لئے دسترخوان بچھا تو جذبی بیچ دسترخوان پر کھڑا ہوا گا رہا تھا ؎

اپنے بھیگے ہوئے دامن کو سکھا لوں تو چلوں

آدھی سے زیادہ محفل سو رہی تھی، اور جذبی کی ڈوبتی ہوئی آواز کے ساتھ مخدوم کا اداس ترنم سنائی دے رہا تھا۔ وہ صرف اپنے لئے گنگنا رہا تھا ؎

خلوت رنگیں میں بھی ڈستا ہے یوں دنیا کا حال
جیسے پیتے وقت بھوکے بال بچوں کا خیال

ایک اور رات ختم ہوگئی جو پھر کبھی نہیں آئے گی۔ ایک اور دن شروع ہوگیا اور دیوار پر لگی ہوئی اسپین کی مجاہد خاتون کی تصویر ہمیں زندگی کی جدوجہد کی طرف چلنے کی دعوت دے رہی تھی۔

SARDAR JAFRI

زنداں نامہ - ایک تاثر

شاد عارفی

دلی اور لکھنؤ کے ٹکسالی نظم نگار سب سے پہلی غلطی تو یہ کرتے آئے ہیں کہ وہ اقبال اور پنجاب کے شعراء کو زبان کی کسوٹی پر کسنے کی عقل مندی فرماتے رہے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی ختم نہیں ہوا۔ چنانچہ فیض احمد فیض کے ادبی کارناموں پر بھی اسی نقطہ نظر سے تنقید کی جارہی ہے۔ ان حضرات کا کہنا ہے (ان حضرات میں کچھ ترقی پسند ناقد بھی شامل ہیں) کہ فیض احمد فیض کے پہلے دو مجموعے "نقش فریادی" اور "دست صبا" اپنے مواد اور ہیئت کے اعتبار سے جن بلندیوں کو چھو چکے ہیں "زنداں نامہ" میں ایسی کوئی اپج اور علوئے خیال نہیں پائی جاتی جس سے یہ توقع کی جائے کہ "زنداں نامہ" کا شاعر تھک نہیں گیا ہے اور نہ اس کے ہاں افکار و احساسات میں کوئی انحطاط پیدا ہوا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن نے بھی اپنے حالیہ مضمون میں جو نقوش ماہ رواں میں شائع ہوا ہے دبے دبے لفظوں میں یہی بات کہی ہے کہ فیض احمد فیض کا رجحان سخن اپنے رستہ سے بہک کر کسی نامعلوم منزل کی طرف جارہا ہے۔ جب کہ شاعر کے لئے اس کی منزل روشن اور واضح ہونی چاہئے لیکن میرا خیال ہے کہ وہ ڈاکٹر محمد حسن ہوں یا عبادت بریلوی، حتیٰ کہ احتشام صاحب بھی اپنی تنقیدوں میں کسی ترقی پسندانہ رجحان کی نشان دہی نہیں کر رہے ہیں۔ ان حضرات کی بیشتر تنقیدیں آپس میں یا تنقیص کرتی ہیں یا تائید۔ ہر پھر کر وہی تحلیل وہی مغربی مفکرین کے نام وہی نپی تلی عبارت اور وہی الفاظ کی نشت۔ اگر کچھ مابہ الامتیاز ہوتا بھی ہے تو عبارت کے الٹ پھیر سے ہوتا ہے نفس مضمون سے نہیں۔ جو تنقید میر پر ہوتی ہے وہ سودا کے لئے بھی اتنی مناسب ہو سکتی ہے۔ حالی اور غالب پر یہ کچھ لکھتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک تیر سے دو ہرن زخمی کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ان حالات میں ان حضرات کا یہ کہنا کہ فیض احمد فیض کا "زنداں نامہ" اتنا بلند نہیں جتنا کہ اس کے دوسرے مجموعے۔ میرا ذاتی خیال ہے اور ممکن ہے کہ میرے اس ذاتی خیال کے ہمنوا سیکڑوں کی تعداد میں ہوں کہ "زنداں نامہ" کے لکھے جانے کے عہد میں فیض احمد فیض جس ذہنی کشاکش اور کشمکش سے گذرا ہے، اس کی عکاسی کے لئے زنداں نامہ کی تدوین لازمی تھی۔ اب آپ اس شخص کا تصور کریں جس کے سامنے زندگی اور موت کا سوال نئے نئے رخ اور چالیں بدل کر آرہا ہو، اور وہ شخص شاعر بھی ہو۔ اگر یوں کہہ اٹھے

تیرے دست ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

ضبط و تحمل کا کتنا آہنی آئینہ دار ہے۔ یہی نہیں بلکہ اسی غزل میں وہ آگے بڑھ کر اپنے الجھے خیالات کی ترجمانی اس طرح کرتا ہے

تھے شب ہجر کام اور بہت
ہم نے فکر دل تباہ نہ کی

"زنداں نامہ" کی پہلی غزل کے یہ دو شعر اگر "زنداں نامہ" کا دیباچہ تصور کر لئے جائیں تو وہ کون کافر ہوگا جو فیض احمد فیض کی عظمت شعری سے انکار کرے کیوں کہ یہ میرا "زنداں نامہ" پر ایک سرسری مطالعہ ہے۔ اس لئے میں "زنداں نامہ" کی غزلوں کے چند شعر چن کر یہ ثابت کروں گا کہ فیض احمد فیض کا یہ مجموعہ ان کے پہلے دو مجموعوں سے کسی طرح کم وزن اور کم عیار نہیں

شمع نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

ہوسکتا ہے کہ اثر صاحب لکھنوی یا اور کوئی صاحب زبان اس میں زبان کی کوئی کوتاہی تلاش کرے لیکن میں سمجھتا ہوں ہیئت اور مواد کے اعتبار سے "زنداں نامہ" کی دوسری غزل کا یہ دوسرا شعر اپنے اندر ایک داستان ہوش ربا چھپائے ہوئے ہے۔ یہاں ہوش ربا کا مطلب افیون کی پنک نہیں ہے بلکہ وہ خونی تصور ہے جو دار و رسن میں ہر شخص کو گھور رہا ہے۔

اب تیسری غزل کا مطلع لیجئے

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن نہ تھیں تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جرم سخن سے پہلے

کیا قانون زباں بندی اور عدم توازن انصاف و عدل کی عکاسی اس سے بہتر صورت میں کی جاسکتی ہے؟ ماحول کا وہ کون سا گوشہ ہے جس پر یہ شعر روشنی نہیں ڈالتا۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر فیض احمد فیض کے "زنداں نامہ" میں صرف یہ مطلع ہی شائع کر دیا جاتا تو "زنداں نامہ" کی قدر و قیمت پر کوئی حرف نہیں آتا اور پھر اسی غزل کا یہ دوسرا شعر تو سونے پر سہاگے کا کام کر رہا ہے۔ سنئے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

اس غزل کا آخری شعر بھی اپنی اہمیت کے اعتبار سے نمایاں حیثیت رکھتا ہے

ادھر تقاضے ہیں مصلحت کے ادھر تقاضائے درد دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکر وطن سے پہلے

اتنا کچھ لکھنے کے بعد "زنداں نامہ" کا ایک ہلکا سا انتخاب پیش کرتا ہوں، تا کہ ناظرین میری تائید میں "زنداں نامہ" کو وہی درجہ دیں جو میری نظر میں ہے ۔

جب تجھے یاد کر لیا صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا ، رات مچل مچل گئی
دل سے تو ہر معاملہ کرکے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی
آخر شب کے ہم سفر فیض نہ جانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا صبح کدھر نکل گئی

یہاں ایک بات اور عرض کر دوں کہ میں فی الحال "زنداں نامہ" کی غزلوں پر روشنی ڈال رہا ہوں۔ نظموں پر تبصرہ کے لئے کسی فرصت کا منتظر ہوں۔ اگر ماحول نے اجازت دی تو اس پر الگ سے بات ہوگی۔ اب پھر غزل کا مطلع ملاحظہ فرمایئے ۔

بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے
لاکھ پیغام ہو گئے ہیں
جب صبا ایک پل چلی ہے
یا یونہی بجھ رہی ہیں شمعیں
یا شب ہجر ٹل چلی ہے
اشک خوناب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل چلی ہے

یہ چاروں شعر جس زاویہ نگاہ کی ترجمانی کرتے ہیں اگر آپ کے اندر وہاں پہونچ کر فکر ونظر کی عادت ہے تو غالباً آپ میرے ہمنوا ہو کر فیض کو کھلے دل سے داد دیں گے۔ ایک غزل کے یہ دو شعر بھی دیکھئے ۔

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچہ یار مہرباں ہے وہی
چاند تارے ادھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

بجے کمروں میں بیٹھ کر نقد نگاری کرنے والے ڈاکٹر ان اشعار کی قدر و قیمت کا کیا اندازہ کر سکتے ہیں۔ ان ناقدین کی مثال جوش کے ان اشعار سے ملتی ہے جو اس نے عیش و آرام کی زندگی گذارتے ہوئے غریب اور محنت کش طبقہ سے متعلق کہے ہیں۔ فیض احمد فیض کی یہ غزل بھی ان تمام مسائل پر روشنی ڈالتی ہے جو اس کے ماحول سے ہم کنار رہے ہیں۔ مطلع ہے ۔

دل نا امید تو نہیں ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
دست فلک میں گردش تقدیر تو نہیں
دست فلک میں گردش ایام تو ہے

سبحان اللہ، اس شعر میں جو بے ساختگی اور چٹپٹا پن ملتا ہے، اس کی مثالیں بہت کم دیکھنے میں آتی ہیں۔ کیا ایسا شاعر جو اس قسم کے بھر پور شعر کہتا ہو یا جس مجموعے میں اس قسم کے مکمل اشعار موجود ہوں ان پر یہ تنقید نگار ڈاکٹر (نعیم حکیم) نہ جانے کس اعتبار سے اس کہنے میں کوئی تکلف نہیں کرتے کہ یہ مجموعہ فیض احمد فیض کے دوسرے مجموعوں کے برعکس انفعالی کیفیت کا حامل ہے ۔

کچھ محتسبوں کی خلوت میں کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصے کی اب جام میں کمتر جاتی ہے
ہاں جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو ادھر کو جاتی ہے مقتل سے گذر کر جاتی ہے

اس غزل کا آخری اور لاجواب شعر اس طرح ہے ۔

ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیم صبح وطن
یادوں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے

ان اشعار کی برجستگی پر مقدمہ شعر و شاعری حالی قربان کیا جا سکتا ہے۔ میں چونکہ مضمون ختم کر رہا ہوں اس لئے دو تین شعر اور سنئے اور اجازت دیجئے ۔

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گذرنے والے
ناصحو ، پند گرو ، راہگذر تو دیکھو
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
ایک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو
وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو ، کبھی ان کا جگر تو دیکھو

ان اشعار کی موجودگی میں کون کہہ سکتا ہے کہ ادب میں جمود ہے، انحطاط ہے، اور ترقی پسند مصنفین تھک کر بیٹھتے جا رہے ہیں۔ سجاد ظہیر نے ٹھیک ہی کہا ہے کہ "فیض کا ہر شعر ان بلندیوں کو چھو رہا ہے، جس کی آج ترقی پسند ادب کو ضرورت ہے۔" (۱۹۵۹ء)

SHAD AARFI

"غزل گوئی باریک کام ہے اور جو عیوب اور کمزوریاں ~~دوسری اصناف~~ اصناف سخن میں دل ونظر گوارا کر لیتے ہیں، غزل میں بہت زیادہ کھٹکتی ہیں۔ اسی سبب سے کامیاب غزل کے لئے اور اصناف سخن کے مقابلے میں عاشقی اور ہنر مندی کی زیادہ ہی مقدار چاہئے اور دور حاضر میں ان اجناس کی کچھ ایسی افراط نہیں۔"

۔ فیض احمد فیض

فیض اور میں

ابن انشا

بڑے لوگوں کے دوستوں اور ہم جلیسوں میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ ایک وہ جو اس دوستی اور ہم جلیسی کا اشتہار دے کر خود بھی ناموری حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دوسرے وہ عجز و فروتنی کے پتلے جو شہرت سے بھاگتے ہیں۔ کم از کم اپنے ممدوح کی زندگی میں۔ ہاں اس کے بعد رسالوں کے ایڈیٹروں کے بزور اصرار پر انہیں اپنے تعلقات کو الم نشرح کرنا پڑے تو دوسری بات ہے۔

ڈاکٹر فقیر الدین کو لیجئے۔ جیسے اور پروفیسر ہوتے ہیں ویسے ہی یہ تھے۔ لوگ فقط اتنا جانتے تھے کہ علامہ اقبال کے ہاں اٹھتے بیٹھتے تھے۔ سو یہ بھی کوئی خصوصیت کی بات نہیں۔ یہ انکشاف علامہ کے انتقال کے بعد ہوا کہ جب کوئی فلسفے کا دقیق مسئلہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تو انہی سے رجوع کرتے تھے۔ ڈاکٹر فقیر الدین نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز آدھی رات کو میں چونک کر اٹھا اور کمرے میں سے جھانکا تو کیا دیکھتا ہوں کہ علامہ مبرور کا خادم خاص علی بخش ہے۔ میں نے پوچھا "خیریت تو ہے؟" بولا "علامہ صاحب نے یاد فرمایا ہے" میں نے کہا۔ "اس وقت؟" بولا "جی ہاں اس وقت اور تاکید کی ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو لے کر آنا۔" میں حاضر ہوا تو اپنے لحاف ہی میں جگہ دی اور فرمایا۔ "آج ایک صاحب نے گفتگو میں رازی کا ذکر کیا۔ تم جانتے ہو میں تو شاعر آدمی ہوں۔ آخر کیا کیا پڑھوں؟ اس وقت یہ پوچھنے کو تکلیف دی ہے کہ یہ رازی کون صاحب تھے؟ اور ان کا فلسفہ کیا تھا؟" میں دل ہی دل میں ہنسا کہ دیکھو اللہ والے لوگ ایسے ہوتے ہیں۔ بہر حال تعمیل ارشاد میں میں نے امام فخر الدین رازی اور ان کے مکتب فکر کا سیر حاصل احاطہ کیا اور اجازت چاہی۔ علامہ صاحب دروازے تک آئے اور آبدیدہ ہو کر رخصت کیا اور کہا۔ "تم نے میری مشکل آسان کر دی۔ اب اس شہر میں اور کون رہ گیا ہے۔ جس سے کچھ پوچھ سکوں۔"

اگلی اتوار کو زمیندار کا پرچہ کھولا تو صفحہ اول پر علامہ موصوف کی نظم تھی جس میں وہ مصرع ہے:

غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

اگرچہ میں نے واضح کر دیا تھا کہ رازی کا فلسفہ خاصا پیش پا افتادہ ہے۔ دقیق ہر گز نہیں لیکن معلوم ہوتا ہے علامہ مرحوم کو ایسا ہی معلوم ہوا۔

مدرسہ علمیہ شرطیہ موچی دروازہ کے پرنسپل مرزا اللہ دتہ خیال نے جو چھ ماہ میں میٹرک اور دو سال میں بی اے پاس کرانے کی گارنٹی لیتے ہیں۔ ماہنامہ "تصویر بتاں" میں پہلی بار اس بات کا اعتراف کیا کہ علامہ مرحوم کو مثنوی مولانا رومؒ کے بعض مقامات میں الجھن ہوتی تو مجھے یاد فرماتے تھے۔ ایک بار میں نے عرض کیا کہ آپ منشی فاضل کیوں نہیں کر لیتے؟ تمام علوم آپ کے لئے پانی ہو جائیں گے۔ بولے "اس عمر میں اتنی محنت شاق نہیں کر سکتا۔" بعد میں میں نے سوچا کہ واقعہ شعرا تلامیذ الرحمن ہوتے ہیں، ان کو علم اور ریسرچ کے جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہئے۔ یہ تو ہم جیسے سر پھروں کا کام ہے۔

علامہ کے ایک جگری دوست رنجور فیروز پوری کو بھی لوگ گوشہ گمنامی سے نکال لائے۔ ایک بصیرت افروز مضمون میں آپ نے لکھا۔ "خاکسار نے اپنے لئے شاعری کو کبھی ذریعہ عزت نہیں جانا۔ بزرگ ہمیشہ سے نیچہ بندی کرتے آئے تھے۔ اس میں خدا نے مجھے برکت دی جو ٹوٹا پھوٹا کلام بسبیل ارتجال کہتا تھا۔ علامہ صاحبؒ کی نذر کر دیتا تھا۔ اب میں دیکھتا ہوں کہ ارمغان حجاز وغیرہ کتابوں میں سینکڑوں ہی مصرے جو اس ہیچمدان کج مج زبان نے علامہ کے گوش گذار کئے تھے نگینوں کی طرح چمک رہے ہیں۔"

حکیم عورائیلی مصنف طب بقراطی نے نمائندہ صبح و شام کو انٹرویو دیا تو بتایا کہ ایک زمانہ میں حکیم الامت کو بھی طب کا شوق ہوا۔ بندہ نسخہ لکھتا اور علامہ مرحوم پڑیاں بناتے اور جوشاندے کوٹتے چھانتے۔ اس دوران اگر فکر سخن میں مستغرق ہو جاتے تو کبھی کبھی ہاون دستے میں اپنا انگوٹھا پھوڑ بیٹھتے۔ دوسرے روز عقیدت مند پوچھتے کہ یہ کیا ہوا تو فقط مسکرا کر انگشت شہادت آسمان کی طرف بلند کر دیتے۔

عام لوگوں کا یہ خیال تھا کہ علامہ مرحوم عمر کے آخری سالوں میں کبوتر بازی اور پہلوانی نہیں کرتے تھے اور مینڈھے لڑانے کا شغل بھی ترک کر دیا تھا۔ صحیح صورت حال بے عیاں معراج الدین گوجرانوالوی نے رسالہ غزل الغزلات کے اقبال نمبر میں پردہ اٹھایا۔ پھر علامہ اقبال کے احوال میں اکثر آیا ہے کہ فلاں بات سنی اور آبدیدہ ہو گئے۔ فلاں ذکر ہوا اور آنسوؤں کا تار بندھ گیا۔ اس کا بھید بھی علامہ مرحوم کے ایک اور قریبی دوست ڈاکٹر عین الدین ماہر امراض چشم نے کھولا۔

اسی زمرے میں ڈاکٹر محمد موسیٰ پرنسپل بانگ درا ہومیو پیتھک کالج گوجرہ شاہو کو رکھئے۔ جنہوں نے علامہ اقبال مرحوم کی زندگی کے ایک اور غیر معروف گوشے کو بے نقاب کیا۔ اپنی کتاب "تسہیل الہومیو پیتھی" کے دیباچے میں رقمطراز ہیں۔ "لوگوں کا یہ گمان غلط ہے کہ ڈاکٹر اقبال فقط نام کے ڈاکٹر تھے۔ اس عاجز کا مطالعہ اتنا نہیں کہ ان کے شاعرانہ مقام پر گفتگو کر سکے۔ ہاں اتنا وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ مرض کی تشخیص میں

اپنے بعد میں نے انہی کو دیکھا۔ بعض اوقات دواؤں کے ضمن میں بھی ایسے قابل قدر مشورے دیتے کہ یہ عاجز اپنے تجرِعلمی کے باوجود حیران رہ جاتا۔ بہرحال شاعر تو ہمارے ہاں اب بھی اچھے اچھے پائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک علامہ مرحوم کی رحلت ہومیو پیتھی طب کے لئے ایک ناقابل تلافی نقصان ہے۔ میں مریضوں پر توجہ دیتا اور وہ ایک کونے میں بیٹھے حقہ پیتے رہتے۔ تاہم اس عاجز کے مطب کی کامیابی میں جو مایوس مریضوں کی آخری امیدگاہ ہے اور جہاں خالص جرمن ادویات بکفایت فراہم کی جاتی ہیں ان کے نام نامی کا بڑا دخل تھا۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ آپ نے اپنی ایک مشہور تصنیف کا نام بھی عاجز کے مطب کے نام پر رکھا۔

فیض صاحب کے متعلق کچھ لکھتے ہوئے مجھے تامل ہوتا ہے۔ دنیا حاسدان بد بیں سے خالی نہیں۔ اگر کسی نے کہہ دیا کہ ہم نے تو اس شخص کو بھی فیض صاحب کے پاس اٹھتے بیٹھتے نہیں دیکھا تو کون ان کا قلم پکڑ سکتا ہے۔ مدیر افکار اصرار نہ کرتے تو یہ بندہ بھی اپنے گوشہ گمنامی میں مست رہتا۔ پھر بعض باتیں ایسی بھی ہیں کہ لکھتے ہوئے خیال ہوتا ہے کہ آیا یہ لکھنے کی ہیں بھی یا نہیں۔ مثلاً یہی کہ فیض صاحب جس زمانہ میں پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ کوئی اداریہ اس وقت تک پریس میں نہ دیتے تھے جب تک مجھے دکھا نہ لیتے۔ کئی بار عرض کیا کہ ماشاءاللہ آپ خود اچھی انگریزی لکھ لیتے ہیں۔ لیکن وہ نہ مانتے اور اگر میں کوئی لفظ یا فقرہ بدل دیتا تو ایسے ممنون ہوتے کہ خود مجھے شرمندگی ہونے لگتی۔ پھر فیض صاحب کے تعلق سے وہ راتیں یاد آتی ہیں جب فیض ہی نہیں بخاری، سالک، خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ ہم بھی ہم پیالہ و ہم نوالہ دوست راوی کے کنارے ٹہلتے رہتے اور ساتھ ہی ساتھ علم و ادب کی باتیں بھی ہوتی رہتیں۔ یہ حضرات مختلف زاویوں سے سوال کرتے اور یہ بندہ اپنی فہم کے مطابق جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتا اور یہ بات تو نسبتاً حال کی ہے کہ ایک روز فیض صاحب نے صبح صبح مجھے آن پکڑا اور کہا۔ "ایک کام سے آیا ہوں۔ واٹر کلر اور آئل پینٹنگ کا فرق معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ ٹھمری اور دادرا کا فرق بھی چند لفظوں میں بیان کر دیں تو اور اچھا ہے۔" میں نے چائے پیتے پیتے سب کچھ عرض کر دیا۔ اٹھتے اٹھتے پوچھنے لگے۔ "ایک اور سوال ہے۔ غالب کس زمانے کا شاعر تھا اور کس زبان میں لکھتا تھا؟" وہ بھی میں نے بتایا۔ اس کے کئی ماہ بعد تک ملاقات نہ ہوئی۔ ہاں اخبار میں پڑھا کہ لاہور میں آرٹ کونسل کے ڈائرکٹر ہو گئے ہیں۔

اکثر لوگوں کو تعجب ہوتا ہے کہ نقش فریادی کا رنگ کلام اور ہے اور فیض صاحب کے بعد کے مجموعوں دست صبا اور زنداں نامہ کا اور۔ اب چونکہ اس کا پس منظر راز نہیں رہا اور بعض حلقوں میں بات پھیل گئی ہے لہٰذا اسے چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ فیض صاحب جب جیل گئے ہیں تو ویسے تو ان کو زیادہ تکلیف نہیں ہوئی لیکن کاغذ قلم ان کو نہیں دیتے تھے اور نہ شعر لکھنے کی اجازت تھی۔ مقصد اس کا یہ تھا کہ ان کی آتش نوائی پر قدغن رہے اور لوگ انہیں بھول بھال جائیں۔ لیکن وہ جو کہتے ہیں تدبیر کند بندہ، تقدیر کند خندہ۔ فیض صاحب جیل سے باہر آئے تو تانگہ لے کر سیدھے میرے پاس تشریف لائے اور ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگے۔ "اور تو سب ٹھیک ہے لیکن سوچتا ہوں میرے ادبی مستقبل کا اب کیا ہوگا؟" میں نے مسکراتے ہوئے میز کی دراز میں سے کچھ مسودے نکالے اور کہا یہ میری طرف سے نذر ہیں۔ پڑھتے جاتے ہیں اور حیران ہوتے جاتے تھے۔ فرمایا۔ "بالکل یہی جذبات میرے دل میں آتے تھے لیکن ان کو قلم بند نہ کر سکتا تھا۔ آپ نے اس خوبصورتی سے نالے کو پابند نے کیا ہے کہ مجھے اپنا ہی کلام معلوم ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "عزیز من۔ بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ تم پر جیل میں جو گزرتی تھی اسے میں یہاں بیٹھے بیٹھے محسوس کر لیتا تھا ورنہ من آنم کہ من دانم۔ بہرحال اب اس کلام کو اپنا ہی سمجھو۔ بلکہ اس میں میں نے تخلص بھی تمہارا ہی باندھا ہے اور ہاں نام بھی میں تجویز کئے دیتا ہوں۔ آدھے کلام کو دست صبا کے نام سے شائع کرو اور آدھے کو زنداں نامہ کا نام دو۔" اس پر بھی ان کو تامل رہا۔ بولے۔ "یہ برا سا لگتا ہے کہ ایسا کلام جس پر ایک محب صادق نے اپنا خون جگر بہایا ہو اپنے نام سے منسوب کروں۔" میں نے کہا۔ "فیض میاں دنیا ہی چراغ سے چراغ جلتا آیا ہے۔ شیکسپیئر بھی تو کسی سے لکھوایا ہی کرتا تھا۔ اس سے اس کی عظمت میں کیا فرق آیا۔" اس پر لاجواب ہو گئے اور رقت طاری ہو گئی۔

فیض صاحب میں ایک اور بات میں نے دیکھی وہ بڑے ظرف کے آدمی ہیں۔ ایک طرف تو انہوں نے کسی پر بھی یہ راز افشا نہ کیا کہ یہ مجموعے ان کا نتیجہ فکر نہیں دوسری طرف جب لینن انعام لے کر آئے تو تمغہ اور آدھے روبل میرے سامنے ڈھیر کر دیئے کہ اس کے اصل حقدار آپ ہیں۔ اس طرح کے اور بہت سے واقعات ہیں جنہیں بیان کرنے لگوں تو کتاب ہو جائے لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا حاسدان بد بیں سے مفر نہیں اس لئے کنج خمول میں پڑا رہتا ہوں۔ یہ بھی صہبا صاحب کا کمال سمجھئے کہ اصرار کر کے یہ چند سطور مجھ سے لکھوا لیں۔

IBN-E-INSHA

بقیہ: فیض الہ آباد میں

اس کے بعد فیض صاحب سے لگاتار فرمائشیں ہوئیں اور انہوں نے اپنے سننے والوں کو مایوس نہیں کیا۔ فرمائشی کلام سنایا اور خوب داد و تحسین حاصل کی۔ الہ آباد کا یہ مشاعرہ بڑی کامیابی سے رات گئے ختم ہوا۔ دوسرے دن فراق صاحب کے دولت کدے پر فیض صاحب اور دیگر شعراء کو چائے پر مدعو کیا گیا۔ فیض صاحب نے وہاں جو بات کہی تھی وہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ "الہ آباد کا یہ مشاعرہ مجھے زندگی بھر یاد رہے گا۔" انہوں نے بڑے خلوص کے ساتھ فرمایا تھا۔ ہوسکتا ہے فیض کو الہ آباد کا یہ مشاعرہ زندگی بھر یاد نہ رہے لیکن ہم لوگوں کو یہ مشاعرہ یقیناً زندگی بھر یاد رہے گا کیوں کہ اتنا کامیاب اور تاریخ ساز مشاعرہ الہ آباد کی ادبی تاریخ میں اس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔

MEHBOOBULLAH MUJEEB

فیض الٰہ آباد میں

محبوب اللہ مجیب

مثل تو کچھ اسی طرح ہے۔ چہ نسبت خاک را با عالم پاک۔ مگر حقیقت بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ کہاں الٰہ آباد اور کہاں فیض صاحب؟ ہم لوگ تصور بھی نہیں کر سکتے تھے کہ کبھی فیض صاحب یہاں بھی تشریف لائیں گے! مگر یہ خواب حقیقت بن گیا اور فیض صاحب یہاں تشریف لائے۔

مئی ۱۹۶۰ء کی بات ہے کہ الٰہ آباد کے کچھ سر پھرے نوجوانوں اور سنجیدہ بزرگوں نے ایک مشاعرہ کرنے کی ٹھانی اور حضرت فراق گورکھپوری کے حضور جا کر اپنی اسکیم بنائی۔ ان اسکیم بنانے والوں میں مدیر شاہکار، محمود احمد ہنر صاحب، ان کے رفیق کار اختر سندیلوی اور عشرت صاحب وغیرہ تھے۔

فراق صاحب نے ان کی باتیں بڑے غور سے سنیں اور تعاون دینے کا وعدہ فرمایا۔

فراق صاحب سے تعاون کا وعدہ لے کر جب یہ لوگ واپس ہوئے تو مشاعرہ کے کام کو اس کی عملی سطح پر پرکھنے لگے۔ اب کام کرنے والے درکار تھے۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ایسے لوگوں کی ضرورت تھی جو خشوع وخضوع سے اس بار گراں کو اپنے کاندھے پر اٹھا سکتے۔ چنانچہ یہ مرحلہ سر کرنے کے لئے بھی دوستوں پر نگاہ گئی اور وہ آڑے وقت میں کام آئے۔ انور اللہ خاں اور ماسٹر مصطفیٰ (ممبران الٰہ آباد کارپوریشن) انوار الحسن، آصف انصاری، نعیم صدیقی، رمیش چندر دویدی اور ستیش چندر بترا نے مشاعرہ کے سلسلہ میں دن رات ایک کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ الٰہ آباد کی تاریخ میں یہ مشاعرہ امر ہو گیا۔

فراق صاحب نے اس مشاعرے میں سچ مچ بڑی دلچسپی کا ثبوت دیا۔ انہوں نے ذاتی طور سے فیض صاحب، ساحر لدھیانوی اور مخدوم محی الدین کو اس مشاعرے میں آنے کی دعوت دی۔ فراق صاحب کے ہاتھوں ان شعراء کے نام سمن جاری ہوا تھا تو آپ ہی بتائیے کہ اس کی تعمیل کیسے نہ ہوتی!

فیض صاحب کا خط آیا، ضرور آئیں گے۔

ساحر اور مخدوم کے ٹیلی گرام موصول ہوئے، مشاعرے میں شرکت کروں گا۔

اب حال یہ تھا کہ ہم لوگوں کا سینہ گز بھر کا ہو گیا تھا۔

ظاہر ہے کہ مشاعرے کو ایک صدر کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے لئے ہم نے ایک صدر تلاش کیا اور وہ بھی ایسا صدر، جس کے خاندان کا اردو شاعری پر بڑا احسان ہے۔ ہمارے مشاعرے کے یہ صدر جناب سریش نرائن ملا بار ایٹ لا تھے، جو اردو کے مشہور و معروف شاعر آنند نرائن ملا کے خاندان سے (غالباً بھتیجے) ہیں۔

جب صدر مل گیا تو مشاعرے کے لئے جگہ درکار ہوئی لیکن یہ مرحلہ بھی جلد سر ہو گیا۔ اچھا صدر بھی ملا اور مشاعرے کے لئے اچھی جگہ بھی۔ الٰہ آباد میں سول لائن اور چوک کے بیچوں بیچ ایک جگہ ہے جسے میو ہال کہتے ہیں۔ میو ہال سے ملحق کرکٹ کھیلنے کی ایک بڑی زمین ہے۔ اسی جگہ کو ہم لوگوں نے مشاعرہ گاہ بنایا۔ مشاعرے کے اس پنڈال اور احاطے میں بیس ہزار آدمیوں کے بیٹھنے کا انتظام تھا۔ مشاعرے کے لئے دریاں اور صوفہ سیٹ فراہم کرنے کے علاوہ ایک اونچا ڈائس بھی تیار کیا گیا تھا۔

۴رمئی کو ساحر اور مخدوم کے ٹیلی گرام آگئے۔ ہم الٰہ آباد ۵رکی صبح کو پہونچ رہے ہیں۔ مگر تشویش اب اس بات کی تھی کہ فیض صاحب کا کیا ہوگا؟ دوبارہ ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ وہ آئیں گے یا نہیں آئیں گے؟ بہت سے سوال ایک ساتھ اپنا جواب مانگ رہے تھے۔ ہم لوگ دیوانوں کی طرح فراق صاحب کے مکان کا چکر کاٹتے۔ حضور! اب کیا ہوگا؟ فیض صاحب پر غصہ کرتے۔ عجیب شاعر ہیں۔ نہ دوسرا خط اور نہ کوئی ٹیلی گرام۔ شہر بھر میں بڑے بڑے پوسٹروں پر فیض صاحب کا نام جگمگا رہا تھا۔ لوگ فیض کے بارے میں انکوائری کر رہے تھے۔ کیا کیا جائے؟ لوگوں کو منہ کس طرح دکھایا جائے؟ جن کے پاس جائیں گے وہ کیا کہیں گے؟ عجیب لوگ ہیں۔ کس دم خم پر فیض کا اعلان کیا تھا۔ بہر حال، یہ کٹھن بات تھی اور عزت سادات خطرے میں تھی۔

صدر موصوف نے ہم لوگوں کو اکٹھا کیا، دلاسے دیئے۔ فیض صاحب نے خط لکھا ہے تو ضرور آئیں گے۔ میں ان کی عادت سے واقف ہوں۔ سریش صاحب کی بات سے ہم وقتی طور پر بہل گئے لیکن اندر ہی اندر پریشان رہے۔ اگر فیض صاحب نہ آئے تو؟

اب ۵رمئی ۱۹۶۰ء بھی آگئی۔ ساحر لدھیانوی، مخدوم محی الدین اور جاں نثار اختر کے علاوہ بہت سارے شعراء الٰہ آباد میں تھے۔ تین بجے دن تک فیض صاحب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ چار بجے اور فراق صاحب کے مکان پر تار والا وارد ہوا۔ یہ تار فیض صاحب کا تھا لکھا تھا۔

''سات بجے شام کو الٰہ آباد پہونچ رہا ہوں۔''

اب کیا تھا۔ دل باغ باغ ہو گئے۔ بجھے ہوئے چہرے مسکرا اٹھے۔ سریش صاحب کو فیض کے آنے کی اطلاع دی۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

''میں کہہ رہا تھا نا۔!''

اب سارے شہر میں پھر ایک بار فیض کی آمد کا اعلان ہوا۔ لوگوں کو پھر یقین

نہیں آیا کہ فیض یہاں بھی آسکتے ہیں۔لیکن خواب حقیقت میں تبدیل ہوگیا تھا۔لوگ مشاعرہ سننے کے لئے ٹکٹ خریدنے لگے۔

وہ ۵ رمئی ۱۹۶۰ تھی۔رات کے ساڑھے آٹھ بجے تھے۔مشاعرہ گاہ لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔بے شمار مرد، عورتیں اور بچے۔سب کی نگاہیں ڈائس پر تھیں۔فیض آئے ہیں! دل کو گدگدانے والے شاعر آئے ہیں۔ان کی صورت دیکھیں گے۔ان کا کلام سنیں گے اور ان سے آٹو گراف لیں گے۔

ان منتظر نگاہوں کے بیچ شاعروں کی پہلی کھیپ مشاعرے میں داخل ہوئی۔ لوگ اپنی اپنی جگہ سکون اور خاموشی سے بیٹھ گئے۔کچھ گلے باز شاعروں نے لوگوں کے دل بہلائے۔پھر تھوڑی ہی دیر میں فراق صاحب کے پیچھے پیچھے ساحر لدھیانوی، جاں نثار اختر، مخدوم محی الدین اور انور معظم آئے۔مجمع بالکل ساکت تھا۔سارے شعراء ڈائس پر آگئے۔کم عمر لڑکے اور لڑکیاں آٹو گراف لینے بڑھے۔بدنظمی کے خوف سے کارکنان مشاعرہ نے انہیں روکا۔معصوم صورت اپنی اپنی تمنا سمیٹے واپس چلے گئے۔

نو بجے اور سریش نرائن ملا صاحب صدر کی جگہ بیٹھ گئے۔مدیر "شاہکار" محمود احمد ہنر صاحب نے اناؤنسر کے فرائض انجام دیئے۔فراق صاحب سے گذارش کی گئی کہ وہ تقریر کریں۔فراق صاحب اٹھے۔لوگ خوش ہوگئے۔تحسین ملی تالیاں بجیں۔اب مقامی شعراء اپنا کلام سنا رہے تھے۔اسی بیچ فیض صاحب اپنے دیرینہ رفیق شگھم سرن بار ایٹ لاء اور ان کی بیوی صادقہ سرن کے ساتھ تشریف لائے۔لوگ اٹھ اٹھ کر انہیں دیکھنے لگے۔شاید ان کو اب بھی یقین نہیں آرہا تھا۔ہوسکتا ہے فیض کا "ڈمی" تیار کرلیا ہو۔ یہ دیکھ کر ہم لوگوں نے فیض صاحب کو گود میں اٹھالیا اور ڈائس پر پھیلا دیا۔گوشت پوست کے فیض مجمع کے سامنے تھے۔مجمع کو اطمینان ہوگیا تھا۔یہ فیض ہی ہیں۔سو فیصدی فیض۔

اس وقت فیض صاحب کا تعارف، فراق صاحب سے بہتر اور کون کرا سکتا تھا۔ اناؤنسر نے فراق صاحب سے درخواست کی وہ سامنے آئے اور فیض صاحب کی شخصیت اور شاعری پر جس بھرپور طریقے سے انہوں نے روشنی ڈالی اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ آج یہ مضمون لکھتے وقت مجھے افسوس ہو رہا ہے کہ کاش! فراق صاحب کی وہ تقریر ٹیپ کر لی گئی ہوتی تو میں ان کے خیالات بھی من وعن پیش کر دیتا۔اس مشاعرے کی شان ہی کچھ نرالی تھی۔پڑھنے والے بڑے خلوص سے پڑھ رہے تھے اور سننے والے دل لگا کر سن رہے تھے۔فراق صاحب نے آج جم کر پڑھا تھا۔ہر شعر پر داد لی۔ان کے انداز، ان کے تیور اور ان کے اشعار سے پتہ چل رہا تھا کہ کوئی عظیم شاعر نغمہ سرا ہے۔

اوڑھنی اس کی ہوائیں ہیں کہ تاروں بھری رات
کسی گھونگھٹ ہی کو سرکاؤ کہ کچھ رات کٹے
یاد ایام کی پروائیو! دھیمے دھیمے
میر کی کوئی غزل گاؤ کہ کچھ رات کٹے

اب ساحر لدھیانوی مائک کے سامنے تھے۔مجمع اپنی اپنی فرمائشوں کی بھرمار کر رہا تھا۔ساحر گھبرا رہے تھے۔آخر میں "توڑ" اس بات پر ہوا کہ وہ اپنی پسند کی کوئی نظم سنانے کے بعد، مجمع کی پسند کی چیزیں بھی سنائیں گے۔اب وہ اپنی نظم "انتظار" پڑھ رہے تھے۔

چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے
دور وادی میں دودھیا بادل
جھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں
چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

ساحر لدھیانوی کے بعد مخدوم محی الدین آئے۔لوگوں نے فرطِ شوق سے تالیاں بجائیں۔انہوں نے لہک لہک کر پڑھا اور مجمع نے جھوم جھوم کر داد دی۔ان کی نظم "جانِ غزل" سے مشاعرے میں ایک کیفیت پیدا ہوگئی۔لوگ گنگنا رہے تھے۔

اے دلِ نارسا آج اتنا مچل،
مست آنکھوں کی جھیلوں میں کھلنے لگیں آنسوؤں کے کنول،
مل گیا راہ میں، اجنبی موڑ پر، کوئی جانِ غزل،
—
آج تو یاد آئیں، نہ دنیا کے غم،
آج دل کھول کر مسکرا، چشمِ نم

مجمع سے اب ضبط کا دامن چھوٹ گیا تھا۔لوگ آوازیں لگا رہے تھے۔فیض صاحب کو بلایئے۔اناؤنسر نے مجمع سے ہار مان کر فیض صاحب کو بلایا۔فیض صاحب مسکراتے ہوئے اٹھے اور اپنی دھیمی اور کومل آواز میں شعر سنائے۔انہوں نے اس مشاعرے میں جو غزل سنائی وہ بالکل تازہ تھی۔اس غزل کو میں نے محفوظ کر کے اس پر ان کے دستخط بھی لے لئے۔ان کی اس غزل کی اہمیت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اسے پہلی بار انہوں نے ہمارے مشاعرے میں پڑھا۔اس کے بعد یہ رسالوں میں شائع ہوئی۔

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی، ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہ گذار چلے گئے
تری کج ادائی سے ہار کے شب انتظار چلی گئی
مرے ضبط حال سے روٹھ کے مرے غم گسار چلے گئے
نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں، نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے
یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے، جو سجا کے ہم، سرِ بزمِ یار چلے گئے
نہ رہا جنونِ رخِ وفا، یہ رسن یہ دار کرو گے کیا
جنہیں جرمِ عشق پہ ناز تھا، وہ گناہ گار چلے گئے

(بقیہ صفحہ نمبر 39 پر)

فیض ایک صحافی

احمد علی خاں

فیض صاحب کو اخبار نویسی چھوڑے ہوئے کئی سال گذر چکے ہیں اور آج کل ان کا تعلق درس وتدریس سے ہے۔ بظاہر یہ عجیب سی بات معلوم ہوتی ہے کہ صحافت سے علیحدگی کے باوجود فیض صاحب صحافیوں کی کسی محفل میں کبھی اجنبی نہیں معلوم ہوتے بلکہ سنجیدہ اخبار بین طبقہ انھیں اب بھی صحافت سے منسلک سمجھتا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت اور اعتراف ہے کہ فیض صاحب کی صحافت سے وابستگی نے، جس کا عرصہ خاصا مختصر رہا، چند اہم اور یادگار اثرات چھوڑے ہیں۔

فیض صاحب نے صحافت کے میدان میں اس وقت قدم رکھا جب ملکی صحافت ایک نئے دور میں داخل ہورہی تھی۔ تقسیم سے سال بھر پہلے تک برصغیر پاکستان و ہند میں جہاں کئی کثیر الاشاعت انگریزی روزنامے کانگریس کے ہمنوا تھے وہاں صرف تین قابل ذکر انگریزی روزنامے تحریک پاکستان کے حامی تھے۔ "ڈان" دہلی سے نکلتا تھا اور "اسٹار آف انڈیا" اور "مارننگ نیوز" کلکتے سے۔ ان دنوں اس علاقے میں جو اب مغربی پاکستان کہلاتا ہے انگریزی کے چار قابل ذکر روزنامے تھے۔ "ٹریبیون" اور "سول اینڈ ملٹری گزٹ" لاہور سے شائع ہوتے تھے اور سندھ "آبزرور" اور "ڈیلی گزٹ" کراچی سے۔ یہ چاروں اخبار غیر مسلموں کے ہاتھوں میں تھے اور ان میں سے کوئی بھی تحریک پاکستان کا موئید نہ تھا۔ ۱۹۴۷ء کے آغاز میں پنجاب کے مسلم لیگی رہنماؤں نے اس کمی کو شدت سے محسوس کیا۔ جب میاں افتخار الدین مرحوم نے "پاکستان ٹائمز" کی بنیاد ڈالی تو گویا دو کام بیک وقت انجام دیئے۔ ایک تو پاکستان کی تحریک کو، جو نہایت نازک موڑ پر پہنچ چکی تھی، تقویت پہنچائی اور دوسرے نوزائیدہ مملکت کی آئندہ صحافت کی سمت اور معیار کا نشان دیا۔ لہٰذا پاکستان کے شیدائی پہلے تو "پاکستان ٹائمز" کے نام ہی پر جھوم اٹھے اور پھر بہت جلد اس اخبار کے صحافتی معیار اور اس کے پروقار اور متین انداز سے متاثر ہونے لگے۔

میاں افتخار الدین مرحوم ایک سیاسی شخصیت تھے اور ان کے مخالفین کی تعداد ان کے موافقین سے کم نہیں تھی لیکن یہاں ان کی سیاست کا یا ان کی رہنمائی میں "پاکستان ٹائمز" کے سیاسی رجحانات کا ذکر بے محل ہے۔ البتہ ان کے مخالفین بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ میاں صاحب مرحوم نے اپنے ضمیر کی روشنی میں ملکی صحافت کی اہم خدمت انجام دی۔ اخبار کے منتظم اعلیٰ کے طور پر انھوں نے جس اہلیت کا ثبوت دیا وہ اب بھی صحافتی اداروں کے منتظمین کے لئے ایک روشن مثال ہے۔ میاں صاحب بخوبی جانتے تھے کہ کوئی اخبار ایک قابل مدیر اور تجربہ کار اسٹاف کے بغیر اچھے صحافتی معیار پر پورا نہیں اتر سکتا۔ چنانچہ انہوں نے فیض صاحب کو مدیر بننے کی دعوت دی اور ادارتی عملے کے لئے اچھی ٹیم منتخب کرنے کا نہ صرف موقع دیا بلکہ اس کام میں ذاتی طور پر ان کی مدد بھی کی۔ سفارشوں کو وہ یہ کہہ کر ٹال دیا کرتے تھے کہ انتخاب کا حق ایڈیٹر کو ہے۔ دوسرے انھوں نے اس اصول کو اپنایا کہ اگرچہ اخبار کی انتظامیہ بنیادی پالیسی بنانے کی مجاز ہے مگر اسے یہ حق نہیں پہنچتا کہ ایڈیٹر کے روزمرہ کے کام میں مداخلت کرے۔ اخبار نویسی میں اس اصول کی اہمیت مسلم ہے۔ اگر اسے رد کیا جائے تو ایڈیٹر تجارتی مصلحتوں سے بلند اور مخصوص مفادات اور بااثر شخصیتوں کے دباؤ سے محفوظ نہیں رہتا اور نہ اس کا اہل ہوتا ہے کہ غیر جانبداری سے عمومی مفادات کی نگہداشت کر سکے۔ آج یہ کہنا مشکل ہے کہ ہمارے اخبارات کے سارے مالک اور منتظمین ان اصولوں پر کاربند ہیں۔

فیض صاحب نے جب ادارت کا بوجھ سنبھالا تو اس ذمہ داری کے لئے نئے تھے۔ لیکن ان میں اس کام کی بنیادی صلاحیتیں موجود تھیں۔ علمی لیاقت، سیاسی ادراک، تاریخ کا شعور، معاشرے کے مسائل کا علم، ادب پر گہری نظر اور اچھی انگریزی (یا اردو) نثر لکھنے کی صلاحیت فیض صاحب نے اپنی صلاحیتوں کا پورا استعمال کیا۔ ان کے اداریے، اپنی سلاست، شگفتگی اور ادبیت کے باعث ابتدا ہی سے مقبول ہوئے۔ ملک کے سیاسی مسائل پر فیض صاحب کے تبصرے وسیع حلقے میں پڑھے اور پسند کئے جاتے تھے۔ قارئین کو یاد ہوگا کہ قیام پاکستان کے کچھ عرصے بعد نواب ممدوٹ اور میاں ممتاز دولتانہ کی باہمی چشمک کی وجہ سے پنجاب مسلم لیگ دو متحارب گروہوں میں بٹ گئی تھی۔ اس قسم کے جھگڑے مشرقی بنگال اور سندھ میں بھی شروع ہو گئے تھے۔ اس گروہ بندی کا تعلق اصولی اختلافات سے نہیں تھا بلکہ اس کی تہہ میں ذاتی مفادات کارفرما تھے۔ یہ ابتدا تھی اس بے اصولی اور سیاسی انتشار کی جس نے آگے چل کر جمہوریت کو بہت نقصان پہنچایا۔ چنانچہ اس بے راہ روی پر فیض صاحب نے متعدد اداریے لکھے جن میں مسائل کا دیانتدارانہ تجزیہ پیش کرنے کے علاوہ طنز کے ہتھیار کا بھی خوب خوب استعمال کیا گیا تھا۔ ان کے علاوہ تعلیمی اور ثقافتی مسائل پر بھی کئی فکر انگیز اداریے لکھے جو کافی مقبول ہوئے۔

ہر اخبار و جریدہ اپنے ادارتی عملے کے مزاج، ذہنی ساخت اور انداز نظر کا عکاس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دو اخبار ایک ہی پالیسی کے ہمنوا ہوتے ہوئے بھی کبھی ایک جیسے نہیں ہوتے۔ پاکستان ٹائمز کا انداز اور پالیسی متعین کرنے میں فیض صاحب

کا بڑا ہاتھ تھا لیکن یہاں اس طریقہ کار کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جو انھوں نے ادارتی امور کو طے کرنے کے لئے اختیار کیا۔ کام شروع ہونے سے پہلے روز صبح ایک میٹنگ ہوتی تھی جس میں اس روز کی اشاعت کا جائزہ لیا جاتا تھا اور دوسرے روز کے ایشو کے سلسلے میں خاصی تفصیل سے بات چیت ہوتی تھی۔ اس میٹنگ میں تمام شرکاء کھل کر اپنی رائے دیتے تھے۔ اس جمہوری طریقہ کار سے یہ فائدہ تھا کہ اسٹاف کا ہر سینئر رکن اخبار کی پالیسی اور اس کے معیار کو اپنی ذاتی ذمہ داری تصور کرتا تھا۔ ظاہر ہے کہ اختلاف رائے کی صورت میں فیصلہ ایڈیٹر کے ہاتھ میں ہوتا تھا لیکن آزادانہ بحث اور خود تنقیدی کے باعث کوتاہیوں کو دور کرنے میں آسانی پیدا ہو جاتی تھی اور اکثر بہتری کی نئی راہیں کھلتی تھیں۔ فیض صاحب آزادی گفتار کے اتنے قائل ہیں کہ کسی کے منہ پر اس کی بات کی تردید نہیں کرتے خواہ بات کتنی ہی مہمل ہو چنانچہ ایڈیٹوریل کانفرنس میں بھی اکثر دس معقول باتوں میں چند مبہم یا ناقابل عمل خیالات پیش ہوتے تھے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا تھا کہ کوئی صاحب بولے چلے جا رہے ہیں اور اس کا خیال نہیں کرتے کہ سب کا وقت ضائع ہو رہا ہے۔ اکثر لوگ چڑ جاتے تھے لیکن فیض صاحب کے چہرے پر بیزاری کی کوئی جھلک نہیں آتی تھی۔ غالباً وہ جانتے تھے کہ میٹنگ کی افادیت کی خاطر یہ چیزیں برداشت کرنا ضروری ہیں۔

فیض صاحب بنیادی طور پر شاعر ہیں (اگرچہ جن لوگوں نے انہیں اخبار میں انہماک سے کام کرتے دیکھا ہے یہ دعویٰ کریں گے کہ وہ بنیادی طور پر صحافی ہیں) شاعر کے لئے یہ ضروری نہیں ہوتا کہ وہ سیاست داں یا فلسفی یا مفکر بھی ہو۔ لیکن جو شعراء اپنی ہفت پہلو شخصیت کا مکمل اظہار صرف شعر کے ذریعے نہیں کر پاتے انھیں اظہار و ابلاغ کے لئے دوسرے راستے بھی ڈھونڈنے پڑتے ہیں۔ صحافت فیض صاحب کے لئے ایسا ہی ایک رستہ ثابت ہوئی اور اپنی سماجی اور سیاسی فکر کا اظہار انھوں نے پاکستان ٹائمز کی تحریروں میں کیا۔

ایک لحاظ سے ان کے شعر کے قدردانوں کو صحافت کا شکرگزار ہونا چاہئے کہ اس کی وجہ سے ان کی شاعرانہ صلاحیت، بے ساختگی اور پاکیزگی برقرار رہی ورنہ ان کے شعر کو اس سارے بوجھ کا متحمل ہونا پڑتا۔ بہرحال اس معاملے سے قطع نظر، اس بات کا اعتراف ضروری ہے کہ فیض صاحب صحافیوں کے اس چھوٹے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں جس نے پاکستانی صحافت کا رخ اور معیار متعین کرنے اور اس کی ترقی کے لئے رستہ صاف کرنے میں قابل قدر خدمت انجام دی ہے۔ ان کے وہ پرانے ساتھی جو اب بھی صحافت میں ہیں ان کے اس رول کو کبھی نہیں بھول سکتے۔

AHMED ALI KHAN

a

بقیہ: چند یادیں چند تاثرات

تھیں ان میں پاکستان کے لئے نئے اخباروں کو جاری کرنے کا خیال بھی تھا۔ میاں افتخار الدین مرحوم نے اس سلسلہ میں سب سے پہلے اقدام کیا اور لاہور سے پاکستان ٹائمز اور امروز نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ چند سال میں اس منصوبے نے عملی شکل اختیار کی اور لاہور سے یہ دونوں اخبار نہایت آب و تاب سے نکلے۔ فیض پہلے پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر اور پھر اس ادارے سے شائع ہونے والے تمام اخباروں کے چیف ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انہوں نے فوجی ملازمت چھوڑ دی۔ صحافت کی دنیا میں قدم رکھا اور اس میدان میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ ان کی ادارت کے زمانے میں ان اخباروں کا معیار اتنا بلند ہوا کہ یہ اخبار اس وقت کے چوٹی کے اخباروں میں شمار ہونے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس میں فیض کی صلاحیتوں کا بڑا ہاتھ تھا۔

فیض پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر تھے۔ جب میں قیام پاکستان کے بعد لاہور پہنچا صحافت کی زندگی بڑی مصروف زندگی ہوتی ہے۔ میں بھی شروع شروع لاہور میں بری طرح مصروف رہا۔ اس لئے فیض سے صرف چند مختصر ملاقاتیں ہوئیں۔ کبھی کسی جلسے میں مل گئے۔ کبھی کہیں کھانے یا چائے پر سرسری سی ملاقات ہو گئی۔ کبھی اطمینان سے بیٹھ کر تفصیل سے باتیں کرنے کا موقع نہیں ملا لیکن اس زمانے میں جب میں پنجاب یونیورسٹی کی انجمن اردو کا صدر مقرر ہوا تو فیض سے مفصل ملاقاتوں کے کئی مواقع ملے اور ان ملاقاتوں سے زندگی کے متعلق ان کے خیالات اور ادب کے بارے میں ان کے نظریات کا اندازہ ہوا۔

انجمن کے زیر اہتمام میں نے کچھ ایسے جلسے ترتیب دیئے جن میں مشہور شعراء اپنی زندگی اور شاعری کے بارے میں اظہار خیال کرتے تھے۔ اس سلسلے میں میں نے فیض کو بھی دعوت دی اور انھوں نے اس دعوت کو اپنی مصروفیت کے باوجود بخوشی قبول کیا۔ جلسے میں آئے۔ اپنی شخصیت اور شاعری کے بارے میں تقریر کی اور تاریخی ترتیب سے اپنی نظمیں سنائیں۔ جلسہ کے آخر میں استادوں، طالب علموں اور ادیبوں نے بعض سوالات بھی کئے اور فیض نے ان کے جواب بھی دیئے۔

فیض نے اس جلسے میں بتایا کہ وہ سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ان کی تاریخ ولادت ۷ رجنوری ۱۹۱۱ء ہے۔ ان کا بچپن سیالکوٹ ہی میں گزرا۔ ابتدائی تعلیم اسکاچ مشن اسکول سیالکوٹ میں ہوئی۔ شمس العلماء مولوی میر حسن اور مولوی میر ابراہیم سیالکوٹی ان کے استاد تھے۔ ان بزرگوں کا شمار اپنے زمانے کے بڑے فاضلوں میں ہوتا تھا۔

DR. IBADAT BARELVI

بک سیلر فیض

ابراہیم جلیس

دوستو آؤ چل کے دیکھیں گے
فیض صاحب کتاب بیچیں گے

وہ فیض احمد فیض۔ شیریں لب، خوشبوئے دہن، شادابی دل اور تفریح نظر کا نقیب شاعر فیض احمد فیض۔

وہ فیض
جس سے سنت منصور و قیس زندہ ہے۔
وہ فیض
جس سے ہے باقی جہاں میں کج کلہی
وہ فیض جس کے
دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی

وہ فیض جو کبھی تنہا پس زنداں تھا، آج بیٹھا سر بازار ہے، تا کہ
اے مکتبہ گلڈ... ترا کاروبار چلے

پاکستانی ادیبوں کے رشتہ اتحاد۔ رائٹرز گلڈ نے پہلے تو ملک کے سب سے زیادہ ذہین اور سب سے زیادہ مظلوم انسانوں، ادیبوں اور مشاعروں کو کسمپرسی، انتشار، خواری و نزاع سے نکالا۔ معاشرے کے باعزت اور اہم انسانوں کے شانہ بشانہ کھڑا کیا۔ ان کے اتحاد کی خانہ آبادی کی اور ان کے کھانے کمانے کے لئے۔ (بحوالہ اصلاح دکنداری)

"ایک دکان کر کے دے دی ہے۔"

کراچی کی خوبصورت شاہراہ وکٹوریہ روڈ پر کتابوں کی جو ایک نئی دکان ہے پاکستان کے علم نواز اور ادب دوست وزیر خزانہ جناب محمد شعیب نے نہ صرف اس کا افتتاح کیا تھا بلکہ اس دکان بارونق کے پہلے خریدار بھی وہی تھے اور شاید یہ محمد شعیب کے ہاتھوں کی برکت ہی ہے کہ دکان کا بجٹ "سرپلس" ہی جا رہا ہے۔ دکان خوب چمک اٹھی ہے اور پہلے ہی دن سے

بڑی رونقوں پہ ہے گلڈ کی دکان

اس دکان سے پہلے ادیب صرف رائٹر تھے رائٹر تھے۔ اب رائٹرز گلڈ نے ہر رائٹر کو رائٹر کے علاوہ

"رائٹر، پرنٹر، پبلشر اینڈ بک سیلر"

بھی بنا دیا ہے۔

اب فیض ہوں یا حفیظ، نسیم حجازی ہوں یا احمد ندیم قاسمی، ماہر القادری ہوں یا جمیل الدین عالی، ہاجرہ مسرور ہوں یا قدرت اللہ شہاب۔ یہ دل بیچنے والے، یہ سر بیچنے والے، یہ جان بیچنے والے قلمکار کے قلمکار ہیں دکندار کے دکندار ~

یہ مکتبہ گلڈ سلامت ہے تو ادبا
تصنیف و تجارت کو بہم کرتے رہیں گے

واہ حضرت حفیظ جالندھری
خوب کرتے ہوئے دکنداری

اخباروں میں خبر چھپی ہے کہ آج سہ پہر تین بجے سے شام کے سات بجے تک حضرت فیض احمد فیض رائٹرز گلڈ کی اس کتابوں کی دکان پر بہ حیثیت "بک سیلر" کے بیٹھیں گے۔ اب فیض صاحب کے وہ مداح اور عشاق جنہوں نے فیض صاحب کو کبھی نہیں دیکھا اور جو فیض صاحب کا شربت دیدار بھی پینا چاہتے ہیں اور ان کے قیمتی دستخط سے ان کی تصانیف حاصل کرنا چاہتے ہیں ان کے لئے یہ بڑا نادر موقع ہے۔

"دست صبا" بھی لو "دست خط" بھی لو
آنکھوں سے لگاؤ کبھی تم دست صبا کو
ہونٹوں سے لگاؤ کبھی تم دست خطوں کو

کیوں کہ بقول فیض ~

میرا سرمایہ، مری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس یہی ہاتھ تو ہیں

لب پہ حرف غزل دل میں قندیل غم۔ دیکھو وہ شاعر فیض بھی بیٹھا ہے۔ وہ دیکھو "بک سیلر" فیض بھی بیٹھا ہے۔ فیض کو دیکھنے، فیض سے "ہم کلام" ہونے اور فیض سے خود "کلام فیض" خریدنے جہاں بہت سے لوگ جائیں گے وہاں (بوجوہ) بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے جو اس تذبذب میں مبتلا ہو جائیں گے کہ

واں جائیں یا نہ جائیں
نہ جائیں کہ جائیں ہم (فیض)

آج فیض اپنی تصنیف کے آپ بیوپاری بنے بیٹھے ہیں تو کل حفیظ جالندھری، ابن انشاء، ہاجرہ مسرور، خدیجہ مستور، شاہد احمد دہلوی، شوکت عثمان، جمیل الدین، فارغ بخاری، ممتاز حسین وغیرہ سب کے سب دکان پر بیٹھیں گے۔ گاہک آئیں گے۔

فرمائشیں کریں گے:

"فیض صاحب! ایک پیکٹ "نقش فریادی" دیجئے۔"

"نسیم حجازی صاحب! ایک کنستر ناول چاہیے۔"

"ہاجرہ مسرور صاحبہ! "چری چھپے" ایک افسانہ بلیک میں دے دیجئے۔"

"ندیم قاسمی صاحب! پانچ سیر غزلیں تول دیجئے۔"

"انشاجی! آپ کے پاس "چاند نگر" کی گائیڈ بک ہوگی۔"

"مسٹرجی الانا! ذرا ولایتی شاعری کا سیمپل تو دکھائیے۔"

"ضیا جالندھری صاحب! ڈنڈی نہ ماریئے۔ پوری غزل تولئے۔"

"عالی جی! آپ کے "دوہوں" کی ایک بوری تاری اور ایک بوری گوری دے دیجئے۔"

"شاہد احمد دہلوی صاحب! ذرا ایک سیر دلی کے چٹخارے دار محاورے تو باندھ دیجئے۔"

امید تو یہی ہے کہ دکان خوب چلے گی، خوب چمکے گی اور انشاء اللہ اس دکان کا مال وساور بھی جایا کرے گا۔

ارادہ ہے کہ آج سہ پہر ہم بھی اس دکان کی رونق دیکھیں۔ شاعر فیض کو تو بارہا دیکھا ہے، "بک سیلر فیض" کو آج تک نہیں دیکھا۔ ذرا دیکھیں تو سہی کہ ان کی دکانداری بھی ان کی شاعری کی طرح ہے کہ نہیں۔ دکان پر نفس مکمہ، دکاندار کی طرح بیٹھے ہیں کہ "ادھار کھائے بیٹھے ہیں؟"

ان کی دلفروشی اور سرفروشی کو تو آزما چکے اب ذرا ان کی "کتب فروشی" بھی دیکھیں۔

ہمیں ان کی "دست صبا" بھی چاہیے اور "دست خط" بھی۔

ہم تو فیض کے پرانے "بندۂ بے دام" ہیں اس لئے اگر انہوں نے "دام" مانگے تو ہم یہ شکوہ ضرور کریں گے کہ۔

اے فیض اپنی وضع تجارت تو دیکھئے
دیوان بیچتے ہیں تو بے دام کیوں نہیں

IBRAHIM JALEES

ضروری اطلاع

"فیض نمبر" جن قارئین کو نہ ملے!

جن قارئین کو "ماہنامہ بیباک" کا فیض نمبر ۱۰/ مئی تک نہ مل سکے، انہیں سمجھ لیجئے کہ ہم نے جان بوجھ کر اسے روک رکھا ہے۔ ان کے زرسالانہ گذشتہ سال اور جاری سال جنوری تا اپریل تک واجب الادا ہیں۔ اگر وہ فوری طور پر زرسالانہ (مئی آخر تک) بھیج دیتے ہیں تو پرچہ بھیج دیا جائے گا۔ بصورت دیگر ترسیل رکی رہے گی۔ ایسے خریداروں کو ہم بذریعہ خط بھی اطلاع دیں گے۔ حکومت ہند کے محکمۂ ڈاک کی وزارت نے انڈر پوسٹل سرٹیفکیٹ (U.P.C.) کا سلسلہ بند کر دیا ہے۔ ہم نے گذشتہ ماہ اعلان کیا تھا کہ جن حضرات کے رجسٹرڈ پوسٹ کے ۲۵ روپے کے پوسٹل ٹکٹ مل جائیں گے، انہیں انڈر پوسٹل سرٹیفکیٹ (U.P.C.) کے ذریعہ اپنے خرچ سے بھیج دیں گے لیکن چونکہ حکومت نے یہ سسٹم ہی ختم کر دیا ہے اس لئے مجبوراً ہم سادی ڈاک سے آپ کے نام اور پتے کی چٹ دو مرتبہ چیک کرلیں گے۔ اس کے باوجود "فیض نمبر" نہ ملے تو فون نہ کریں اور نہ ہی تحریری شکایت کریں۔ چالیس روپئے اور رجسٹری خرچ ۲۵ روپے اس طرح ۶۵ روپئے کے منی آرڈر بھیج دیں گے تو یہ خاص نمبر ہم بذریعہ رجسٹر پوسٹ بھیج دیں گے۔

فقط: ریاض احمد (مینیجر ماہنامہ بیباک، مالیگاؤں)

۱۵/ اپریل ۲۰۱۱ء

"فیض نمبر" پر اپنی رائے ضرور بھیجیں

ہم نے بھرپور کوشش کی کہ "فیض نمبر" سے آپ کو اس عظیم شاعر کی شخصیت اور شاعری اور عظمت ومقبولیت کا بخوبی اندازہ ہو جائے۔ تین مہینوں کی مسلسل محنت، رسالوں کے ضخیم "فیض نمبرات" اور مشہور خوش فکر شاعر عبدالاحد ساز کی معاونت سے فیض کی کلیات "نسخہ ہائے وفا" سے آٹھوں دواوین سے انتخاب کلام کا مرتب کرنا آسان بات نہ تھی لیکن ہم نے وہ کیا اور ترتیب سے ان کا منتخب کلام اس شمارہ میں دیا جا رہا ہے جو اس نمبر کا گراں قدر سرمایہ ہے۔

آپ اسے پڑھئے اور فیض کو سمجھے، خصوصاً ہم نئی نسل کے شعراء کو مخاطب کرتے ہوئے یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ وہ مضامین، مقالات اور دیگر انتخابات کو غور سے پڑھ کر اپنی رائے ہمیں بھیجیں۔ جب ہی ہم سمجھ پائیں گے کہ ہماری محنت ثمر آور ہوئی۔

ہارون بی اے

(مدیر)

کچھ ڈراموں کے بارے میں

فیض احمد فیض

ہمارے برصغیر کا عوامی تھیٹر برا بھلا جیسا بھی تھا اب سے برسوں ادھر طبعی موت مر چکا لیکن اسے ہمارے لکھنے والوں کی ہمت کہئے۔ ہٹ دھرمی کہئے یا امید پرستی کہ ڈرامے جب بھی لکھے جاتے رہے، اور اب بھی لکھے جاتے ہیں۔ اس صنف ادب میں ضرور کوئی غیر معمولی کشش ایسی ہوگی کہ بہت سے مشاق لکھنے والے اپنی اور دوسروں کی پسندیدہ اصناف سے ہٹ کر بھی اکثر اس کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بیشتر ڈرامے ریڈیو کے لئے لکھے جاتے ہیں۔ یا مغربی تصانیف سے اخذ و ترجمہ کئے جاتے ہیں۔ اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ ریڈیو موجود ہے اس لئے ریڈیو ڈرامے کی مانگ بھی موجود ہے۔ مغربی تراجم کا یہ ہے کہ اصل کی شہرت کے باعث نقل کی قبولیت کے امکانات خود ہی بڑھ جاتے ہیں۔

ریڈیو ڈرامہ اپنی جگہ ایک الگ اور مستقل صنف تحریر ہے جسے اسٹیج ڈرامہ کا بدل نہیں ٹھہرا سکتے۔ ریڈیو ہوائی چیز ہے۔ اس لئے ریڈیو ڈرامے پر بھی مقام اور زمان کی قید نہیں۔ نہ تھیٹر، نہ اسٹیج، نہ اداکار، نہ تماشائی۔ جی چاہے تو اس میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیجئے لیکن ایسے ڈرامے اسٹیج پر منتقل کرنا محال ہے۔ ریڈیو کی اپنی مخصوص حدود و قیود ضرور ہیں لیکن ان کی نوعیت اسٹیج کے تقاضوں سے مختلف ہے۔

رہے مغربی ڈراموں کے تراجم یا چربے تو ان کی افادیت اپنی جگہ مسلم لیکن مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ بیشتر ڈراموں پر کسی مخصوص معاشرے اور زمان و مقام کی چھاپ ہوتی ہے۔ جسے آپ آسانی سے بدل نہیں سکتے۔ یوں تو بھی ادب اپنے عہد اور گرد و پیش کی عکاسی کرتا ہے لیکن ڈرامے کے آئینے میں اس تصویر کے خد و خال اور بھی نمایاں دکھائی دیتے ہیں۔ چنانچہ کسی اجنبی معاشرے کے بارے میں لکھا ہوا ڈرامہ کیسے ہی سلیقے اور مہارت سے کیوں نہ اپنایا جائے، تکلف یا تصنع یا اجنبیت کا کچھ نہ کچھ شائبہ باقی رہ ہی جاتا ہے۔

ہاجرہ مسرور افسانہ نگاری کی حیثیت سے ہمارے ہاں ایک زمانے سے معروف ہیں۔ تمثیل نگاری کے میدان میں یہ مجموعہ ان کی پہلی کاوش ہے لیکن اس نقش اول میں بھی بعض منفرد اوصاف نمایاں ہیں۔ مثلاً ایک تو یہی ہے کہ یہ ڈرامے نہ ریڈیو ڈرامے ہیں نہ مغربی تصنیف کے چربے یا تراجم، ان کے مضامین واقعات اور کردار سب دیسی ہیں اور کسی کردار میں بدیسی پن کی جھلک بھی ہو تو ایسی ہے جیسی ہم اپنے فیشن ایبل طبقے میں روزانہ دیکھتے ہیں۔ ان کرداروں کی الجھنیں اور ان کے حل، چپقلشیں اور سلجھاوے، افعال اور محسوسات سب ہماری جانی پہچانی باتیں ہیں۔ جس ساز و سامان کے ساتھ اور جن پردوں کے سامنے یہ ناٹک کھیلے جاتے ہیں ہمارے روزمرہ ماحول کا جزو ہیں جو تماشا یہ لوگ برپا کرتے ہیں ہر روز ہمارے آگے ہوتا رہتا ہے چنانچہ ان ڈراموں میں سچائی اور خلوص موجود ہے جو کسی تحریر میں دیدہ بینا اور دل دردمند کے بغیر پیدا نہیں ہوتا۔

ہاجرہ مسرور کی تربیت جدید افسانہ نگاری کے مکتب میں ہوئی ہے۔ اس لئے انہیں خارجی واقعات کی نسبت اپنے کرداروں کے داخلی اور جذباتی ارتقا سے زیادہ دلچسپی ہے۔ اس کا سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان ڈراموں میں جو مرکزی مسائل یا مضامین بیان ہوئے ہیں ان کی رعایت سے مناسب ہی یہی تھا۔ ہمارے سفید پوش طبقے میں مرد اور عورت کے جذباتی کاروبار کے خسارے اور نا آسودگیاں اس کاروبار کی رنگینی اور بے رونقی، اس کے جھوٹ اور ریاکاریاں، اس کی معصومیت اور نادانیاں۔ ان ڈراموں کا بیشتر موضوع یہی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسانی تجربے کی طرح ان تجربات کی تشکیل میں بھی خارجی عوامل اور داخلی کیفیات دونوں باہم پیوست ہوتی ہیں۔ جن کے عمل اور ردِ عمل سے کسی کردار کی ذہنی اور جذباتی شخصیت پیہم بدلتی رہتی ہے۔ ہاجرہ مسرور نے انسانی شخصیت کی شکست و ریخت میں ان داخلی محسوسات کی گرفت اور دخل اندازی پر زیادہ توجہ دی ہے اور خارجی واقعات بیشتر اشارتاً بیان کئے ہیں مثلاً "نوری خالہ" میں رضا ماموں کی برسوں پہلے کی جذباتی شکست ایک نئے بیاہے جوڑے کے لئے عذاب جان بن جاتی ہے۔ "دستک" میں ایک نوعمر گھریلو لڑکی دلہن بنتے ہی اپنے پرانے محبوب سے یکسر نا آشنا اور اپنے نئے دولہا کے لئے سراپا انتظار ہو جاتی ہے۔ "کھلی کھڑکیاں" میں ڈاکٹر نور اور اس کی بیوی نسرین ایک دوسرے سے نفرت بھی کرتے ہیں، چھٹکارا بھی پانا چاہتے ہیں لیکن ساتھ رہنے کی عادت اور اجنبی دنیا کے خوف نے دونوں دلوں میں ایسی زنجیریں ڈال رکھی ہیں جن سے نجات ممکن نہیں

"وہ لوگ" اس مجموعے کے باقی ڈراموں سے مختلف رنگ میں ہے اور تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے شاید سب میں موثر۔ اس کے کردار زیادہ حقیقی ہیں جن کی ہولناک جہد حیات میں خیالیت اور جذباتیت کو دخل نہیں۔ ان کی جہد و کشمکش کی ڈرامائی وضاحت کے لئے وقت اور (Situation) کا مرکزی نقطہ بہت صحت سے چنا گیا ہے۔ اس کش مکش کے تمام پہلو اس مرکز کے ارد گرد بہت خوبی سے مرتب ہو گئے ہیں۔

(بقیہ صفحہ نمبر 22 پر)

تذکرہ وتبصرہ

جعفر علی خاں اثرلکھنوی

فیض احمد فیض کی شاعری ترقی کے مدارج طے کر کے اب اس نقطہ عروج پر ہے۔ جس تک شاید ہی کسی دوسرے ترقی پسند شاعر کی رسائی ہوئی ہو۔ تخیل نے صناعت کے جوہر دکھائے ہیں اور معصوم جذبات کو حسین پیکر بخشا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پریوں کا ایک غول ایک طلسمی فضا میں مست پرواز ہے۔ ایک پر ایک کی چھوٹ پڑ رہی ہے اور قوس قزح کے عکاس بادلوں سے ست رنگی بارش ہو رہی ہے۔ بالکل ایسا منظر جو میں نے ایک شام کو سری نگر سے نشاط باغ جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پانی برس کر کھل گیا تھا اور سامنے پہاڑیوں پر ایک قوس قزح نہیں بلکہ قطار در قطار تاحد نظر ایک سلسلہ تھا اور ان سب کو اپنے حلقے میں لئے ہوئے آسمان پر ایک بڑی قوس قزح!

پروفیسر رشید احمد صدیقی

میرے نزدیک ترقی پسند غزل گویوں میں صرف فراق اور فیض ایسے ہیں جنہوں نے غزل کو ایک نیا مزاج اور زاویہ دے کر اس کی خوبی اور خصوصیت میں اضافہ کیا ہے۔ گو میں کچھ اس طرح بھی محسوس کرتا ہوں کہ یہ اضافہ اتنا ترقی پسندانہ نہیں جتنا شاعرانہ، عارفانہ یا عارفانہ شاعرانہ ہے۔ فیض نے غزلیں نسبتاً کم کہی ہیں۔ فیض کی بعض نظمیں ایسی ہیں جو اردو کے بہترین نظموں کے ہم پہلو رکھی جا سکتی ہیں۔ یہی سبب ہے کہ جب وہ غزل کی طرف مائل ہوتے ہیں تو ان کی نظم کی خوبیاں اور زیادہ نکھر اور سنور کر ان کی غزلوں میں ڈھل جاتی ہیں! یہی بات میں نے اقبال کے بارے میں کہی تھی۔

فیض جیسا کہ سب جانتے ہیں اول سے آخر تک اشتراکی ہیں۔ لیکن غزل کا مزاج و مقام جیسا فیض نے پہچانا ہے ان کے دوسرے ساتھیوں نے نہیں پہچانا۔ فیض کی غزلوں سے اکثر یہ محسوس ہوا ہے جیسے شعر کہتے وقت وہ ترقی پسندی اور اشتراکیت کی آرائش خم کاکل میں اتنے منہمک نہ ہوں جتنے "اندیشہائے دور دراز" میں غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھتے ہیں۔

غالب اور اقبال کا احترام پیش نظر رکھنے سے فیض کچھ کم اشتراکی یا ترقی پسند نہیں ہو گئے ہیں۔ کہنا یہ ہے کہ شاعری میں موضوع کو اس طرح سمونا کہ شاعری موضوع اور موضوع شاعری معلوم ہونے لگے۔ بڑے شاعر کی بڑی اچھی پہچان ہے۔ جب تک کوئی شاعر اپنا ہوتے ہوئے سب کا شاعر نہ ہوگا، بڑا یا اچھا شاعر نہ کہلائے گا۔ ترقی پسند شاعروں میں یہ امتیاز فیض کے سوا شاید ہی کسی اور کو میسر ہو۔

فیض کو میں نے غالب اور اقبال کے قریب بتایا ہے لیکن ایک چیز مجھے کھٹکتی ہے وہ یہ کہ فیض کو زبان پر اتنی قدرت نہیں ہے جتنی اقبال اور غالب کو تھی۔ صحت زبان کو اردو شاعری میں جو اہمیت حاصل ہے فیض نے اس کی طرف اتنی توجہ نہیں کی جتنی ان کی شاعری کا تقاضا ہے۔

پروفیسر فراق گورکھپوری

میں یہ مضمون رواداری اور عین علالت میں لکھ رہا ہوں اس لئے ان سیکڑوں نظموں کا جائزہ لینا کچھ اپنی مجبوریوں سے، کچھ وقت اور جگہ کی قلت سے ناممکن ہے جو بہت سے اور شاعروں سے ہم کو ملی ہیں۔ جن میں کچھ نہایت لطیف نظمیں عورتوں کی لکھی ہوئی ہیں لیکن ان سب کا نام نہ لیتے ہوئے بھی پروفیسر فیض احمد کی نظم جس کا عنوان ہے "رقیب سے" اور جو ہمایوں کے فروری ۱۹۳۸ء کے نمبر میں نکل چکی ہے اس کا ذکر ضرور کروں گا۔

میں بہت کم اشعار، یا غزلوں اور نظموں کے متعلق یہ محسوس کرتا ہوں کہ میرے دل و دماغ کا چور نکلا لیکن یہ نظم ایسی ہی نظم تھی۔ اردو کی عشقیہ شاعری میں اب تک اتنی پاکیزہ، اتنی چٹیلی اور اتنی دوررس اور مفکرانہ نظم وجود میں نہیں آئی۔ نظم نہیں بلکہ جنت اور دوزخ کی وحدت کا راگ ہے۔ شیکسپیئر، گوئٹے، کالی داس اور سعدی بھی اس سے زیادہ رقیب سے کیا کہتے؟ رقیب کا موضوع اردو شاعری میں بہت بدنام موضوع ہے۔ لیکن فیض نے اسے بے پناہ طور پر موثر چٹیلا اور پاکیزہ بنا دیا۔ عشق اور انسانیت کے لطیف اور اہم ربط کو سمجھنا ہو تو یہ نظم دیکھئے۔ یہ ملکی مذاق کی بدنصیبی ہے کہ اس نظم کی غالباً وہ قدر شناسی نہیں ہوئی جس کی وہ مستحق ہے۔ عشقیہ نظموں کا کوئی گلدستہ اس نظم کے بغیر بے جان و بے رنگ رہے گا۔

پروفیسر فیض کا مجموعہ جن کی ایک نظم "رقیب سے" کا ذکر آ چکا ہے "نقش فریادی" کے نام سے نکلا اور اگرچہ بہت مختصر تھا لیکن اس کا بہت زبردست اثر ہماری شاعری پر پڑا۔ فیض نے فکر و احساس کی ایک نئی تکنیک اس میں دی جو اس دور کی ترجمانی کے لئے نہایت موزوں ہے۔ ان کے مصرعوں کی لے میں جو کھنک یا زمزمہ (Tilz) ہے اور ان کی فقرہ سازی Phrasing میں جو تازگی و موزونیت ہے وہ ان کے اسلوب میں ایک اخلاقانہ انفرادی خصوصیت پیدا کر دیتی ہے۔ فیض نے ایک نیا مدرسہ شاعری قائم کیا۔ انھوں نے جس بصیرت افروز اور احساس خلوص و فنکارانہ چابکدستی سے عشقیہ واردات کو دوسرے اہم سماجی مسائل سے متعلق کر کے پیش کیا یہ اردو کی عشقیہ شاعری میں ایک بالکل نئی چیز تھی، نئی اور قابل قدر بھی۔ اس مجموعہ میں دس بارہ مصرعوں کی غیر مقفیٰ نظم "تنہائی" کے عنوان سے تو عشقیہ شاعری کا ایک ناقابل فراموش کارنامہ ہے۔ اور یہ نظم ایک زندہ جاوید کلاسک ہے۔ فیض نے ان احساسات کو اور بھی چمکا دیا جو اختر انصاری کے قطعات میں تھرتھرا رہے تھے۔ فیض کی شاعری آج

کل کے مہذب نوجوانوں کے احساس اور طرزِ احساس کا بولتا ہوا ساز ہے۔ فیض کی تقلید کثرت سے ہوئی۔ اختر الایمان کا مجموعہ "گرداب" نمایاں طور پر "نقش فریادی" سے متاثر ہے۔ اختر الایمان کی لہولہان آواز میں وہ ٹھہراؤ اور تفکر کے وہ عناصر تو نہیں آسکے ہیں جو فیض کے یہاں ملتے ہیں اور نہ یوسف ظفر کے "زہر خند" اور "زنداں" میں فیض کا متفکرانہ اعتدال ملتا ہے لیکن اختر الایمان اور کچھ دوسرے شعراء نے جس انداز سے ہمارے نوجوانوں کی ٹریجڈی اور اقتصادی و رومانی زندگی کے ٹکراؤ کو پیش کیا ہے وہ موجودہ، بحرانی اور عبوری دور کی بہت حد تک سچی نمائندگی ہے۔

کلیم الدین احمد

فیض کے شعر میں قفس، چمن اور صبا۔ روایتی قفس، چمن اور صبا نہیں ہیں اور وعدہ و پیمان بھی نئے ہیں یعنی پرانے نقوش کا نئے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ یہ گویا ایک پردہ ہیں اور پس پردہ نئی سیاسی باتیں ہیں۔ غلامی اور آزادی کی باتیں ہیں اس لئے پیمانے نقوش کی ماہیت بدل گئی ہے۔ اب شعروں میں رنگ بہاراں، بزم حریفاں، محفل یاراں، شمع صحن چمن، نکہت دامن گل، باد صبا، اشک، ساون، باغباں، شاخ گل، نشیمن، صبح، سحر، شام کی باتیں ہیں۔ لیکن یہ پرانی باتیں نہیں۔ یہاں باتیں نئی ہیں، ہونے والے واقعات کی طرف اشارے ہیں پس پردہ سیاسی گفتگو ہے۔ یہ سب سہی، لیکن ایک کمی محسوس ہوتی ہے۔ پہلے ان نقوش کے معنی واضح اور متعین تھے۔ لیکن اب وہ کچھ مبہم سے ہو گئے ہیں ان میں پہلی سی وضاحت نہیں۔ ان کے مفہوم غیر متعین سے ہیں فیض کے شعر میں اسی قسم کی کمی ہے۔ قفس ہندوستان ہے، اہل قفس ہندوستانی ہیں، چمن بھی ہندوستان ہے۔ صبح چمن آزادی ہے، یا آزاد ہندوستان غلاموں کی آزادی میں آنکھ کھلے گی۔۔ باد صبا (Zeit Giest) (روح زمانہ) ہے۔ آزادی کی تمنا ہے وعدہ و پیماں اہل قفس اور باد صبا سے ہوئے ہیں یا کسی اور سے۔ (آنکھ کھلے گی آزاد ہوں گے) اس لئے ابھی بند ہے اور بند ہے تو پھر باد صبا سے وعدہ و پیماں کیسے ہوئے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ باتوں کا عام مفہوم تو سمجھ میں آجاتا ہے لیکن پہلی سی وضاحت اور تعین نہ ہونے کی وجہ سے باتیں مبہم سی رہ جاتی ہیں۔

مجنوں گورکھپوری

فیض ان لوگوں میں سے ہیں جو اردو غزل اور جدید اردو نظم دونوں میں ایک تاریخی اہمیت رکھتے ہیں۔ انھوں نے ہماری شاعری میں نئے امکانات پیدا کئے ہیں اور اس کے لئے بہت سی آزادیاں مہیا کی ہیں۔ نئی تحریک کو فروغ دینے میں ان کی شاعری کا بہت بڑا حصہ ہے لیکن بجائے خود وہ کسی شدید کیف یا کسی شدید قوت کے مالک نہیں۔ فیض کی اہمیت بھی اسلوبی اجتہادات پر مبنی ہے۔

ڈاکٹر سید اعجاز حسین

پنجاب کیا پوری اردو شاعری میں کلام کی اتنی قلیل ضخامت پر کسی نے اتنا نام نہیں پیدا کیا جتنا فیض احمد فیض نے۔ ان کا مجموعہ کلام مختصر ہے مگر اپنی گوناگوں خوبیوں کی وجہ سے جو کچھ ہے انتخاب معلوم ہوتا ہے۔ فن کاری اور ندرت تخیل کا اتنا حسین امتزاج دور جدید میں کسی شاعر کے یہاں دکھائی نہیں دیتا۔ سیدھے سادے الفاظ کو بغیر زیادہ تشبیہ و استعارے کے شعری صورت میں پیش کرنا اور تاثیر و معنویت پیدا کر دینا فیض کا خاص کارنامہ ہے اور یہی فیض کی شاعری کا امتیازی پہلو ہے جو ان کی نظموں میں قریب قریب ہر جگہ نظر آتا ہے۔

عزیز احمد

فیض کی شاعرانہ تشبیہوں اور تصویروں کا زندگی کی رفتار سے بہت گہرا تعلق ہے۔ یہ ان کی شاعری کی سب سے بڑی کامیابی اور خصوصیت ہے۔ "تنہائی" اور "موضوع سخن" میں جو غالباً ان کی بہترین نظمیں ہیں یہ خصوصیت اور نمایاں ہے۔ "تنہائی" میں استعارتاً گرد و پیش کا سارا ماحول شاعر کا ساتھ دیتا ہے۔

ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گذر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ

استعاروں کی سحرکاری، شاعر کے جذبہ کا اتنا ساتھ دیتی ہے کہ خارجی اور داخلی احساس ایک ہو جاتے ہیں اور فطرت اور انسان میں ایک حقیقی ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اسی طرح موضوع سخن میں یہ تشبیہ ؎

ان کا آنچل ہے کہ رخسار کہ پیراہن
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں

اس ایک شعر میں رمزی تشبیہ کی وجہ سے مشرقی شاعری کی حیات معاشقہ کی صدیاں آباد ہیں۔ کتنی پابندیاں، کتنے روک، کیسا صدیوں کا مسخ شدہ جمالی معیار اس شعر کے باطن سے جھانکتا ہے۔ یہ غالباً فیض کا بہترین شعر ہے۔

پروفیسر اختر انصاری

فیض احمد فیض اور ن۔م۔ راشد کی نظموں کے مجموعے "نقش فریادی" اور "ماورا" حال میں شائع ہونے والی کتابوں میں بہت اہمیت رکھتے ہیں کیوں کہ یہ دونوں اردو شاعری کے جدید ترین رجحانات کے اہم نمائندے ہیں۔

فیض اور راشد دونوں اس معنی میں پرانے شاعر ہیں کہ یہ اپنا موجودہ رنگ اختیار کرنے سے پہلے کچھ اسی پرانے رنگ میں کہہ چکے ہیں جو آج سے دس سال پہلے اردو کی نظمیہ شاعری کا عام رنگ تھا۔ یہ بات راشد پر زیادہ صادق آتی ہے کہ ان کی نظمیں اس زمانے میں بھی اردو رسائل کے لئے باعث زینت ہوتی تھیں جس زمانے میں جوش حفیظ اور اختر شیرانی اردو نظم کے جدید تر رجحانات کے علمبردار تھے۔ فیض نے غالباً بعد میں لکھنا شروع کیا ہے اور یقیناً راشد کے بہت بعد مشہور ہوئے۔ "نقش

فریادی" میں اور "ماورا" میں دونوں شاعروں کی پرانی تخلیقات کے نمونے موجود ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ نقش فریادی میں فیض کے پرانے رنگ کی چیزیں زیادہ ہیں نئے رنگ کی چیزیں کم ہیں اور ماورا میں راشد کے نئے رنگ کی چیزیں زیادہ ہیں پرانے رنگ کی چیزیں کم ہیں اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگر راشد کی شاعری نے اپنے ارتقاء کی منزلیں آہستہ آہستہ طے کیں تو فیض کی شاعری نے ایک طویل مدت تک ایک خاص روش پہ قائم رہنے کے بعد یک لخت ایک بہت بڑا قدم آگے بڑھایا اور دفعتاً ایک نیا اور چونکا دینے والا انداز اختیار کر لیا۔

فیض کی شاعری میں یہ اچانک تبدیلی جو ۱۹۳۸ء یا اس سے کچھ پہلے واقع ہوئی نتیجہ تھی ترقی پسند تحریک کے اثرات کا۔ تقریباً اسی زمانے میں راشد نے بھی اس تحریک کا کچھ اثر قبول کیا۔ پھر یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ترقی پسند تحریک نے راشد کو صرف ترقی پسند بنایا (وہ ایک بڑا شاعر پہلے ہی تھا) مگر فیض کو اس تحریک نے ترقی پسند بھی بنایا اور بڑا شاعر بھی۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اگر راشد ترقی پسندی کے اثرات قبول کرنے کے بعد بھی اپنے ابتدائی دور کے رومانی و فراری رجحانات سے پورے طور پہ آزاد نہیں ہو سکا ہے تو فیض (اپنی نئی نظموں میں) ترقی پسندانہ نظری شعور کا پورا ثبوت دیتا ہے۔

عابد علی عابد

فیض کی شعر گوئی کی خصوصیات کا پورا علم تبھی ہو سکتا ہے کہ آپ فیض سے ملیں اور اس کی ان مخلصانہ باتوں سے لطف اندوز ہوں جو چاندنی کی طرح نرم اور خنک محسوس ہوتی ہیں۔ فیض کے اشعار میں بھی جذبہ کتنا ہی شدید کیوں نہ ہو، کیفیت کتنی ہی نازک کیوں نہ ہو، جب وہ ان تمام مرحلوں سے گزر چکتی ہے جنھیں مجموعی طور پہ فیض کا تخلیقی شعور کہتے ہیں تو وہ ٹھنڈی ٹھنڈی دھیمی دھیمی آنچ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ اس کے مزاج کا توازن لفظوں کے توازن میں اور تراکیب کی شائستگی میں جھلکتا رہتا ہے جو بات فیض کو موجودہ عصر کے اکثر شعراء سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ درحقیقت جامع صفات انشاء پرداز ہے، انگریزی شعری روایات پہ مطلع، فارسی غزل کے مزاج سے آگاہ، عربی ادب کی باریکیوں کا راز دار۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے ہاں کبھی کبھی چونکا دینے والی تراکیب سامنے آجاتی ہے جس میں ایک جہان معانی پوشیدہ ہوتا ہے۔ اس کے اشعار میں تشبیہ، استعارہ، تلمیح اور ترکیب اجزائے تحسین کلام نہیں ہوتے بلکہ اظہار مطلب کے خوب صورت وسیلے ہوتے ہیں کہ پڑھنے والا جتنی جلدی ممکن ہو اس تخلیقی نقطہ مستنیر کے آس پاس جا پہونچے۔ جہاں سے فیض کی غزل یا فیض کے اشعار کی کرنیں پھوٹتی ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی

فیض پر روایت کے گہرے اثرات ہیں۔ اس لئے غزل میں پیچیدہ سے پیچیدہ تجربات کو پیش کرتے ہوئے بھی وہ اس روایت کے اثر سے کام لیتے ہیں۔ غزل کی روایت کو انہوں نے ایک نئی زندگی دی ہے لیکن نئی زندگی دے کر اسے نئے راستوں پر گامزن بھی کیا ہے۔ فیض کی غزلوں میں حقیقت کے اس امتزاج نے آہستہ روی کو تیزی و تندی سے ہم آہنگ کیا ہے۔ اس لئے انکے یہاں ایک ہی لے سنائی دیتی ہے۔

سردار جعفری

فیض سے اردو میں ایک نئے دبستان شاعری کا آغاز ہوتا ہے۔ یہ جدید مغربیت اور قدیم مشرقیت کا حسین امتزاج ہے جس نے اردو شاعری کو دو آتشہ بنا دیا ہے۔

عبدالرحمن چغتائی

فیض کی نظموں کی فضا اس عالمگیر فضا سے متاثر ہے جہاں انسان کو افتاد اور اس عظمت سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے جو شاعر کو اور ایک آرٹسٹ کو اپنے فن سے حاصل ہوتا ہے۔

احمد ندیم قاسمی

فیض کو ماضی کی ادبی روایات پر بڑا عبور حاصل ہے۔ وہ تلمیحیں اور رمزیں اور کیفیتیں جس سے ہماری کلاسیکی شاعری بھری پڑی ہے۔ فیض کے ہاں ذرا زیادہ بھرپور معنویت کے ساتھ اس لئے نظر آتی ہیں کہ وہ میر و سودا و غالب و مومن، حالی اور اقبال کی قائم کی ہوئی بڑھی ہوئی روایات کا احترام کرتا ہے اور اسے معلوم ہے کہ تراکیب و الفاظ کی بھی ایک تاریخ اور ایک روایت ہوتی ہے اور ہر لفظ کتنے ہی ادوار کی نازک جزئیات کو سمیٹے ہوئے ہم تک پہنچتا ہے۔ فیض کو الفاظ کی تاریخ کے شعور کے ساتھ ہی مسکراہٹوں، آنسوؤں اور امنگوں کی تاریخ کا بھی شعور ہے اور یہی وجہ ہے کہ فیض کی شاعری حسن معنیٰ کا بڑا حسین امتزاج ہے۔

"فیض کا لاابالی پن ان کی طبعی فراخ دلی اور بے نیازی کی غمازی کرتا ہے اور انہیں کسی چیز کی افادی قدر و قیمت کی کوئی پروا نہیں۔ اس کے صرف ان کی کتابیں ضرور مستثنیٰ ہیں جنہیں وہ بڑی حریصانہ نظروں سے دیکھتے ہیں اور انہیں اس طرح اپنے سینے سے لگا کر رکھتے ہیں، جیسے کوئی بندۂ زر اور بخیل اپنے مال و دولت پر اپنی جان نچھاور کر رہا ہو، لیکن کوئی شخص ان سے کتاب مانگتا ہے تو ان سے انکار بھی بن نہیں پڑتا۔ جب میں ان سے پوچھتی ہوں کہ "تم نے بلا سوچے سمجھے کتاب کیوں دے دی؟ معلوم نہیں اب وہ واپس بھی ملے گی یا نہیں؟" تو وہ بڑی متانت اور بزرجگی سے جواب دیتے ہیں۔ "جب تک کوئی اس کتاب کو پڑھتا ہے اسے دینے کا خطرہ مول لینے میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

- ایلس فیض

فیض کا کلام "نقش فریادی"

ایک رہگزر پر

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پنہاں
وہ حسن جس کی تمنا میں جنتیں پنہاں
ہزار فتنے تہ پائے ناز، خاک نشیں
ہر اک نگاہ خمار شباب سے رنگیں
شباب، جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں
وقار، جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں
ادائے لغزش پا پر قیامتیں قرباں
بیاضِ رخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں
سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم
طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم
وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے
وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہارِ لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش
گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سرو سہی نماز کرے
غرض وہ حسن جو محتاجِ وصف و نام نہیں
وہ حسن جس کا تصور بشر کا کام نہیں
کسی زمانے میں اس رہگزر سے گزرا تھا
بصد غرور و تجمل، ادھر سے گزرا تھا

آج کی رات

آج کی رات سازِ دردنہ چھیڑ
دکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم؟
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود
ہو نہ ہو اب سحر، کسے معلوم؟
زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات
آج کی رات سازِ دردنہ چھیڑ
اب نہ دہرا فسانہ ہائے الم
اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اتار دے دل سے
عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں مت پوچھ
آج کی رات سازِ دردنہ چھیڑ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
میں نے سمجھا کہ تو ہے تو درخشاں ہے حیات
تیرا غم ہے تو غم دہر کا جھگڑا کیا ہے
تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات
تیری آنکھوں کے سوا دنیا میں رکھا کیا ہے؟
تو جو مل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے
یوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یوں ہو جائے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
ان گنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

سوچ

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے
کیوں خاموش رہا کرتا ہوں
چھوڑو میری رام کہانی
میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

میرا دل غمگیں ہے تو کیا
غمگیں یہ دنیا ہے ساری
یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

غم ہر حالت میں مہلک ہے
اپنا ہو یا اور کسی کا
رونا دھونا، جی کو جلانا
یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں
بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

رقیب سے!

آ کہ وابستہ ہیں اس حسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی الفت میں بھلا رکھی تھی دنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اسی رعنائی کے
جس کی ان آنکھوں نے بے سود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عمر گنوا دی ہم نے

ہم پہ مشترکہ ہیں احسان غم الفت کے
اتنے احسان کہ گنواؤں تو گنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دکھ درد کے معنی سیکھے
زیر دستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رخ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بکتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار ! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہو گا ، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات ، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزر
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں ، کوئی نہیں آئے گا

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان ! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں ، تڑپ لیں ، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے ، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مفلس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں
لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں
اک ذرا صبر کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

کتے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کتے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ ان کا
جہاں بھر کی دھتکار ان کی کمائی

نہ آرام شب کو ، نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر ، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اکتا کے مر جانے والے

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے

یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنا لیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبا لیں
کوئی ان کو احساسِ ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

بول۔۔۔

بول ، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول ، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے ، سرخ ہے آہن

موضوعِ سخن

گل ہوئی جاتی ہے افسردہ سلگتی ہوئی شام
دھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات
اور مشتاق نگاہوں کی سنی جائے گی
اور ان ہاتھوں سے مس ہوں گے یہ ترسے ہوئے ہات
ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے
کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چلمن رنگیں
جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں
ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں
آج پھر حسن دلآرا کی وہی دھج ہو گی
وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر
رنگ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
اپنے افکار کی، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی، شاہدِ معنیٰ ہے یہی
آج تک سرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی، اجداد پہ کیا گزری ہے؟

ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے؟
یہ حسیں کھیت، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا!
کس لئے ان میں فقط بھوک اگا کرتی ہے
یہ ہر اک سمت پر اسرار کڑی دیواریں
جل بجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے

اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

غزلیں

ہمت التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلہ نہیں باقی

اک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی

اپنی مشق ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی

تیری چشم الم نواز کی خیر
دل میں کوئی گلا نہیں باقی

ہو چکا ختم عہد ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

ویراں ہے میکدہ، خم و ساغر اداس ہیں
تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

اک فرصت گناہ، وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیئے تھے وہ آج فیض
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے

نصیب آزمانے کے دن آ رہے ہیں
قریب ان کے آنے کے دن آ رہے ہیں

جو دل سے کہا ہے، جو دل سے سنا ہے
سب ان کو سنانے کے دن آ رہے ہیں

ابھی سے دل و جاں سر راہ رکھ دو
کہ لٹنے لٹانے کے دن آ رہے ہیں

ٹپکنے لگی ان نگاہوں سے مستی
نگاہیں چرانے کے دن آ رہے ہیں

صبا پھر ہمیں پوچھتی پھر رہی ہے
چمن کو سجانے کے دن آ رہے ہیں

چلو فیض پھر سے کہیں دل لگائیں
سنا ہے ٹھکانے کے دن آ رہے ہیں

فیض کا کلام "دستِ صبا"

قطعہ

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

صبح آزادی

(اگست ۱۹۴۷ء)

یہ داغ داغ اجالا ، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا ، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہوگا شب سست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رکے گا سفینۂ غم دل

جواں لہو کی پراسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیار حسن کی بے صبر خواب گاہوں سے
پکارتی رہیں باہیں ، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رخ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینان نور کا دامن
سبک سبک تھی تمنا ، دبی دبی تھی تھکن

سنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور
سنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہل درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذاب ہجر حرام

جگر کی آگ ، نظر کی امنگ ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگار صبا ، کدھر کو گئی
ابھی چراغ سر رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانی شب میں کمی نہیں آئی
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

لوح و قلم

ہم پرورش لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسباب غم عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیٔ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخی ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہل ستم ، مشق ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی ، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت رہے، تو ہم سرخی مے سے
تزئین در و بام حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے

ایک طرز تغافل ہے سو وہ ان کو مبارک
اک عرض تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے
اے خاک نشینو اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں، سر بھی بہت
چلتے بھی رہو، کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو، چپ رہنے والو چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

ایرانی طلبہ کے نام

جو امن اور آزادی کی
جدوجہد میں کام آئے

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو
اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن،
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی ہیں
یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی
بھرپور جوانی کا کندن
یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے
یوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے
اے ارضِ عجم، اے ارضِ عجم!
کیوں نوچ کے ہنس ہنس پھینک دیئے
ان آنکھوں نے اپنے نیلم
ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں
ان ہاتوں کی ''بے کل چاندی
کس کام آئی، کس ہاتھ لگی؟''

''اے پوچھنے والے پردیسی!
یہ طفل و جواں
اس نور کے نورس موتی ہیں
اس آگ کی کچی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من، تن تن،
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجاں
جگ مگ جگ مگ، رخشاں رخشاں
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!''

نثار میں تیری گلیوں کے۔۔۔۔

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے
ہے اہل دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جو کے لیے
جو چند اہل جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہل ہوس، مدعی بھی، منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں
مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہو گی
چمک اٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رخ پر بکھر گئی ہو گی
غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ الجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ ان کی رسم نئی، نہ اپنی ریت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھول
نہ ان کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی
اسی سبب سے فلک کا گلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دل برا نہیں کرتے

گر آج تجھ سے جدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا استوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا ، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا ، سو چھوٹ گیا

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

شاید کہ انھی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغر دل ہے جس میں کبھی
صد ناز سے اُترا کرتی تھی
صہبائے غم جاناں کی پری

پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کر پھوڑ دیا
جو مے تھی بہادی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا

یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
ان شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے

❋ غزلیں ❋

تم آئے ہو، نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے

چمن پہ غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محروم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق ولب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے ابھرنے لگتے ہیں

غزل

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

بکھری اک بار تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم
دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے

دستِ صیاد بھی عاجز، ہے کفِ گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یونہی دم بھر کو رکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

نذرِ غالب

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں

بہار آئے گی جب آئے گی، یہ شرط نہیں
کہ تشنہ کام رہیں گرچہ بادہ رکھتے ہیں

تری نظر کا گلہ کیا؟ جو ہے گلہ دل کا
تو ہم سے ہے، کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

نہیں شراب سے رنگیں تو غرقِ خوں ہیں کہ ہم
خیالِ وضعِ قمیص و لبادہ رکھتے ہیں

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

جوابِ واعظِ چابک زباں میں فیض ہمیں
یہی بہت ہیں جو دو حرفِ سادہ رکھتے ہیں

فیض کا کلام ’’زنداں نامہ‘‘

ملاقات

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے ، تجھ سے عظیم تر ہے
عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب اس کے سائے
میں اپنا سب نور ، رو گئے ہیں

یہ رات اس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے
مگر اسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے

گرے ہیں ، اور تیرے گیسوؤں میں
الجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اسی کی شبنم سے خاموشی کے
یہ چند قطرے ، تری جبیں پر
برس کے ، ہیرے پرو گئے ہیں

(۲)

بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اسی سیاہی میں رونما ہے
وہ نہر خوں جو مری صدا ہے

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

(ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی)

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھلی تیری راہوں میں شام ستم
ہم چلے آئے ، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل ، دل میں قندیل غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں پہ مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری الفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چن کر ہمارے علم
اور نکلیں گے عشاق کے قافلے

درد آئے گا دبے پاؤں...

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے

شعلہ درد جو پہلو میں لپک اٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اٹھے گا

حلقہ زلف کہیں گوشہ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشن دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل
یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا
یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا
اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا
مشتعل ہو کے ابھی اٹھیں گے وحشی سائے
یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے
رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہوگا
جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل
دشمن جاں ہیں بھی، سارے کے سارے قاتل
یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی
درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل

بنیاد کچھ تو ہو

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا

رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دشنام، لالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

منٹگمری جیل
۱۲/اپریل ۵۵ء

قطعہ

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

❋

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگ رخسار کی پھوہار گری
رات چھائی تو روئے عالم پہ
تیری زلفوں کی آبشار گری

تمام شب دل وحشی تلاش کرتا ہے
ہر اک صدا میں ترے حرفِ لطف کا آہنگ
ہر ایک صبح ملاتی ہے بار بار نظر
ترے دہن سے ہر اک لالہ و گلاب کا رنگ

❋

تمہارے حسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر
تمہاری یاد سے دل ہمکلام رہتا ہے
رہی فراغت ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

(حیدرآباد جیل-۱۹۵۱ء)

غزلیں

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

تھے شبِ ہجر، کام اور بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں فیض
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

شام فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آکے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزم خیال میں ترے حسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہم سفر فیض نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

(جولائی ۱۹۵۳ء جناح ہسپتال کراچی)

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب بات میں تیرا بات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں

مشکل ہیں اگر حالات وہاں دل بیچ آئیں جاں دے آئیں
دل والو کوچہ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا، ہارے بھی تو بازی مات نہیں

ہم پر تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دشنام تو نہیں ہے، یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فضول و الفت ناکام ہی تو ہے

دل مدعی کے حرفِ ملامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دل نا امید تو نہیں، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یار خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات فیض غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

(منٹگمری جیل، ۹ر مارچ ۵۴ء)

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شبِ ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام، فیض، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

(منٹگمری جیل، ۲۹ر جنوری ۵۴ء)

غزلیں

گرمیٔ شوقِ نظارا کا اثر تو دیکھو
گل کھلے جاتے ہیں وہ سایۂ در تو دیکھو

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو، راہگزر تو دیکھو

وہ تو وہ ہے، تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

وہ جو اب چاکِ گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی ان کا جگر تو دیکھو

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اک دن دلِ پرخوں کا ہنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا افق
فیض تابندگیٔ دیدۂ تر تو دیکھو

(منٹگمری جیل، ۴ر مارچ ۵۷ء)

فیض کا کلام ''دستِ تہ سنگ''

قطعہ

یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

❋

میخانوں کی رونق ہیں، کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلداریِ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سل گئے ہونٹ، کوئی زخم سلے یا نہ سلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھل گئے زخم، کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے

❋

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دلِ عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دنوں
کھلتی ہے صبحِ گل کی طرح رنگ و بو سے پر
ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا
دل آرزو سے پر کرو، آنکھیں لہو سے پر

❋

ان دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا، قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورتِ بربادیِ یاراں کیا ہے

جشن کا دن

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سلاؤ کہ جشن کا دن ہے

تنک مزاج ہے ساقی نہ رنگ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیز رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہے انتظار ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورشِ غمِ دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے

(مارچ ۱۹۵۷ء)

کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر میں لٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی!
ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
کوئی اس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اس وقت طور کہ پچھتاؤ گے
اس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتہ واماندگیٔ آخرِ شب
بھول کر ساعت درماندگیٔ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

(دسمبر ۱۹۶۱ء)

جب تیری سمندر آنکھوں میں

(گیت)

یہ دھوپ کنارا، شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دھواں
اس دھوپ کنارے، پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک

زہر کا رنگ، لہو رنگ، شب تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے،
کوئی بھیگا ہوا دامن، کوئی دکھتی ہوئی رگ
کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ، کوئی رت، کوئی شے
ایک جگہ پر ٹھہرے،
پھر سے اک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے
آسماں حدِ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے

(ماسکو، اگست ۱۹۶۲ء)

پاس رہو

تم مرے پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے،
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہم مشک لیے، نشتر الماس لیے
بین کرتی ہوئی ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل
آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں
آس لیے
اور بچوں کے بلکنے کی طرح قلقل مے
بہر ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی، سنسان، سیہ رات چلے
پاس رہو
میرے قاتل، مرے دلدار مرے پاس رہو!

(ماسکو ۱۹۶۳ء)

غزل

بے دم ہوئے بیمار دوا کیوں نہیں دیتے
تم اچھے مسیحا ہو شفا کیوں نہیں دیتے

دردِ شب ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے
خونِ دلِ وحشی کا صلا کیوں نہیں دیتے

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں نکتہ ورو لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں نغمہ گرو ساز صدا کیوں نہیں دیتے

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے

بربادیٔ دل جبر نہیں فیض کسی کا
وہ دشمن جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے

(لاہور جیل، ۳۱ر دسمبر ۱۹۵۸ء)

غزلیں

کب ٹھہرے گا درد اے دل کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے سنتے تھے سحر ہوگی

کب جان لہو ہوگی ، کب اشک گہر ہوگا
کس دن تری شنوائی اے دیدۂ تر ہو گی

کب مہکے گی فصل گل کب بہکے گا مے خانہ
کب صبح سخن ہوگی کب شام نظر ہوگی

واعظ ہے نہ زاہد ہے ، ناصح ہے نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کس طرح بسر ہوگی

کب تک ابھی رہ دیکھیں اے قامتِ جانانہ
کب حشر معین ہے تجھ کو تو خبر ہوگی

تری امید ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت ، نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے ترے سبب سے ہے

ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے ، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب ، تیرے رنگ لب سے ہے

کہاں گئے شب فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہم کلام کب سے ہے

(بمبئی ۱۹۵۷ء)

شرح فراق ، مدح لب مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں

یار آشنا نہیں کوئی ٹکرائیں کس سے جام
کس دل ربا کے نام پہ خالی سبو کریں

سینے پہ ہاتھ ہے ، نہ نظر کو تلاش بام
دل ساتھ دے تو آج غم آرزو کریں

کب تک سنے گی رات ، کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے روبرو کریں

ہمدم حدیث کوئے ملامت سنائیو
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں

آشفتہ سر ہیں ، محتسبو ، منہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکر دل و جاں عدو کریں

"تر دامنی پہ شیخ ، ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"

فیض کا کلام ''سرِ وادیٔ سینا''

انتساب

آج کے نام
اور
آج کے غم کے نام
آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا
زرد پتوں کا بن
زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے
درد کی انجمن جو مرا دیس ہے
کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں، والیٔ ماسوا، نائب اللہ فی الارض
دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے
ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی ہے
دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی ہے
جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے
دھجیاں ہو گئی ہے
ان دکھی ماؤں کے نام
رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور
نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں میں سنبھلتے نہیں
دکھ بتاتے نہیں
منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

ان حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھل کھل کے
مرجھا گئے ہیں
ان بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبت ریا کار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے ہیں
بیواؤں کے نام
''کٹڑیوں'' اور گلیوں، محلوں کے نام
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند راتوں
کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو
جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا
آنچلوں کی حنا
چوڑیوں کی کھنک
کاکلوں کی مہک
آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بو

پڑھنے والوں کے نام
وہ جو اصحابِ طبل و علم
کے دروں پر کتاب اور قلم
کا تقاضا لیے، ہاتھ پھیلائے
پہنچے، مگر لوٹ کر گھر نہ آئے
وہ معصوم ہو بھولپن میں
وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
لے کے پہنچے جہاں
بٹ رہے تھے، گھٹا ٹوپ، بے انت راتوں کے سائے

ان اسیروں کے نام
جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے ہیں
آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے ہیں

(نا تمام)

سر وادیٔ سینا

(عرب اسرائیل جنگ کے بعد)

پھر برق فروزاں ہے سر وادیٔ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت
اے دیدۂ بینا
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے
پھر برق فروزاں ہے سر وادیٔ سینا، اے دیدۂ بینا
پھر دل کو مصفا کرو، اس لوح پہ شاید
مابینِ من و تو نیا پیماں کوئی اترے
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اترے

دُعا

آیئے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدا یاد نہیں

آیئے عرض گذاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیٔ فردا بھر دے
وہ جنہیں تابِ گراں باریٔ ایام نہیں
ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی راہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے

جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے ان کو
ہمتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سرِ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

(۱۴ر اگست ۱۹۶۷ء)

دلدار دیکھنا

طوفاں بہ دل ہے ہر کوئی دلدار دیکھنا
گل ہو نہ جائے مشعلِ رخسار دیکھنا
آتش بہ جاں ہے ہر کوئی سرکار دیکھنا
لو دے اٹھے نہ طرۂ طرار دیکھنا
جذبِ مسافرانِ رہِ یار دیکھنا
سر دیکھنا، نہ سنگ، نہ دیوار دیکھنا
کوئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آ گئے تو گرمیِ بازار دیکھنا
اس دل نواز شہر کے اطوار دیکھنا
بے التفات بولنا، بیزار دیکھنا
خالی ہیں گرچہ مسند و منبر نگوں ہے خلق
رعبِ قبا و ہیبتِ دستار دیکھنا
جب تک نصیب تھا ترا دیدار دیکھنا
جس سمت دیکھنا، گل و گلزار دیکھنا
پھر ہم تمیزِ روز و مہ سال کر سکیں
اے یادِ یار پھر ادھر اک بار دیکھنا

(۱۹۶۷ء)

حذر کرو مرے تن سے

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ
کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا
مرے نزار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
چراغ ہو کوئی روشن نہ کوئی جام بھرے
نہ اس سے آگ ہی بھڑکے نہ اس سے پیاس بجھے
مرے فگار بدن میں لہو ہی کتنا ہے
مگر وہ زہرِ ہلاہل بھرا ہے نس نس میں
جسے بھی چھیدو ہر اک بوند قہرِ افعی ہے
ہر اک کشید ہے صدیوں کے درد و حسرت کی
ہر اک میں مہر بلب غیظ و غم کی گرمی ہے
حذر کرو مرے تن سے یہ ستم کا دریا ہے
حذر کرو کہ مرا تن وہ چوبِ صحرا ہے
جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے

بجائے سرو و سمن میری ہڈیوں کے ببول
اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی
بجائے مشکِ صبا، میری جانِ زار کی دھول
حذر کرو کہ مرا دل لہو کا پیاسا ہے

(مارچ ۱۹۷۱ء)

میں تیرے سپنے دیکھوں

برکھا برسے چھت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں
برف گرے پربت پر، میں تیرے سپنے دیکھوں
صبح کی نیل پری، میں تیرے سپنے دیکھوں
کویل دھوم مچائے، میں تیرے سپنے دیکھوں
آئے اور اڑ جائے، میں تیرے سپنے دیکھوں
باغوں میں پتے مہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں
شبنم کے موتی دہکیں، میں تیرے سپنے دیکھوں
اس پیار میں کوئی دھوکا ہے
تو نار نہیں کچھ اور ہے شے
ورنہ کیوں ہر ایک سمے
میں تیرے سپنے دیکھوں

داغستانی خاتون اور شاعر بیٹا

اس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
اس کی ہر بات میں سمجھتی تھی
اب وہ شاعر بنا ہے نام خدا
لیکن افسوس کوئی بات اس کی
میرے پلے ذرا نہیں پڑتی

بہ نوکِ شمشیر

میرے آباء کہ تھے نامحرم طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم
نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر
روشنائی سے جو میں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم
سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہو سے تحریر

آرزو

مجھے معجزوں پہ یقیں نہیں مگر آرزو ہے کہ جب قضا
مجھے بزمِ دہر سے لے چلے
تو پھر ایک بار یہ اذن دے
کہ لحد سے لوٹ کے آسکوں
ترے در پہ آکے صدا کروں
تجھے غمگسار کی ہو طلب تو ترے حضور میں آرہوں
یہ نہ ہو تو سوئے رہِ عدم میں پھر ایک بار روانہ ہوں

سالگرہ

شاعر کا جشن سالگرہ ہے، شراب لا
منصب، خطاب، رتبہ انھیں کیا نہیں ملا
بس نقص ہے تو اتنا کہ ممدوح نے کوئی
مصرع کسی کتاب کے شایاں نہیں لکھا

(ایک چٹان کے لئے)

کتبہ

جوان مردی اسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بزدلی نے جست کی تھی

قطعات

زنداں زنداں شورِ انا الحق، محفل محفل قلقلِ مے
خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر
دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی
قریہ قریہ جشن بپا ہے، ماتم شہر بہ شہر

❋

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے
کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو
اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب ان کے حضور
دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

❋

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیمان بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

غزل

کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک رہ دکھلاؤ گے
کب تک چین کی مہلت دو گے کب تک یاد نہ آؤ گے

بیتا دید اُمید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے دردکا بادل، کب برکھا برساؤ گے

عہد وفا یا ترکِ محبت، جو چاہو سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے

کس نے وصل کا سورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے، ان کو کیا جتلاؤ گے

فیض دلوں کے بھاگ میں ہے، گھر بھرنا بھی لٹ جانا بھی
تم اس حسن کے لطف و کرم پر کتنے دن اتراؤ گے

فیض کا کلام "شامِ شہرِ یاراں"

پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو

ہم کیا کرتے کس رہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
ان رشتوں کے جو چھوٹ گئے
ان صدیوں کے یارانوں کے
جو اک اک کر کے ٹوٹ گئے
جس راہ چلے ، جس سمت چلے
یوں پاؤں لہولہان ہوئے
سب دیکھنے والے کہتے تھے
یہ کیسی ریت رچائی ہے
یہ مہندی کیوں لگائی ہے
وہ کہتے تھے ، کیوں قحطِ وفا
کا ناحق چرچا کرتے ہو
پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو!
یہ راہیں جب اٹ جائیں گی
سو رستے ان سے پھوٹیں گے
تم دل کو سنبھالو جس میں ابھی
سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے

سجاد ظہیر کے نام

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گل کریں گے
نہ اب مل کر سرِ مقتل چلیں گے
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خونِ دل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غمہائے وطن پر اشکباری
سنیں گے نغمۂ زنجیر مل کر
نہ شب بھر مل کے چھلکائیں گے ساغر
"بنامِ شاہدِ نازک خیالاں"
بیادِ مستیٔ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایامِ زنداں
صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا آغازِ تبسم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے
سحرگہ اب اسی کے نام ساقی
کریں اتمامِ دورِ جامِ ساقی
بساطِ بادہ و مینا اٹھا لو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو

تم اپنی کرنی کر گزرو

اب کیوں اُس دن کا ذکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
جو کچھ پایا کھو جائے گا
جو مل نہ سکا وہ پائیں گے

یہ دن تو وہی پہلا دن ہے
جو پہلا دن تھا چاہت کا
ہم جس کی تمنا کرتے رہے
اور جس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دن تو کتنی بار آیا
سو بار بسے اور اُجڑ گئے
سو بار لٹے اور بھر پایا

اب کیوں اُس دن کی فکر کرو
جب دل ٹکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مٹ جائیں گے
تم خوف و خطر سے درگزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے
گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تم اپنی کرنی کر گزرو
جو ہو گا دیکھا جائے گا

موری اَرج سنو

(نذرِ خسرو)

"موری ارج سنو دست گیر پیر"
"مائی ری کہوں کاسے میں
اپنے جیا کی پیر"
"نیا باندھو رے،
باندھو رے کنار دریا"
"مورے مندر اب کیوں آئے"

اس صورت سے
عرض سناتے،
درد بتاتے
نیا کھیتے
منت کرتے
رستہ تکتے
کتنی صدیاں بیت گئی ہیں
اب جا کر یہ بھید کھلا ہے
جس کو تم نے عرض گزاری
جو تھا ہاتھ پکڑنے والا
جس جا لاگی ناؤ تمھاری
جس سے دکھ کا دارو مانگا
تورے مندر میں جو نہیں آیا
وہ تو تمھیں تھے
وہ تو تمھیں تھے

(ستمبر ۱۹۷۵ء)

کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا ، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام الجھتا رہا
پھر آخر تنگ آ کر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

امیدِ سحر کی بات سنو

جگر دریدہ ہوں چاک جگر کی بات سنو
الم رسیدہ ہوں دامانِ تر کی بات سنو
زباں بریدہ ہوں زخمِ گلو سے حرف کرو
شکستہ پا ہوں ملالِ سفر کی بات سنو
مسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سنو
سحر کی بات ، امیدِ سحر کی بات سنو

ناظم حکمت[1]

(زنداں سے ایک خط)

مری جاں تجھ کو بتلاؤں، بہت نازک یہ نکتہ ہے
بدل جاتا ہے انساں جب مکاں اس کا بدلتا ہے!
مجھے زنداں میں پیار آنے لگا ہے اپنے خوابوں پر
جو شب کو نیند اپنے مہرباں ہاتھوں سے
وا کرتی ہے در اس کا
تو آ گرتی ہے ہر دیوار اس کی میرے قدموں پر
میں ایسے غرق ہو جاتا ہوں اس دم اپنے خوابوں میں
کہ جیسے اِک کرن ٹھہرے ہوئے پانی پہ گرتی ہے
میں ان لمحوں میں کتنا سرخوش و دلشاد پھرتا ہوں
جہاں کی جگمگاتی وسعتوں میں کس قدر آزاد پھرتا ہوں
جہاں درد و الم کا نام ہے کوئی نہ زنداں ہے
"تو پھر بیدار ہونا کس قدر تم پر گراں ہوگا؟"
نہیں ایسا نہیں ہے، میری جاں! میرا یہ قصہ ہے
میں اپنے عزم و ہمت سے
وہی کچھ بخشتا ہوں نیند کو جو اس کا حصہ ہے

[1] ترکی کا شہرہ آفاق شاعر جس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی کی جنگ حریت میں حصہ لیا اور بعد میں بیشتر عمر قید و بند اور جلاوطنی میں گزاری۔ ۱۹۶۳ء میں وفات پائی۔

مرثیۂ امام

رات آئی ہے شبیر پہ یلغارِ بلا ہے
ساتھی نہ کوئی یار نہ غمخوار رہا ہے
مونس ہے تو اک درد کی گھنگھور گھٹا ہے
مشفق ہے تو اک دل کے دھڑکنے کی صدا ہے
تنہائی کی، غربت کی، پریشانی کی شب ہے
یہ خانۂ شبیر کی ویرانی کی شب ہے

دشمن کی سپہ خواب میں مدہوش پڑی تھی
پل بھر کو کسی کی نہ ادھر آنکھ لگی تھی
ہر ایک گھڑی آج قیامت کی گھڑی تھی
یہ رات بہت آلِ محمدؐ پہ کڑی تھی
رہ رہ کے بکا اہلِ حرم کرتے تھے ایسے
تھم تھم کے دیا آخرِ شب جلتا ہے جیسے

اک گوشے میں ان سوختہ سامانوں کے سالار
اِن خاک بسر، خانماں ویرانوں کے سردار
تشنہ لب و درماندہ و مجبور و دل افگار
اس شان سے بیٹھے تھے شہِ لشکرِ احرار
مسند تھی، نہ خلعت تھی، نہ خدام کھڑے تھے
ہاں تن پہ جدھر دیکھئے سو زخم سجے تھے

کچھ خوف تھا چہرے پہ نہ تشویش ذرا تھی
ہر ایک ادا مظہرِ تسلیم و رضا تھی
ہر ایک نگہ شاہدِ اقرارِ وفا تھی
ہر جنبشِ لب منکرِ دستورِ جفا تھی
پہلے تو بہت پیار سے ہر فرد کو دیکھا
پھر نام خدا کا لیا اور یوں ہوئے گویا

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل
الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہوئی نازل
بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل
وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل
بازی ہوئی انجام، مبارک ہو عزیزو
باطل ہوا ناکام، مبارک ہو عزیزو

گیت

منزلیں، منزلیں
شوقِ دیدار کی منزلیں،
حسن دلدار کی منزلیں، پیار کی منزلیں،
پیار کی بے پنہ رات کی منزلیں،
کہکشانوں کی بارات کی منزلیں،
سر بلندی کی ہمت کی، پرواز کی
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں
زندگی کی کٹھن راہ کی منزلیں
سر بلندی کی، ہمت کی، پرواز کی منزلیں
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں،
آن ملنے کے دن
پھول کھلنے کے دن
وقت کے گھور ساگر میں صبح کی
شام کی منزلیں،
چاہ کی منزلیں،
آس کی، پیاس کی،
حسرتِ یار کی
پیار کی منزلیں،
منزلیں حسن عالم کے گلزار کی
منزلیں، منزلیں
موج در موج ڈھلتی ہوئی رات کے درد کی منزلیں
چاند تاروں کے ویران سنسار کی منزلیں،
اپنی دھرتی کے آباد بازار کی منزلیں
حق کے عرفان کی
نور انوار کی منزلیں،
وصل دلدار کی منزلیں
قول و اقرار کی منزلیں،
منزلیں، منزلیں

(فلم "قسم اس وقت کی")

گیت

اب کیا دیکھیں راہ تمھاری
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات
تھم گئے آنسو
تھک گئیں اکھیاں
گزر گئی برسات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو
چھوڑو غم کی بات
کب سے آس لگی درشن کی
کوئی نہ جانے بات
کوئی نہ جانے بات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات
تم آؤ تو من میں اترے
پھولوں کی بارات
بیت چلی ہے رات
اب کیا دیکھیں راہ تمھاری
بیت چلی ہے رات

(فلم: جاگو ہوا سویرا)

فیض کا کلام "مرے دل مرے مسافر"

دلِ من مسافرِ من

مرے دل ، مرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہو ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر ، کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا

گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو ملاقات کے بعد
اپنا احساسِ زیاں اور زیادہ ہوگا
ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
ان کہی باتوں کا موہوم سا پردہ ہوگا
کوئی اقرار نہ میں یاد دلاؤں گا نہ تم
کوئی مضمونِ وفا کا نہ جفا کا ہوگا

گردِ ایام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں
تم جو چاہو تو سنو ، اور جو نہ چاہو نہ سنو
اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تم جو چاہو تو کہو ، اور جو نہ چاہو نہ کہو

لاؤ تو قتل نامہ مرا

سننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہوئی
تہمت تمہارے عشق کی ہم پر لگی ہوئی
رندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہوئی
آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سو
کس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہوئی
آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازیِ میانِ قاتل و خنجر لگی ہوئی
"لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی"

تین آوازیں

ظالم

جشن ہے ماتم امید کا آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
عدم آباد کو آباد کیا ہے میں نے
تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے میں نے
جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو
بسترِ خواب سے کیا چاہتے ہو
ساری آنکھوں کو تہِ تیغ کیا ہے میں نے
سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے میں نے
اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھولوں کی حنا
فصلِ گل آئے گی نمرود کے انگار لیے
اب نہ برسات میں برسے گی گہر کی برکھا
ابر آئے گا خس و خار کے انبار لیے
میرا مسلک بھی نیا راہِ طریقت بھی نئی
میرے قانوں بھی نئے میری شریعت بھی نئی
اب فقیہانِ حرم دستِ صنم چومیں گے
سرو قد مٹی کے بونوں کے قدم چومیں گے
فرش پر آج درِ صدق و صفا بند ہوا
عرش پر آج ہر اک بابِ دعا بند ہوا

مظلوم

رات چھائی تو ہر اک درد کے دھارے
چھوٹے صبح پھوٹی تو ہر اک زخم کے ٹانکے ٹوٹے
دوپہر آئی تو ہر رگ نے لہو برسایا
دل ڈھلا، خوف کا عفریت مقابل آیا
یا خدا یہ مری گردانِ شب و روز و سحر
یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر
کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تو نے
ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تو نے
وہ یہ کہتے ہیں تو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے
وہ یہ کہتے ہیں ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں؟
ان کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں؟

ندائے غیب

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اٹھے گا جب جمعِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے
کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی
یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اٹھے گا شورِ محشر
یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

(سمرقند - مئی ۱۹۷۹ء)

کیا کریں

مری تری نگاہ میں
جو لاکھ انتظار ہیں
جو میرے تیرے تن بدن میں
لاکھ دل فگار ہیں
جو میری تیری انگلیوں کی بے حسی سے
سب قلم نزار ہیں
جو میرے تیرے شہر کی
ہر اک گلی میں
میرے تیرے نقشِ پا کے بے نشاں مزار ہیں
جو میری تیری رات کے
ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کے
گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا
یہ چاک سارے بے رفو
کسی پہ راکھ چاند کی
کسی پہ اوس کا لہو
یہ ہے بھی یا نہیں، بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوتِ وہم کا بنا ہوا
جو ہے تو اس کا کیا کریں
نہیں ہے تو بھی کیا کریں
بتا، بتا،
بتا، بتا،

نذرِ حافظ

ناصحم گفت بجز غم چہ ہنر دارد عشق
بروا ے خواجہ عاقل ہنرے بہتر ازیں

قندِ دہن، کچھ اس سے زیادہ
لطفِ سخن، کچھ اس سے زیادہ

فصلِ خزاں میں لطفِ بہاراں
برگِ سمن کچھ اس سے زیادہ

حالِ چمن پر تلخ نوائی
مرغِ چمن، کچھ اس سے زیادہ

دو نظمیں فلسطین کے لیے

فلسطینی بچے کیلیے لوری

مت رو بچے
رو رو کے ابھی
تیری امی کی آنکھ لگی ہے
مت رو بچے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابا نے
اپنے غم سے رخصت لی ہے
مت رو بچے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی پیچھے
دور کہیں پردیس گیا ہے
مت رو بچے
تیری باجی کا
ڈولا پرائے دیس گیا ہے
مت رو بچے
تیرے آنگن میں
مردہ سورج نہلا کے گئے ہیں
چندرما دفنا کے گئے ہیں
مت رو بچے
امی ، ابا ، باجی ، بھائی
چاند اور سورج
تو گر روئے گا تو یہ سب
اور بھی تجھ کو رلوائیں گے
تو مسکائے گا تو شاید
سارے اک دن بھیس بدل کر
تجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے

(بیروت ۱۹۸۰ء)

فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے

میں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے
تیری الفت ، تری یادوں کی کسک ساتھ گئی
تیرے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی
سارے ان دیکھے رفیقوں کا جلو ساتھ رہا
کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش مرا ہاتھ رہا
دور پردیس کی بے مہر گزر گاہوں میں
اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں
جس زمیں پر بھی کھلا میرے لہو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

(بیروت ۱۹۸۰ء)

غزلیں

(مخدوم کی یاد میں)

"آپ کی یاد آتی رہی رت بھر"
چاندنی دل دکھاتی رہی رات بھر

گاہ جلتی ہوئی ، گاہ بجھتی ہوئی
شمع غم جھلملاتی رہی رات بھر

کوئی خوشبو بدلتی رہی پیرہن
کوئی تصویر گاتی رہی رات بھر

پھر صبا سایۂ شاخِ گل کے تلے
کوئی قصہ سناتی رہی رات بھر

جو نہ آیا اسے کوئی زنجیر در
ہر صدا پر بلاتی رہی رات بھر

ایک امید سے دل بہلتا رہا
اک تمنا ستاتی رہی رات بھر

"اسی انداز سے چل بادِ صبا آخر شب"

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخر شب
دل میں بکھری ہوئی خوشبوئے قبا آخر شب

صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخر شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخر شب

چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخر شب
کون کرتا ہے وفا عہد وفا آخر شب

لمس جانانہ لیے ، مستی پیمانہ لیے
حمد باری کو اٹھے دست دعا آخر شب

گھر جو ویراں تھا سر شام وہ کیسے کیسے
فرقت یار نے آباد کیا آخر شب

جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اول صبح
"اسی انداز سے چل بادِ صبا آخر شب"

فیض کا کلام ''غبارِ ایام''

تم ہی کہو کیا کرنا ہے

جب دکھ کی ندیا میں ہم نے
جیون کی ناؤ ڈالی تھی
تھا کتنا کس بل بانہوں میں
لوہو میں کتنی لالی تھی
یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے
اور ناؤ پورم پار لگی
ایسا نہ ہوا، ہر دھارے میں
کچھ ان دیکھی منجدھاریں تھیں
کچھ مانجھی تھے انجان بہت
کچھ بے پرکھی پتواریں تھیں
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
ندیا تو وہی ہے ناؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
اب کیسے پار اترنا ہے

جب اپنی چھاتی میں ہم نے
اس دیس کے گھاؤ دیکھے تھے
تھا ویدوں پر وشواس بہت
اور یاد بہت سے نسخے تھے
یوں لگتا تھا بس کچھ دن میں
ساری بپتا کٹ جائے گی
اور سب گھاؤ بھر جائیں گے
ایسا نہ ہوا کہ روگ اپنے
کچھ اتنے ڈھیر پرانے تھے
وید ان کی ٹوہ کو پا نہ سکے
اور ٹوٹکے سب بیکار گئے
اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب جتنے چاہو دوش دھرو
چھاتی تو وہی ہے گھاؤ وہی
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
یہ گھاؤ کیسے بھرنا ہے

(لندن ۱۹۸۱ء)

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا

دار کی رسیوں کے گلوبند گردن میں پہنے ہوئے
گانے والے ہر اک روز گاتے رہے
پایلیں بیڑیوں کی بجاتے ہوئے
ناچنے والے دھومیں مچاتے رہے
ہم نہ اس صف میں تھے اور نہ اس صف میں تھے
راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے
اور چپ چاپ آنسو بہاتے رہے

لوٹ کر آ کے دیکھا تو پھولوں کا رنگ
جو کبھی سرخ تھا زرد ہی زرد ہے
اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا
دل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے
گلو میں کبھی طوق کا واہمہ
کبھی پاؤں میں رقصِ زنجیر
اور پھر ایک دن عشق انہیں کی طرح
''رسن در گلو'' پابجولاں ہمیں
اسی قافلے میں کشاں لے چلا

(بیروت، جولائی ۱۹۸۱ء)

ایک نغمہ کربلائے بیروت کیلئے

بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں
بچوں کی ہنستی آنکھوں کے
جو آئینے چکنا چور ہوئے
اب ان کے ستاروں کی لَو سے
اس شہر کی راتیں روشن ہیں
اور رخشاں ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
جو چہرے لہو کے غازے کی
زینت سے سوا پُر نور ہوئے
اب ان کے رنگیں پرتو سے
اس شہر کی گلیاں روشن ہیں
اور تاباں ہے ارضِ لبناں
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
ہر ویراں گھر، ہر ایک کھنڈر
ہم پایۂ قصرِ دارا ہے
ہر غازی رشکِ اسکندر
ہر دختر ہمسرِ لیلیٰ ہے
یہ شہر ازل سے قائم ہے
یہ شہر ابد تک دائم ہے
بیروت نگارِ بزمِ جہاں
بیروت بدیلِ باغِ جناں

(بیروت، جون ۱۹۸۲ء)

ایک ترانہ مجاہدینِ فلسطین کیلئے

ہم جیتیں گے
حقّا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے
کیا خوف ز یلغارِ اعداء
ہے سینہ سپر ہر غازی کا
کیا خوف ز یورشِ جیشِ قضا
صف بستہ ہیں ارواح الشہداء
ڈر کاہے کا
ہم جیتیں گے
حقّا ہم جیتیں گے
قد جاء الحق و زہق الباطل
فرمودۂ ربِ اکبر
ہے جنت اپنے پاؤں تلے
اور سایۂ رحمت سر پہ ہے
پھر کیا ڈر ہے
ہم جیتیں گے
حقّا ہم اک دن جیتیں گے
بالآخر اک دن جیتیں گے

(بیروت ۱۵ جون ۱۹۸۲ء)

نذرِ مولانا حسرت موہانی

مر جائیں گے ظالم کی حمایت نہ کریں گے
احرار کبھی ترکِ روایت نہ کریں گے

کیا کچھ نہ ملا ہے جو کبھی تجھ سے ملے تھے
اب تیرے نہ ملنے کی شکایت نہ کریں گے

شب بیت گئی ہے تو گزر جائے گا دن بھی
ہر لحظہ جو گزری وہ حکایت نہ کریں گے

یہ فقر دلِ زار کا عوضانہ بہت ہے
شاہی نہیں مانگیں گے ولایت نہ کریں گے

ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

ترک شاعر ناظم حکمت کے افکار

جینے کے لیے مرنا
یہ کیسی سعادت ہے
مرنے کے لیے جینا
یہ کیسی حماقت ہے

اکیلے جیو
ایک شمشاد تن کی طرح
اور مل کر جیو
ایک بن کی طرح

ہم نے امید کے سہارے پہ
ٹوٹ کر یوں ہی زندگی کی ہے
جس طرح تم سے عاشقی کی ہے

اِدھر نہ دیکھو

ادھر نہ دیکھو کہ جو بہادر
قلم کے یا تیغ کے دھنی تھے
جو عزم و ہمت کے مدعی تھے
اب ان کے ہاتھوں میں صدق ایماں کی
آزمودہ پرانی تلوار مڑ گئی ہے
جو کج کلہ صاحب حشم تھے
جو اہل دستار محترم تھے
ہوس کے پر پیچ راستوں میں
کلہ کسی نے گرو رکھ دی
اُدھر بھی دیکھو
جو اپنے رخشاں لہو کے دینار
مفت بازار میں لٹا کر
نظر سے اوجھل ہوئے
اور اپنی لحد میں اس وقت تک غنی ہیں،
اُدھر بھی دیکھو
جو حرف حق کی صلیب پر اپنا تن سجا کر
جہاں سے رخصت ہوئے
اور اہل جہاں میں اس وقت تک نبی ہیں

شامِ غربت

دشت میں سوختہ سامانوں پہ رات آئی ہے
غم کے سنسان بیابانوں پہ رات آئی ہے
نورِ عرفاں کے دیوانوں پہ رات آئی ہے
شمع ایمان کے پروانوں پہ رات آئی ہے
بیت شبیر پہ ظلمت کی گھٹا چھائی ہے
درد سا درد ہے تنہائی سی تنہائی ہے
ایسی تنہائی کہ پیارے نہیں دیکھے جاتے
آنکھ سے آنکھ کے تارے نہیں دیکھے جاتے
درد سے درد کے مارے نہیں دیکھے جاتے
ضعف سے چاند ستارے نہیں دیکھے جاتے
ایسا سناٹا کہ شمشانوں کی یاد آتی ہے
دل دھڑکنے کی بہت دور صدا جاتی ہے

پھول مسلے گئے فرشِ گلزار پر
رنگ چھڑکا گیا تختۂ دار پر
بزم برپا کرے جس کو منظور ہو
دعوتِ رقص، تلوار کی دھار ہو
دعوتِ بیعتِ شہ پہ ملزم بنا
کوئی اقرار پر، کوئی انکار پر

(ناتمام) (۲۳ فروری ۸۴ء)

بے بسی کا کوئی درماں نہیں کرنے دیتے
اب تو ویرانہ بھی ویراں نہیں کرنے دیتے
دل کو صد لخت کیا سینے کو صد پارہ کیا
اور ہمیں چاک گریباں نہیں کرنے دیتے
ان کو اسلام کے لٹ جانے کا ڈر اتنا ہے
اب وہ کافر کو مسلماں نہیں کرنے دیتے
دل میں وہ آگ فروزاں ہے عدو جس کا بیاں
کوئی مضموں کسی عنواں نہیں کرنے دیتے
جان باقی ہے تو کرنے کو بہت باقی ہے
اب وہ جو کچھ کہ مری جاں نہیں کرنے دیتے

(۳۰ راکتوبر ۱۹۸۴ء)

غزل

گو سب کو بہم ساغر و بادہ تو نہیں تھا
یہ شہر اداس اتنا زیادہ تو نہیں تھا

گلیوں میں پھرا کرتے تھے دو چار دوانے
ہر شخص کا صد چاک لبادہ تو نہیں تھا

منزل کو نہ پہچانے رہِ عشق کا راہی
ناداں ہی سہی ایسا بھی سادہ تو نہیں تھا

تھک کر یونہی پل بھر کے لئے آنکھ لگی تھی
سو کر ہی نہ اٹھیں یہ ارادہ تو نہیں تھا

واعظ سے رہ و رسم رہی رند سے صحبت
فرق ان میں کوئی اتنا زیادہ تو نہیں تھا



فیض کی جمالیاتی فضا کا تعین۔ ”نقش فریادی“ کی نظموں میں

عبدالاحد ساز

فیض احمد فیض کو اگر ہم اردو شاعری کے طالب علم اور قاری کی طرح پڑھتے ہیں تو ایک بے اختیار تحسین کے ساتھ، اور اگر ہم خود تخلیق کار یا شاعر ہوں تو بے انتہا رشک کے ساتھ، ہمارے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ آخر فیض کی شاعری کا جادو ہمارے سر چڑھ کر کیوں بولتا ہے؟ یہ شاعری ہمیں اس قدر انسیت اور ربط و رغبت کیوں فراہم کرتی ہے اور اتنی آسانی سے ہمارے احساس میں کیسے جذب ہونے لگتی ہے؟ فیض کی بے پناہ مقبولیت کا راز شاید اسی سوال کے جواب میں مضمر ہے۔ بعض حضرات اس قبولیت کو ان کی شخصی و سماجی زندگی سے بھی جوڑتے ہیں۔ سیاسی تحریکات میں فعال شمولیت، نظریاتی انسلاکات کے تحت ثقافتی و سفارتی تعلقات، بیرونی ممالک کے ادبی اسفار، مشرق وطیٰ، خصوصاً فلسطین کے کاز سے قلمی و عملی وابستگی، شخصیت کا اثر اور دلکشی وغیرہ۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ ساری وجوہات ضمنی اور ثانوی ہیں۔ کچھ اصحاب فروعی طور پر اس مقبولیت کی یہ وجہ بتا کے مطمئن ہو جاتے ہیں کہ فیض کے یہاں رومان اور انقلاب یا غم جاناں و غم دوراں کی خوبصورت آمیزش ہے۔ یہ امر موضوعات کے اعتبار سے غور طلب ہو سکتا ہے لیکن فیض کی شاعری کے مجموعی تاثر کے باب میں ناکافی اضافی ہی ہے۔ پھر یہ آمیزش تو بیشتر معاصر ترقی پسند شعراء کے کلام میں بھی مشترک ہے۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی فن پارے سے باطنی طور پر، یا کم سے کم نیم شعوری طور پر ہمارا کیا مطالبہ ہوتا ہے۔ نفسیات اور سائنس کی رو سے دیکھا جائے تو یہ ساری کائنات ایک ہم آہنگی یا Harmony میں اپنا اظہار اور ابلاغ کر رہی ہے۔ سانسوں کا زیر و بم اور دل کی دھڑکنیں ہوں یا حواسِ خمسہ کے ارتعاشات ہوں۔ سورج، چاند، ستاروں کی گردشیں ہوں یا مادے کی قلب ماہیت کے مدارج، یا انسانی آنکھوں کے لہو کے اور روح کے رشتے ہوں۔ تمام سلسلے ایک خاص امتزاج و تناسب ہی میں بقا پذیر ہیں۔ اس حقیقت کا اطلاق زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا ہے۔ چاہے وہ تجارت ہو، معاشرت ہو یا ادب و فن ہو۔ معاملات اگر آفاق کے بنیادی آہنگ کے رخ پر ہوں گے تو وہ حسن، خیر اور توانائی کے ضابطے پیدا کریں گے اور اگر وہ زندگی کے اس دائروی بہاؤ کے خلاف ہوں گے تو بدصورتی، بطلان اور کمزوری کے لئے راہ ہموار کریں گے۔ بالکل اسی طرح جیسے آواز کے زیر و بم متناسب ہوں تو نغمہ اور غیر متناسب ہوں تو محض شور پیدا کرتے ہیں۔ کچھ چہرے گوارا، کچھ قبول صورت اور کچھ بے حد حسین لگتے ہیں۔ بعض گیت اچھے، بعض دلکش اور بعض مسحور کن ہوتے ہیں۔ خط طو رنگ کے چند تلازمے بھلے بھلے سے، چند پر کشش اور کچھ انتہائی دل نشیں معلوم ہوتے ہیں۔ شخصی پسند و ناپسند کی کچھ رعایتیں ضرور ہو سکتی ہیں لیکن ان سے آگے اکثر امتزاجات یونیورسل اپیل رکھتے ہیں اور معیار حسن ٹھہرتے ہیں۔ گویا سارا مسئلہ ترتیب و انتخاب Permutation & Combination کا ہے۔ یہی قاعدہ ظاہر ہے الفاظ پر بھی مطلق ہے۔ شاعری، بلکہ نثر میں بھی الفاظ کا انتخاب در و بست، ان کی صوتی مناسبتیں، ان کا باہمی معنوی ارتباط جتنا لطیف و مستحکم توازن قائم کریں گے، شاعری اتنی ہی بلیغ و دل پذیر ہوگی۔ فیض کا سب سے بڑا پلس پوائنٹ Plus Point یہی ہے کہ وہ اپنے ارفع ذوق جمال اور تربیت یافتہ غنائی شعور کی بنا پر ترسیل کی ایک ایسی فریکوینسی Frequency تلاش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جو شاعر کے قلم سے قاری کے دل و دماغ تک رابطے کے بہت سے الجھے ہوئے تاروں میں سے کچھ مرکزی تاروں کو گرفت میں لے کر انہیں مرتعش کر دیتی ہے۔ ان مرتش لہروں میں فیض اپنے جذبے اور فکر کی رو بڑی آسانی کے ساتھ دوڑا دیتے ہیں۔

لفظ و معنی کا باہمی رشتہ چوں کہ بدن اور پیرہن یا شیشے اور شراب کا نہیں بلکہ جسم و روح کا ہے۔ چنانچہ فن پارہ اسی وقت ظہور میں آتا ہے جب طرزِ اظہار اور عرض مدعا، آپس میں محض ایک آمیزے کی طرح ملے ہوئے نہ ہوں، بلکہ ایک ہی تخلیقی تجربے کے سیال مرکب میں تبدیل ہو جائیں۔ فیض اسی کیمیاوی عمل میں بے حد کامیاب ہیں۔

مذکورہ معروضات کے اعتبار سے کسی بھی صاحب اسلوب شاعر کو پڑھنے اور اس سے حظ اندوز ہونے کے لئے اس کے ابتدائی کلام کا مطالعہ نہایت ضروری ہے۔ جس طرح پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں، اسی طرح ایک بڑے شاعر کی آمد کی نوید اس کے ابتدائی کلام میں ہی سنائی دینے لگتی ہے۔ اس کی آئندہ پرواز کی نغمگی اس کے شہپروں کی جنبش کے آغاز کے ساتھ ہی سماعتوں میں گونج پیدا کر دیتی ہے۔ جس طرح علامہ اقبال کی شاہکار نظموں سے معمور ان کی شعری تصنیفات بال جبریل، ضرب کلیم، ارمغان حجاز وغیرہ کا مطالعہ نامکمل ہی رہے گا جب تک کہ ان کی ”بانگ درا“ کی نظموں سے اساسی طور پر قربت نہ حاصل کر لی جائے۔ اسی طرح فیض کے مجموعوں دست صبا، زنداں نامہ اور دست تہہ سنگ سے اتنی سرشاری اس وقت تک حاصل نہیں کی جا سکتی جب تک ان کے اولین شعری مجموعے ”نقش فریادی“ سے خود کو ہم آہنگ نہ کر لیا جائے۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ ان چار مجموعوں کے کافی عرصے بعد آخری چار مجموعے یعنی سر وادیِ سینا، شام شہر یاراں، مرے دل مرے مسافر اور غبار ایام جو قدرے مختلف

تخلیقی تجربات لئے ہوئے ہیں ان میں بھی نقش فریادی کی نظموں کے خد و خال غور کرنے پر ایسے اجاگر ہوتے ہیں جیسے ایک جھریوں بھرے پختہ کار چہرے پر نظریں گاڑ کر اس کے اندر سے ایک کم سن چہرہ برآمد کرلیا جائے۔ اس پر مستزاد یہ بھی کہ اقبال کی بانگ درا ہی کی طرح فیض کی چند شہرہ آفاق نظمیں خود نقش فریادی ہی میں موجود ہیں۔

فیض کی ترسیلی فضا کے ترنم اور لطافت کو نقش فریادی کے پہلے حصے کی ایک نظم "سرود شبانہ" کے ان مصرعوں میں دیکھئے ؎

سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی تھکی آواز
کہکشاں نیم وا نگاہوں سے
کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز

یا نظم "تہ نجوم" کے اس بند میں ؎

چھلک رہی ہے جوانی ہر اک بن مو سے
رواں ہو برگِ گل تر سے جیسے سیلِ شمیم
ضیائے مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اڑا رہی ہے نسیم
دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے

یہاں اس بات کی نشاندہی بھی دلچسپی کا باعث ہوگی کہ "نقش فریادی" کے دوسرے حصے کی پہلی نظم "مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ" جس میں زندگی کی سفاک حقیقتوں کو بڑے سوز و گداز کے ساتھ شعری پیرایہ دیا گیا ہے، اس میں ابتداء یہ شعر بھی شامل تھا ؎

جسم نکلے ہوئے امراض کے تنوروں سے
پیپ بہتی ہوئی گلتے ہوئے ناسوروں سے

یہ شعر اگرچہ حقیقت نگاری کی رو سے کارآمد تھا لیکن نظم کے لفظیاتی و صوتی نظام کے حسن کو مجروح کرتا تھا اور نظم اس کے بغیر بھی اپنے مفہوم کو جمیل انداز میں ادا کر رہی تھی۔ فیض کی ترسیلی جمالیات کے شعور نے اس شعر کو بعد کے ایڈیشنوں میں حذف کرا دیا۔

"نقش فریادی" کے بعد کے مجموعوں میں کئی پابند اور نیم آزاد نظمیں ایسی ہیں جن میں فیض نے ہم قافیہ مصرعوں کی مختلف النوع ترتیب سے حسن آرائی کا کام لیا ہے۔ کچھ انگریزی اصناف سخن مثلاً "سانیٹ" کی طرف ذہن جاتا ہے، مگر ان میں سانیٹ کی ترتیبی تاکید اور ضابطہ بھی نہیں ہے۔ کہیں پہلا اور پانچواں مصرعہ ہم قافیہ ہے، کہیں مسلسل تین مصرعے ہم قافیہ ہیں اور کہیں کوئی دیگر التزام ہے۔ یہ ترتیب کسی طے شدہ نظام کے تحت نہیں ہے بلکہ فیض کے انفرادی غنائی اسلوب کا اضطراری عمل ہے جو نظموں کو ایک جداگانہ صوتی جامعیت عطا کر دیتی ہے۔ مثال کے طور پر "دست صبا" میں شامل نظم "زنداں کی ایک صبح" کے یہ مصرعے ملاحظہ کیجئے ؎

صحن زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطحِ ظلمت پہ دمکتے ہوئے ابھرے کم کم
نیند کی اوس نے ہر چہرے سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراقِ رخِ محبوب کا غم
دور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم
زرد فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہل زنداں کے غضب ناک خروشاں نالے
جن کی بانہوں میں پھرا کرتے ہیں بانہیں ڈالے

اور اب ترتیب کے ایسے ہی عمل کو "نقش فریادی" کی مشہور نظم "تنہائی" میں دیکھئے ؎

ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہ گزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گل کرو شمعیں بڑھا دو مئے و مینا و ایاغ

فیض کے ساتھ ہم جو ایک خاص Intimacy محسوس کرتے ہیں اس کی ایک وجہ صوتی تشکیل اور سمعی پیکر تراشی کے علاوہ منظر اور مفہوم کی حسی اور بصری پیکر آرائی بھی ہے۔ موضوع اور معنویت سے قطع نظر قاری کو قریب کر لینے میں فیض کی فضا کاری اور امیجری کو بڑا دخل ہے۔ ان کے یہاں ہمیں فکری تابندگی اور احساس کی تپش حسی و بصری کیف کے ساتھ گھل مل کر ہی سرشار کرتی ہے۔ فیض کا کلام اکثر اوقات ہماری "آرکی ٹایپ" کو مناسبت دیتے ہوئے ہمارے موڈ میں جاگزیں ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر "زنداں نامہ" میں شامل معرکۃ الآرا نظم "ملاقات" میں ایک عہد کے کرب و حزن کو "یہ رات اس درد کا شجر ہے" کا پیکر دیا گیا ہے اور اس علامت کو انتہائی فن کاری کے ساتھ علامت کے تقاضوں کی مکمل حفاظت اور نزاکت کا اہتمام کرتے ہوئے پوری نظم میں برتا گیا ہے۔ اسی طرح "دست تہہ سنگ" میں شامل اہم نظم "شام" میں ایک دور کے سیاسی تعطل کو ایک اداس اور ٹھہری ہوئی شام کے حیاتی کیف کے ساتھ ابھار کر ایک تصویریت بھی دے دی گئی ہے۔

فیض صاحب نے اپنے موڈس اور امیجز کے تعلق سے اپنے چھٹے مجموعہ کلام "شام شہر یاراں" کے دیباچے میں اپنی پرانی نظموں کو یاد کرتے ہوئے ایک بڑی نجی اور مخصوص کیفیت کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

"ان دنوں میں نے محسوس کیا کہ شہر کے جو گلی محلے ہیں، ان میں بھی اپنا ایک حسن ہے جو دریا و صحرا، کوہسار یا سرو و سمن سے کم نہیں ہے۔ البتہ اس کو دیکھنے کے لئے بالکل دوسری طرح کی نظر چاہئے۔ میں نے اسے لکھنے کی کوشش بھی کی ہے۔ جب شہر کی گلیوں اور کٹڑیوں میں، کبھی دوپہر کے وقت، کبھی شام کے وقت کچھ اس قسم کا روپ آجاتا ہے جیسے معلوم ہو کوئی پرستان ہے۔ "نیم شب، چاند، خود فراموشی" اور "بام و در خاموشی کے بوجھ سے چور" اسی زمانے کی نظمیں ہیں۔"

مزید لکھتے ہیں:

"اس زمانے میں کبھی کبھی مجھ پر ایک خاص قسم کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی جیسے یکا یک آسمان کا رنگ بدل گیا ہے۔ بعض چیزیں کہیں دور چلی گئی ہیں۔ دھوپ کا رنگ اچانک حنائی ہو گیا ہے۔ پہلے جو دیکھنے میں آیا تھا اس کی صورت بالکل مختلف ہو گئی ہے۔ دنیا ایک طرح کے پردۂ تصویر کی قسم کی چیز محسوس ہونے لگتی تھی۔"

یہ کیفیتیں فیض کی پوری شاعری میں نیم روشن ملتی ہیں۔ پہلے اقتباس میں جن دو نظموں کا ذکر ہے، وہ دونوں 'نقش فریادی' ہی میں ہیں۔ ان میں سے ایک مختصر نظم 'ایک منظر' کیفیت آفرینی کی کیسی دل کش مثال ہے ۔

بام و در خامشی کے بوجھ سے چور،
چاند کا دکھ بھرا فسانۂ نور
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لے رباب ہستی کی
آسمانوں سے جوئے درد رواں
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
ہلکے ہلکے سروں میں نوحہ کناں

کیفیت نگاری کا یہ عمل بعد کی نظموں میں نئے شیڈس کے ساتھ انگیز ہو کر لطیف تر اور بلیغ تر ہوتا چلا گیا ہے۔ اس سلسلے میں مثال کے طور پر 'دست تہہ سنگ' میں شامل نظم "پاس رہو" کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس میں امیجری، درد اور مفہوم تخلیقی فضا میں ایسے گھل مل گئے ہیں کہ اظہار کا ایک طلسم برپا ہو گیا ہے۔ بطور خاص یہ چند مصرعے دیکھئے ۔

تم میرے پاس رہو
میرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو
جس گھڑی رات چلے
آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے
مرہم مشک لئے، مرہم الماس لئے
بین کرتی ہوئی، ہنستی ہوئی، گاتی نکلے
درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے
تم مرے پاس رہو!

'دست تہہ سنگ' کی اس نظم کو "نقش فریادی" کی مذکورہ نظم 'ایک منظر' کے تناظر میں تقابلی طور پر دیکھا جائے تو واضح ہوتا ہے کہ فیض کی شاعری میں اس مخصوص امیجری اور پیکر تراشی کے امکانات بھی اولین نظموں ہی میں مضمر تھے۔

فیض کثیر الاسالیب شاعر نہیں ہیں جیسے کہ جوش ملیح آبادی ہیں جن کے یہاں متنوع اسالیب ہیں اور پھر ان کے درمیان جوش کے مرکزی اسلوب کا گہرا رنگ نمایاں بھی ہے۔ فیض کا ایک ہی منفرد اسلوب ہے، جو اچھی خاصی فارسی لفظیات و تراکیب سے مزین ہے اور جس میں حافظ کی سی شیرینی ہے۔ ہاں ایک ذیلی اسلوب کہیں کہیں سر ابھارتا ہے جہاں ان کی فضائے شعری کا شہری Sophistication پنجاب کی دیہی زمین کی خوشبو کو قبول کرتا ہے۔ یہاں ترسیل کی فضا تو ضرور مختلف معلوم ہوتی ہے مگر غنائیت، ترنم اور بہاؤ میں کوئی فرق نہیں آتا یہ ذیلی اسلوب بھی درحقیقت اپنے مرکزی اسلوب کے آس پاس اور اسی کی کشش کے دائرے میں ایک سیارچے کی طرح گردش کرتا ہے۔ اس کی مثالیں بعد کے مجموعوں میں تو کافی مل جاتی ہیں مگر خود نقش فریادی کی چند نظموں میں بھی آئندہ کے اشارے کے طور پر روشن ہیں۔ موازنے کے طور پر پہلے "دست تہہ سنگ" کی ایک گیت نما نظم کے یہ مصرعے ملاحظہ کیجیے

یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
کیوں راز کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو
جب تیری سمندر آنکھوں میں
اس شام کا سورج ڈوبے گا
سکھ سوئیں گے گھر در والے
اور راہی اپنی رہ لے گا

یا سرِ وادیِ سینا کی نظم "سپاہی کا مرثیہ" کی یہ چند سطریں ـــ

گھر گھر بکھرا بھور کا کندن
گھور اندھیرا اپنا آنگن
جانے کب سے راہ تکتے ہیں
بالی دلہنیا، بانکے ویرن

سونا تمھرا راج پڑا ہے
دیکھو کتنا کاج پڑا ہے
بیری براجے راج سنگھاسن
تم ماٹی میں لال۔۔۔
اٹھو اب ماٹی سے اٹھو
جاگو میرے لال!

اور اسی خصوص میں ذیلی اسلوب کی ابتدائی نشاندہی کرتی ہوئی نقش فریادی کی نظم "سوچ" کے یہ دو بند دیکھئے ـــ

تو گر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے
پاپ کے پھندے ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے
بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں
ان کا سکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

جہاں تک فیض کے خیالات و افکار کا تعلق ہے، ان کے رومانی مزاج اور انقلابی فکر کی بات ہے، ان کی شاعری کے کینوس کی حدود کا سوال ہے، یہ الگ الگ مقالات کے موضوع ہیں۔ فیض کے قارئین خوب جانتے ہیں کہ فیض پیچیدہ فہم اور ژولیدہ نگاہ کے شاعر نہیں ہیں۔ ان کا موقف حیات واضح ہے۔ انہوں نے زبان و بیان کے معاملے میں بھی کوئی منحرف روش نہیں اختیار کی ہے بلکہ اپنی لفظیات اور محاورے اردو شاعری کے کلاسیکی و روایتی سرمائے ہی سے اخذ کئے ہیں۔ ان کے یہاں کوئی زیادہ بڑی Vocabulary بھی نہیں ہے۔ انہوں نے مروج مسلمات شاعری کو سیاسی و معاشرتی معانی بھی تقریباً اسی طرح پہنائے ہیں، جس طرح ان کے بیشتر ہم عصر ترقی پسند شعراء نے۔ فیض کا بس کمال یہی ہے کہ انہوں نے اس مانوس و معین خام مواد کو لے کر اپنی تخلیقی شخصیت کی بنا پر اپنا ایک شہر سخن تعمیر کر لیا، اور لفظی جمال سے معنوی کیفیت کو مرتبط کر کے اظہار و ترسیل کا ایک طلسم کدہ آباد کر دیا۔ اگرچہ فیض کے موضوعات اس مضمون کے دائرے سے باہر ہیں، تاہم اس پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانا دلچسپ ہوگا کہ فیض کے تخلیقی سفر کے اگلے مرحلوں میں جو فکری جہات اور معنوی ابعاد ہیں، وہ بھی کسی حد تک 'نقش فریادی' کی نظموں کے بطن میں ارتکاز کے ساتھ محمول ہیں۔ 'دست صبا' میں شامل نمائندہ نظم "دو عشق" میں محبوب سے عشق اور وطن سے عشق میں یگانگت پیدا کرتے ہوئے جو بالغ اور مطمئن نشاطیہ کلائمکس پیدا کیا گیا ہے ۔

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہیں مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

وہ 'نقش فریادی' کی مشہور نظم "مجھ سے پہلی سی محبت ۔۔۔۔" کے اس مضطرب حزنیہ کلائمکس سے راست ربط رکھتا ہے۔

اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

موضوع سخن کے سلسلے میں فیض نے اپنی ترجیحات بھی نقش فریادی کے زمانے میں ہی طے کر لی تھیں۔ خود "موضوع سخن" کے عنوان سے نظم میں فیض نے اپنے نظریاتی و فکری سروکار کو صراحت کے ساتھ بیان کرتے ہوئے ایک بڑے خوبصورت شاعرانہ گریز کے ساتھ اپنے رومانی شاعر ہونے کو اغلب قرار دیا ہے ۔

یہ بھی ہیں، ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے، کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوع سخن ان کے سوا اور نہیں
طبع شاعر کا وطن ان کے سوا اور نہیں

فیض کا یہ رومانی کمٹمنٹ ہی فیض کا نظری و جذباتی کمٹمنٹ بھی ہے کہ اس شاعر نے "غم جہاں ہو، رخ یار ہو کہ دست عدو" ہر اک سے عاشقانہ سلوک کیا ہے۔ فیض کا اپنی شاعری سے بھی یہی عاشقانہ سلوک دراصل رابطے کا وہ تار ہے جو فیض کے قلم سے

ہمارے دل و دماغ تک پیہم بندھا ہوا ہے اور جس کا ارتعاش پوری ادبی دنیا میں مسلسل سنائی دے رہا ہے۔

ABDUL AHAZ SAAZ
Zakariya Manure, 4th Floor, 149, Yusuf Meher Ali Road,
MUMBAI-3

بقیہ: لفظیات فیض

رقیب سے نفرت اک لازمی امر ہے چنانچہ اردو شاعری بھی اس سے بھری پڑی ہے۔

اس نقش پا کے سجدے نے کیا کیا کیا ذلیل
میں کوچہ رقیب میں بھی سر کے بل گیا

مگر فیض نے اردو ادب میں پہلی دفعہ رقیب کے لئے بھی نفرت کے بجائے نرم لہجہ اختیار کیا محض اس لئے کہ

تو نے دیکھی ہے وہ پیشانی وہ رخسار وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے

اس سلسلے میں فیض حق گوئی و بیباکی پر اکساتے بھی ہیں تو محض نفرت کے اظہار کے لئے نہیں بلکہ

بول کے لب آزاد ہیں تیرے
بول زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کے جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہن گر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن

فلسطینی بچے کے لئے لوری بھی گاتے ہیں تو نفرت کی فضاء میں بھی اسے زندگی سے محبت کرنا سکھاتے ہیں۔ میں اپنی بات ختم کرنے سے پہلے فیض ہی کے لہجے میں یہ کہنا چاہوں گا

آئیے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنھیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنھیں سوز محبت کے سوا
کوئی بت کوئی خدا یاد نہیں
جن کا دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے جرأت تحقیق ملے
جن کے سر منتظر تیغ جفا ہیں ان کو
دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

RAUF KHAIR
Moti Mahal, Golconda, Hyderabad-500008 A.P. INDIA



فیض کا ڈراما۔ ’’غالب اور زندگی کا فلسفہ‘‘

علی احمد فاطمی

فیض بنیادی طور پر شاعر تھے اور مقبول و ہر دلعزیز شاعر۔ لیکن ترقی پسند مفکر اور دانشور ہونے کے ناطے انہوں نے وقتاً فوقتاً مضامین بھی لکھے خاص طور پر اس وقت جب وہ راول پنڈی سازش کیس میں جیل میں قید تھے۔ اس زمانے کے لکھے ہوئے زیادہ تر مضامین ایک کتاب کی شکل میں بعنوان ’’میزان‘‘ ستمبر ۱۹۶۵ء میں لاہور اکادمی لاہور نے شائع کئے۔ ویسے تو اس کتاب میں نظریہ اور مسائل سے متعلق مضامین زیادہ ہیں لیکن اس کے علاوہ متقدمین اور معاصرین کے عنوان سے منفرد شاعروں اور نثر نگاروں بطور خاص ناول نگاروں پر بھی مضامین ہیں۔ متقدمین کے عنوان سے انھوں نے نظیر، حالی، غالب، سرشار، شرر، پریم چند پر مضامین لکھے۔ غالب سے متعلق لکھتے ہوئے جو انھوں نے عنوان قائم کیا وہ ہے ’’غالب اور زندگی کا فلسفہ‘‘ اس عنوان سے تو اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ایک تنقیدی مضمون ہو گا لیکن یہ مضمون نہیں بلکہ ڈراما ہے اور ایک سنجیدہ ڈراما۔ سنجیدہ ان معنوں میں کہ اس کی ابتدا غالب کے بچپن، کھلنڈرے پن، عشق بازی، شراب نوشی وغیرہ سے نہیں ہوتی بلکہ پہلے ہی جملے سے غالب کی شاعرانہ و مفکرانہ شخصیت اور بصیرت زیر بحث آجاتی ہے۔ موقع محل، کرداروں کے تعارف کے بغیر ڈرامے کی ابتدا ہو جاتی ہے۔ احمد نام کا کردار راست طور پر عابد نام کے کردار سے یہ کہتا ہے:

’’میں کہتا ہوں کہ غالب پہلے فلسفی تھا اور بعد میں شاعر۔ یہ کچھ میں نہیں بڑے بڑے نقاد کہتے ہیں۔‘‘

جواب میں عابد کہتا ہے:

’’اور میں کہتا ہوں کہ تمہاری کتابوں اور تمہارے نقادوں کی ایسی تیسی۔ آپ جیسے بوالہوس حسن پرستی کے مدعی بن بیٹھیں تو ہماری تنقید کا جو بھی حشر ہو وہ کم ہے۔‘‘

دونوں کی گفتگو کا لہجہ اور جذبہ ظاہر کرتا ہے کہ دونوں نوجوان ہیں اور اپنی بات سے ایک دوسرے کو قائل کرنا چاہتے ہیں۔ ابھی گفتگو کا آغاز ہوا تھا کہ ایک دستک کے ذریعہ ثریا نام کی خاتون داخل ہوتی ہیں جو نسبتاً بڑی اور سمجھدار معلوم ہوتی ہیں۔ دونوں کی گرمیٔ بحث کو دیکھ کر سمجھاتی ہیں:

’’میں سمجھتی ہوں کہ بحث کا آغاز موضوع بحث کے مطابق ہونا چاہئے۔ آپ غالب پر بحث کر رہے ہیں تو شوق سے بحث جاری رکھئے لیکن بحث ہمیشہ دھیمے اور پرسکون لہجے میں ہونی چاہئے۔‘‘

ڈراما کی ابتدا میں ہی غالب، غالبیات اور ماہرین غالبیات پر لطیف سا طنز ملتا ہے۔ وہ نقادان ادب جو گرجتے زیادہ ہیں برستے کم ہیں ان کے بارے میں طنز کے تخلیقی اشارے ملتے ہیں۔ ثریا کا خیال ہے کہ غالب کے یہاں اداسی زیادہ ہے۔ یہ اداسی و غمگینی غیر معمولی ہے۔ جو سکون کے ساتھ زیر بحث لانا چاہئے نہ کہ چیخ چلا کر لیکن عابد کا خیال ہے کہ اداسی ایک کیفیت ہوتی ہے نظریہ نہیں۔ جس پر ثریا بڑے سلیقہ سے جواب دیتی ہے کہ ’’شاعر کا نظریہ اس کی واردات سے الگ نہیں ہوتا۔‘‘ عابد کا پھر سوال ابھرتا ہے کہ اس طرح سے تو یہ ہوا کہ غالب قنوطی شاعر ٹھہرے جس کا جواب ثریا بڑے اعتماد سے یوں دیتی ہے:

’’قنوطیت ایک ذہنی عقیدہ ہے۔ موہومیت اس کا جوہر ہے۔ اداس دل و دماغ کو صرف بیتی ہوئی راحت کا غم ہی نہیں اس کے لوٹ آنے کی امید اور آرزو بھی ہوتی ہے۔‘‘

ان مکالموں میں فیض نے بہ زبان ثریا ترقی پسند خیالات کی رو سے منطقی انداز میں غم اور اداسی کی نازک اور بلیغ شرح کی ہے۔ امید و نشاط، آرزو و تمنا کے تمام نرم و نازک پہلوؤں کا عکس جھلکنے لگتا ہے۔ ایک اداسی میر کی ہے کہ دل چراغ مفلس کی طرح شام ہی سے بجھا سا رہتا ہے۔ ایک اداسی درد کی ہے جو فنا بقا کی طرف لے جاتی ہے اور ایک اداسی فانی کی ہے جو بہت تیزی سے لاش کی شکل اختیار کر لیتی ہے لیکن غالب کی اداسی کو ان سب کے ساتھ شامل نہیں کیا جا سکتا کیوں کہ ان کے یہاں ماضی، حال اور مستقبل سب کچھ مختلف رنگ میں دکھائی دیتا ہے جس کو فیض نے احمد کی زبان سے یوں کہلوایا ہے:

’’واقعی اب سوچتا ہوں تو غالب کے کلام میں اس کے تین پہلو دکھائی دیتے ہیں ماضی کی شادابی اور رنگینی کی یاد، اس کے کھو جانے کا غم، حال کی بے کیفی اور ویرانی؛ مستقبل میں سہانے دنوں کی امید اور حسرت، قنوطیت ایک منفرد چیز ہے اور یہ واردات ایک سہ پہلو مرکب۔‘‘

اس کے بعد اشعار ہیں جو بڑے ڈرامائی ڈھنگ سے پیش کئے گئے ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ اشعار کا انتخاب بہت اچھا نہیں ہے۔ فیض نے اشعار کے حوالے سے بھی ماضی، حال اور مستقبل کو الگ الگ ڈھنگ سے پیش کرنے کی کوشش کی ہے لیکن اول تو ڈرامے کی پیش کش میں یہ جذب نہیں ہوتے پھر فلسفیانہ گفتگو سے ان کا راست طور پر رشتہ استوار نہیں ہوتا۔ تاہم مکالمات میں جان ضرور دکھائی دیتی ہے۔

عابد ایک ایسا کردار ہے جو ثریا اور احمد کے مشترک خیالات میں اختلاف کی

زمین تلاش کرتا ہے۔ مثلاً ایک جگہ اس کا یہ کہنا:

"احمد فرماتے ہیں کہ غالب پہ ماضی کی محبت غالب ہے۔ آپ فرماتی ہیں غالب کی نفرت سے مغلوب ہے۔"

ثریا جو پڑھی لکھی ہے ذہین اور حاضر جواب ہے فوراً کہتی ہے:

"یہ ایک ہی واردات کے دو پہلو ہیں۔ ان میں کوئی ضد تو نہیں ہے۔"

باتوں باتوں میں گفتگو کا رخ بدلتا ہے۔ غالب کی غم کے تئیں بے نیازی نئی نسل کو ایک عجیب سے فیشن میں بھی مبتلا کرتی ہے۔ جیسا کہ احمد کہتا ہے:

"آج کل کے کئی نوجوانوں کی طرح غالب نے اپنے دکھ کو ایک نشانِ استغنا، ایک لاابالیانہ انداز میں ٹالنے کی کوشش کی ہے یا انقلاب کے دائمی عمل اور خیال نمائندگیں نیز ہم نہ خوابیدہ ماندہ کے فلسفہ میں قرار ڈھونڈھا۔"

اور پھر یہ اشعار:

رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا
آ ہی جاتا وہ راہ پر غالب
کوئی دن اور بھی جیتے ہوتے

یہی نہیں غالب کے یہاں تو موت کی خواہش ہے لیکن یہ خواہش جدید شعراء کی خواہش مرگ یا قنوطیت سے بہت مختلف ہے۔ اسی لئے غالب یہ بھی کہتا ہے:

کس سے محرومیٔ قسمت کی شکایت کیجے
ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا
نظر میں ہے ہماری جادۂ راہِ فنا غالب
کہ یہ شیرازہ ہے عالم کے اجزائے پریشاں کا

ان اشعار میں جلد ہی اجزائے پریشاں کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں اور غالب کی خواہش مرگ ایک ایسے فلسفے کا رخ اختیار کر لیتی ہے جہاں سب کچھ مٹ جانے کے باوجود زندگی کی دائمیت قائم رہتی ہے۔ یہی وہ مقامِ فکر ہے جہاں غالب دوسرے فلسفی اور قنوطی شاعروں سے الگ ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے بقول عابد:

"غالب کی آنکھوں نے جو کچھ دیکھا اسے قبول کرنے کے لئے لوہے کا دل چاہئے لیکن شاعروں کا دل عام طور سے بہت گھٹیا مار کے کا ہوتا ہے۔ اس پر جذبات کا ہم سے زیادہ دباؤ پڑتا ہے۔ اسی لئے غالب نے اپنے دل سے یہی سمجھوتہ کیا کہ یہ سب کچھ جو میرے سامنے ہو رہا ہے خدا جانے ہو بھی رہا ہے کہ نہیں۔ ہم سب لوگ ایک بھیانک خواب دیکھ رہے ہیں۔"

حالانکہ یہ حقیقت تھی لیکن کبھی کبھی حقیقت اس قدر سفاک اور بے رحم روپ اختیار کر لیتی ہے کہ وہ ساکت نہ ہو کر خواب اور وہم و گمان کی شکل میں سیال ہو جاتی ہے اور نازک و حساس شخص و شاعر متزلزل اور مرتعش خیالات سے دوچار ہونے پر مجبور ہوتا ہے۔ غالب ایک غزل میں یہ کہتے ہیں:

بازیچۂ اطفال ہے دنیا مرے آگے
ہوتا ہے شب و روز تماشا مرے آگے

تو اسی غزل کے دوسرے شعر میں یہ بھی کہتے ہیں:

جز نام نہیں صورتِ عالم مجھے منظور
جز وہم نہیں ہستیٔ اشیا مرے آگے

ایک کیفیت اور رہتی ہے جس کو فیض نے بزبان احمد یوں کہلوایا:

"ماضی سے متعلق غالب کا خیال موہوم نہیں ہے لیکن جب بھی غالب اپنے حال کی کیفیات کا بیان شروع کرتے ہیں۔ ہر کیفیت میں ایک بعد، ایک دوری سی، ایک دھندلاہٹ سی پیدا ہو جاتی ہے۔ تصویر سامنے آتی ہے لیکن اس کے نقوش ایک لامحدود پس منظر سے یوں گھلتے ملتے چلے جاتے ہیں کہ تصویر اور اس کے پس منظر کو ایک دوسرے سے جدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ خاص طور پر جب غالب خالص غنائی معاملات کا ذکر کرتے ہیں یا محبت کے گوناگوں احساسات رقم کرتے ہیں۔ مثلاً یہ شعر:

تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

اندیشہ ہائے دور دراز کے ذریعہ فیض نے غالب کا فکری تنوع اور اس عہد کی کشاکش کو ایسے تخلیقی ابعادی انداز میں ہم آہنگ کیا ہے اور احمد کے مکالموں کے ذریعہ یہ کہلوایا ہے کہ غالب کے ایسے فکر انگیز اشعار میں کوئی بھی تصویر مکمل نہیں ہوتی اور یہ صرف غالب کی انفرادیت نہیں ہے بلکہ عہدِ غالب کی انتشاری و بحرانی کیفیت بھی ہے۔ جس کو غالب نے پہلے تشکیک بعد میں تخلیق کے انداز میں کچھ یوں جذب و پیوست کیا ہے جو قدم قدم پر غالب کے سوالیہ نوعیت کے اشعار میں اجاگر ہوتی ہے:

دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟
آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی
میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

فیض نے اس تخلیقی گفتگو کے ذریعہ ذات، حیات اور کشمکشِ حیات کو فکر و فلسفہ کی سطح پر مدغم کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے اور زندگی کے ارضی و حقیقی پہلوؤں کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ عابد، احمد اور ثریا کی تین زاویوں سے ہونے والی معنی خیز گفتگو کے درمیان اچانک ایک اور دستک ہوتی ہے۔ ثریا رخصت ہوتی ہے اور مرزا جی داخل ہوتے ہیں اور اس گفتگو میں شریک ہو جاتے ہیں۔ احمد بتاتا ہے کہ وہ لوگ غالب کی اداسی یا اس موہومیت پر گفتگو کر رہے ہیں۔ جس پر مرزا صاحب کہتے ہیں کہ اس طرح کی موہومیت تو اکثر غزل کے شعراء میں پائی جاتی ہے۔ احمد پھر کہتا ہے:

"چونکہ غالب نے اپنے تجربات کی واضح حد بندیاں نہیں کیں اس لئے ہمارے تجربات کی حدیں ان میں جذب ہو کر رہ جاتی ہیں۔"

اس پر مرزا صاحب اپنی بزرگی اور تجربے سے بھری بات یوں کہتے ہیں:

"ہر ایک کی اپنی مخصوص اچھائی ہوتی ہے۔ غالب کی مخصوص اچھائی یہ ہے کہ وہ ایک فرد نہیں ایک نسل ہے وہ چند لمحوں کا ترجمان نہیں بلکہ ایک پورے دور کا نمائندہ ہے۔ غالب ایک ایسے دور کا ترجمان ہے جو ابھی ختم نہیں ہوا۔ ایک ایسی نسل کا نغمہ جو دفنائی نہیں گئی۔"

عابد کو ان باتوں سے دلچسپی لی تھی وہ تو صرف اداسی، ذہنی کیفیت پر ہی نکا رہنا چاہتا تھا چنانچہ اس کے رخ کو دیکھ کر اور مرزا کی طولانی گفتگو سے اوب کر اچانک بات کا رخ موڑ دیتا ہے اور احمد سے کہتا ہے کہ کچھ سناؤ۔ اور شعر وشاعری کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے لیکن یہاں بھی غالب کے ہی اشعار پڑھے اور سنے جاتے ہیں۔

عظمتوں کے انیک رنگ ہوتے ہیں۔ غالب جیسے عظیم شاعر کو ہر زاویہ اور ہر پیمانہ سے جانچ پرکھا گیا ہے۔ ڈرامے بھی لکھے گئے ہیں لیکن ڈرامے کی صنفی ضرورت اور ہیئت کے پیش نظر زیادہ تر ڈرامے غالب کی حیات، شخصیت، عشق بازی، شراب نوشی یا اس نوع کی واردات کو ہی مرکز میں رکھا گیا ہے۔ شاعری کے سنجیدہ وفکری پہلو برائے نام ہی آسکے ہیں۔ اکثر ڈراموں میں غالب خود ہی موجود ہیں پوری سرمستیوں و خرمستیوں کے ساتھ، احباب کے ساتھ۔ اس اعتبار سے یہ پہلا ڈراما ہے جس میں غالب غیر موجود ہیں اور نئی نسل کے دو تین لوگ ان کی شخصیت حسن وعشق کے بارے میں کم ان کی سنجیدہ وفلسفیانہ شاعری کے بارے میں ہی بات کرتے ہیں۔ بعض مقامات پر دلچسپ اور گھریلو قسم کے مکالموں کے ذریعہ ماحول میں دلچسپی و بے تکلفی لانے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے تاکہ گاڑھا پن نہ آنے پائے نیز ڈرامے کا ماحول بنے اور فکری پہلوؤں کو تفہیم کی منزل پر بھی لے جائے۔ مثلاً "کانوں کا میل نکلواؤ۔ ان پھٹے پھٹے دیدوں کے بجائے کانوں پر چمٹے چڑھاؤ"۔ "اے ہے یہ کیا دنگا ہو رہا ہے۔ لڑنے کو یہی ایک کمرہ رہ گیا ہے"۔ "تمھارے بھائی جان آ جائیں، نہ پٹواؤں تو سہی"۔

غالب پر سنجیدہ گفتگو بظاہر ایسی ہی شکل اختیار کر لیتی ہے خصوصاً اس وقت جب دو متضاد فکر کے دانشور باہم تبادلہ خیال کر رہے ہوں اور اپنی اپنی بات پر اڑے ہوں۔ ایک مقام پر جب احمد ثریا کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہتا ہے:

"یہ تو خوب بات نکالی ثریا باجی۔ واقعی اب سوچتا ہوں تو غالب کے کلام میں اس کے تین پہلو دکھائی دیتے ہیں۔ ماضی کی شادابی اور رنگینی کی یاد، اس کے کھو جانے کا غم، حال کی بے کیفی اور ویرانی، مستقبل میں سہانے دنوں کی امید اور حسرت، قنوطیت ایک منفرد چیز ہے اور یہ واردات ایک سہ پہلو مرکب۔"

تو بات کاٹ کر اور تڑپ کر عابد کہتا ہے:

"سبحان اللہ کیا سہ شاخہ نکالا ہے۔ فلسفہ پر بحث کرتے کرتے مکاری پر اتر آئے۔ یہ منفرد ہے وہ مرکب ہے، وہ معجون ہے، وہ مربہ ہے۔ بھئی بحث کرنا ہے تو ہم سند کے بغیر کچھ سننے کو تیار نہیں۔"

ان جملوں میں فیض نے غالب سے متعلق ہی نہیں پوری شاعری بلکہ پورے ادب کے بارے میں اپنے عہد اور گرد وپیش میں ہونے والی نہ صرف بحثوں بلکہ لب ولہجہ کو بھی پیش کر کے پورے دور کی تنقیدی وتفکیری تہذیب کو پیش کیا ہے۔ اس زمانہ میں ترقی پسندی اور جدیدیت کا رجحان عام تھا۔ حسن عسکری اور دوسرے جدیدی اور اسلامی ادب کے ذریعہ قنوطی رجحان کی تلاش میں سرگرداں تھے۔ ترقی پسند اپنے ڈھنگ سے تعبیریں کرتے ہیں۔ خیالات متلاطم ومتصادم تھے اس لئے یہ ڈراما بھی تضاد وتصادم سے ہی شروع ہوتا ہے لیکن ثریا اور مرزا جو نسبتاً بزرگ اور سمجھدار ہیں ان کی متوازن اور منطقی گفتگو سے قائل اور معقول کی سطحیں ابھرتی ہیں۔ غرضکہ بعض چھوٹے چھوٹے معمولی اور دلچسپ جملوں سے قطع نظر پورا ڈراما غالب اور عہد غالب اور فلسفہ غالب کے ارد گرد رہتا ہے اور فیض نے ان مسائل کو بہت زیادہ ڈرامائی ڈھنگ سے نہ سہی لیکن سادگی اور لطافت کے ساتھ کچھ اس انداز سے پیش کیا ہے کہ جس میں ترسیل، تشکیل اور تخلیق کی پوری کیفیت سما گئی ہے۔

جیسا کہ عرض کیا گیا ڈرما کی جان عمل وحرکت ہوتی ہے، مکالمے اس کے بعد لیکن اس ڈرامے میں سب کچھ مکالمے ہی مکالمے ہیں۔ سارا زور مکالمات اور خیالات پر ہی ہے۔ کوئی چاہے تو ساز وسامان اور دیگر لوازمات سے محروم اس ڈرامے کو محض ایک گفتگو بھی کہہ سکتا ہے لیکن یہ گفتگو بھی بہر حال ڈرامائی حدوں کو چھوتی ہے اور غالب کی شاعری ہی نہیں غالب کے فلسفہ اور اس کے زمانے کو بڑے لطیف اور معنی خیز انداز میں پیش کرتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ فیض کا یہ ڈراما غالب پر پہلے اور بعد کے لکھے گئے ڈراموں سے قطعی مختلف ہے جو بہت سارے فکری، تنقیدی اور بوجھل مضامین ومقالات کو بہت پیچھے چھوڑ دیتا ہے۔

ALI AHMED FATMI



فیض سے بیگم سرفراز کی جذباتی وابستگی

ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی

فیض کی شادی ۸ ۲؍اکتوبر ۱۹۴۱ء کو لندن نژاد ایلیس کیتھرین جارج سے ہوئی تھی۔

لیکن فیض کی ایک عقیدت مند بیگم سرفراز اقبال سے قربت اتنی تھی کہ زندگی کے کئی اہم موڑ پر فیض نے انہیں خطوط لکھے اور یہ تعداد درجنوں میں ہے۔ ۱۹۷۰ء میں پہلی بار احمد فراز نے سرفراز کو فون کیا:

"آج میں تمہاری بات ایک ایسے شخص سے کرا رہا ہوں جس کی تم مداح ہو گی۔" احمد فراز نے مزید کہا۔ "تم فیض صاحب سے بات کرو۔ لو کرو بات اب۔"

اس فون کے اثر کو سرفراز اس طرح بیان کرتی ہیں:

"فیض صاحب! مجھے یکدم بادام کے پھول تالیاں بجاتے ہوئے محسوس ہوتے جیسے خاموش گزرتا موسم مسکرانے لگا ہو، پہاڑوں نے ایک گہرا سانس لیا ہو۔ اطمینان کا سانس! اس وقت میرے سامنے چند کتابیں پڑی تھیں۔ ان میں سے ایک دست صبا بھی تھی۔ تب مجھے اس چھوٹی سی کتاب کے سارے الفاظ ہاتھ کی لکیروں میں اترتے ہوئے محسوس ہوئے۔"

اور جب نام آشنائی ہو چکی تو سرفراز کی کیفیت ان ہی کی زبانی سنئے:

"جس کی خواہش تھی اس کے اچانک مل جانے کی خوشی نے میرا اعتماد بڑھا دیا تھا۔۔۔ اور میں اتنا بھی نہ کہہ سکی کہ "میرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو""

وہ مزید لکھتے ہیں: "اور یوں میری زندگی کے ایک ایسے دور کا آغاز ہوا جس کے روز و شب میں ان چند لمحوں کی گفتگو کا بڑا گہرا اور مستقل تعلق رہا۔ پھر اس کے بعد تو میرے لئے فیض صاحب کی باتیں جس کے بے انت موسموں میں ہمیشہ ٹھنڈی پھوار کی مانند رہیں۔ فیض صاحب کا فون ریسیو کرنے کے بعد، میری اس روز کی حالت کوئی نہیں جانتا۔ اپنی باتوں اور اپنے انداز سے فیض صاحب مجھے کتنے معصوم لگے تھے اور میرا جی چاہا تھا کہ میں باہر صحن میں بیٹھ کر شگفتہ پھولوں اور معصوم چڑیوں کو دیکھتے ہوئے ساری عمر گزار دوں۔ پھر اڑتے بادلوں کی زرماہٹ سے اپنے مکان کی دیواروں پہ اتنی بار فیض صاحب کا نام لکھوں کہ دیواریں اور بادل دونوں ختم ہو جائیں۔"

فیض سے کراچی میں پہلی ملاقات کے بعد سرفراز کے تاثرات اس طرح تھے:



"یہ پہلی ملاقات تھی جو ختم ہو گئی تھی۔ ایک عام سی ملاقات۔ لیکن میرے دل، میرے ذہن پہ اس ملاقات کا جو نقش ثبت ہوا اس کے بعد ہونے والی ملاقاتیں اسے ماند نہ کر سکیں۔ کتنا خاص آدمی، کتنا عام سا لگتا ہے۔ میں نے سوچا تھا، کوئی ناز کوئی ادا بڑے آدمیوں والی نہیں۔ اس روز فیض صاحب سے مل کر مجھے ایک لمحہ کے لئے تو یوں لگا جیسے کسی قدیم یونانی دیوتا کا بت اچانک اپنی آنکھیں جھپکنے لگا ہو۔"

اور جب فیض کا پہلا خط سرفراز کو ملا تو وہ کس کیفیت سے سرشار ہوئیں، ان ہی کے الفاظ میں دیکھئے:

"یہ فیض صاحب کا میرے نام پہلا خط تھا۔ جس دن مجھے یہ خط ملا تھا، میں اس بچے کی طرح خوش تھی جس کو امتحان میں پاس ہونے پہ شاباشی کے طور پہ اس کی پسندیدہ میڈم نے پھول انعام میں دیا ہو، یا جیسے اولمپکس کے میدان میں کوئی ایسا کھلاڑی سونے کا تمغہ حاصل کرے جس کا کوئی شناسا ہم وطن بھرے اسٹیڈیم میں موجود نہ ہو اور تالیوں کے اجنبی شور میں وہ بیک وقت مسکرانے اور رونے لگے۔ میں نے شام تک فیض صاحب کا خط کئی بار پڑھا۔ ہر بار اس کی خوشبو نئی محسوس ہوتی تھی۔"

فیض سے ایک ملاقات کے وقت سرفراز ذہنی طور پر پریشان تھیں حالانکہ گفتگو

کے دوران اور کھانا کھاتے وقت فیض نے ان کی اس کیفیت کا اندازہ کر لیا تھا اور ڈھکے چھپے الفاظ میں پوچھ بھی لیا تھا۔ سرفراز ان احساسات کو بیان کرتی ہیں:

"تب مجھے احساس ہوا کہ فیض نے میرے اندر جھانک کر دیکھ لیا ہے۔ وہ واقعی اہل نظر ہیں۔ چہرے کے ساتھ میرا ذہن بھی کھل اٹھا۔ میں نے خود کو اس مسافر کی طرح محسوس کیا جس کا سارا بوجھ اس کے ہم سفر نے اٹھا لیا ہو۔ اگلے روز میں راولپنڈی واپس پہنچی تو فیض صاحب میرے لئے اس روشن ستارے کی مانند تھے، اندھیری رات کے مسافر جس سے راہنمائی حاصل کر کے منزلوں سے قریب تر ہوتے ہیں۔"

ایک بار فیض اسلام آباد گئے تو مصروفیت کی وجہ سے سرفراز سے نہیں مل سکے۔ سرفراز نے انہیں شکوہ اور شکایت بھرا خط لکھا۔ جواب میں فیض نے محبت اور معذرت کے ساتھ وضاحت اس طرح کی کہ سرفراز یہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں:

"میرا جی چاہتا تھا کہ فیض صاحب مجھے ملیں تو میں ان کو یہ خط واپس کروں یا پھر ڈاک سے یہ لکھ کر واپس کر دوں کہ مجھے "یہ وضاحت بھرا خط قبول نہیں"، لیکن میں ایسا نہیں کر سکی۔ کر ہی نہیں سکتی تھی۔ ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ بھلا کوئی شخص چودھویں کے چاند کو کیسے کہہ سکتا ہے کہ تم اپنی چاندنی کا یہ حصہ واپس لے لو جو ندی کے پانی کی بجائے اداس ہوا میں تیرتا جا رہا ہے۔"

سرفراز ذہنی طور پر فیض سے بے حد قریب ہو گئی تھیں جس کا اظہار بڑی بے باکی کے ساتھ کرتی ہیں:

"فیض صاحب کی شخصیت دراصل اب میرے لئے اس سنگ میل کی طرح تھی، زندگی کے سارے راستے جس سے ہو کر گزرتے ہیں۔ میں فیض صاحب کو بہت طویل اور مفصل خط تحریر کرنا چاہتی تھی مگر ایسا نہیں کر سکی۔ میرا جی چاہتا تھا کہ یہ طویل خط فیض کے سامنے بیٹھ کر لکھوں۔ وہ سگریٹ پھونکتے رہیں اور میں انہیں خط لکھتی رہوں۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ تو ایک طرح کا پاگل پن ہے مگر مجھے ایسے ہی لگتا تھا۔"

سرفراز کا ایک اور اعتراف نامہ اس طرح ہے:

"ہمیشہ ایسا ہوا کہ فیض صاحب کا خط مجھے اس وقت موصول ہوا جب میں اس کی کمی شدت سے محسوس کرتی۔ میرے لئے یہ بالکل ایسا ہی تھا جیسے کوئی پیاسا پانی کی تلاش میں سراب کو دیکھے اور قریب پہنچنے پر وہ سراب سچ مچ پانی میں بدل جائے۔"

سرفراز نے یہ بھی لکھا ہے:

"میں نے ان کو ایک خط تحریر کیا جس میں جا بجا اپنی سوچوں کا ذکر تھا۔ اس خط کا مضمون مندر کے اس کونے کی طرح تھا جس پر کسی کی نظر نہیں جاتی۔ حالانکہ اس کونے میں بھی پھولوں کی پتیاں اور گجرے گرے ہوتے ہیں۔"

فیض اپنے خط کے ذریعہ سرفراز کی دلجوئی کرتے رہتے تھے۔ سرفراز لکھتی ہیں:

"بیروت سے فیض صاحب نے ایک خط مجھے دسمبر میں تحریر کیا۔ اس خط میں انہوں نے بہت زیادہ شگفتہ اور مزاحیہ انداز میں ذکر احوال کیا۔ دراصل ایسا انداز اور رویہ وہ محض دلداری کی خاطر اختیار کیا کرتے تھے اور ان کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ مجھے ہنسنے اور مسکرانے کا سامان فراہم کریں۔"

فیض کی شخصیت میں سرفراز نے خود کو گم کر لیا تھا۔ ان کی ذہنی کیفیت زندگی کا آئینہ اس طرح بھی بنی تھی:

"اپنی خواہشوں اور حسرتوں میں ہر شخص کے دن رات اس طرح گندھے ہوتے کہ اس کے پاس اپنی ذات یا اس سے منسوب رشتوں کے سوا کسی اور کے لئے سوچنے کا وقت ہی نہیں ہوتا۔ آنگن میں کھلے ہوئے پسندیدہ پھولوں کو گلدان میں سجانے کا وقت بھی نہیں جنہیں اگلے روز ہوا اپنے دامن میں اڑا لے جاتی ہے۔ مجھے کبھی کبھی یہ خیال بھی گزرتا ہے کہ آخر وہ کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اس کے باوجود ان پھولوں کو بچا لیتے ہیں جنہیں ہوا اڑا کر لے جانا چاہتی ہے یا جو اپنی رفاقتوں کی چھاؤں پر کسی ناپسندیدہ دھوپ کو حاوی نہیں ہونے دیتے اور ایسے میں میرے ذہن میں صرف اور صرف فیض صاحب کا نام ہی آتا ہے۔"

ذہنی اور قلبی تسکین ڈھونڈتی ہوئی سرفراز کے محسوسات جب فیض کے خطوط میں سمٹ آتے ہیں تب وہ تحریر کرتی ہیں:

"ادھر فیض صاحب ایک ملک سے دوسرے ملک، ایک شہر سے دوسرے شہر گھومتے رہے اور ادھر میرے دل و دماغ پر بھی کتنے ہی موسم گزرے۔ کبھی بار یوں احساس ہوا کہ میں کسی پہاڑی ریسٹ ہاؤس میں تنہا برف باری کی رات بسر کر رہی ہوں۔ میرے ارد گرد، آس پاس کوئی نہیں۔ اگر کچھ ہے تو پاگل ہوا جو دیوانہ وار کسی اپنے کو، کسی کھوئے ہوئے شناسا کو ڈھونڈتی پھر رہی ہے۔ بس ایسے ہی محسوسات کے درمیان مجھے فیض کا خط ملا۔"

سرفراز احساسات کے سمندر میں بار بار غوطہ زن رہی ہیں اور اپنے اندر کے جزیرے کو انہوں نے نشان زد کیا ہے:

"نیا سال۔ ہمیشہ کی طرح روشن اور اس کی دھوپ ازلی تپش میں نہائی ہوئی تھی۔ درخت، فرش، پھول، راستے، فضا، آوازیں، خوشبو، غرض سب کچھ نیا نیا لگ رہا تھا لیکن اس کے باوجود میرے اندر کہیں دور اداسی اپنے بال کھولے سو رہی تھی۔ ایسے میں نہ جانے کن خیالات میں گم میں نے ایک کارڈ خریدا اور فیض صاحب کو روانہ کر دیا۔"

فیض زیادہ تر باہر کے ممالک کا دورہ کرتے رہتے اور سرفراز ہجر کے دن گنتی رہتیں۔ ایسے میں فیض کے خطوط سے انہیں تسلی ملتی۔ وہ اعتراف کرتی ہیں:

"اس خط نے مجھے ایک عجیب سی اور بے نام سی توانائی دی جیسے کوئی تھکا ہارا ہوا ملاح اپنے بادبان سے بدگمان ہو کر کچھ دیر آنکھیں موند کر بیٹھ جائے اور اچانک آنکھیں کھولے تو اس کے اوپر سفید پرندے شریر انداز میں، ہواؤں میں غوطے لگاتے نظر آئیں۔ گویا ملاح کو احساس دلا رہے ہوں کہ کنارا نزدیک ہے۔ اگر ہم یہاں تک اڑ آئے ہیں تو تم بھی وہاں تک پہنچ ہی سکتے ہو۔ اس طرح کی کیفیت میں مجھے خود پر پیار بھی آتا تھا اور غصہ بھی۔ پیار یوں کہ فیض ساحب مجھے یوں مخاطب کرتے تھے اور غصہ اس طور کہ وہ ایسا ہر بار کیوں نہیں کرتے۔"

سرفراز اپنے بے چین جذبے کا اظہار اسطرح بھی کرتی ہیں:

"بعض اوقات میں سوچتی ہوں کہ یہ دوستی، محبت، عشق، چاہت یہ سب کیا ہے۔ لیکن مجھے اس کی سمجھ نہیں آسکی۔ ممکن ہے، بہت سے دوست یا لوگ اسے میری کمزوری تصور کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ میں اس کے باوجود ان لفظوں کی معنویت کے اعتبار اور وقار پر پورا یقین رکھتی ہوں۔ ان باتوں کے بارے میں سوچنا اور سننا مجھے اچھا لگتا ہے۔ میری خواہش ہے کہ یہ لفظ، کاش کبھی مجسم ہو کر مجھے ملنے آئیں۔ میں انہیں کمرے میں بٹھا کر دروازے کی چٹخنی چڑھادوں اور پھر ان کی باتیں سنوں۔ سنتی جاؤں۔ سنتی جاؤں۔ حتی کہ سننے اور سنانے کے لئے کچھ باقی نہ رہے۔ آوازیں ختم ہو جائیں۔ کمرہ خالی رہ جائے۔ ایسی ہی باتیں سوچتے سوچتے میں نے فیض صاحب کو ایک خط لکھا۔"

سرفراز کی چاہت کے پیش نظر فیض نے ان کے لئے ایک نظم بھی اور عنوان رکھا "جو میرا تمہارا رشتہ ہے" نظم درج ہے جس میں فیض نے اپنی محبت کا بھی اظہار کیا ہے

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدم مہ و سال
اس عشق خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
"گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے"

یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخر شب
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخر شب
صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اٹھا آخر شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخر شب
چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخر شب
کون کرتا ہے وفا، عہد وفا آخر شب
گھر جو ویراں تھا سر شام وہ کیسے کیسے
فرقت یار نے آباد کیا آخر شب
جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اول صبح
"اسی انداز سے چل باد صبا آخر شب"

(مخدوم محی الدین کا مصرعہ)

اس نظم کو پڑھ کر سرفراز نے کیسا محسوس کیا، ملاحظہ کیجئے:

"فیض صاحب کی یہ نظم پا کر مجھے خوشی ہوئی اس کا اندازہ کرنا کوئی مشکل بات نہیں۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں اس معصوم سے ننھے پرندے کی طرح ہوں جو تیز حبس کے موسم میں دور سے آنے والی بارش کی خوشبو پا کر بے قرار ہو جاتا ہے۔ یوں لگتا تھا کہ میں خود سے بے خبر ہو کر محض اڑتی جا رہی ہوں۔"

سرفراز کی اس داستان محبت میں واقعات کے خارجی عمل سے وہ داخلیت جنم لیتی ہے جو پورے وجود کا احاطہ کرتی ہے۔

فیض نے سرفراز کو جس لگاوٹ اور اپنائیت سے خطوط لکھے ہیں وہ الگ مضمون کے متقاضی ہیں۔

پیش نظر مضمون میں سارے اقتباسات سرفراز کی کتاب "دامن یوسف" سے لئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ماورا پبلیشرز لاہور سے شائع ہوئی ہے۔

DR. MANAZIR AASHIQUE HARGANVI
Kohsaar, Bhikanpur-3, Bhagalpur-812001 (Bihar)

بقیہ: فیض کی شاعری میں تضاد

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ
لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن ان کے سوا اور نہیں

"یہ ذہنی الجھن خیالی نہیں واقعی اور وہ اس الجھن سے نجات نہیں پاسکتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے شعور کی ترقی رک گئی اور ان کی شاعری کے چشمہ کا پانی خشک ہو گیا ہے۔"

ممتاز حسین: پطرس بخاری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ دیکھیں جدید شاعری کی شمع ن۔ م۔ راشد کے سامنے رکھی جاتی ہے یا فیض کے۔

ڈاکٹر وزیر آغا: میں جب فیض کی نظمیات یعنی ان کے جسمانی حسن کے سحر سے نکلا تو میں نے ان نظموں کے معنوی اوصاف کی طرف توجہ کی اور معاً مجھے محسوس ہوا کہ فیض کے پاس چند بندھے ٹکے مضامین ہیں جنہیں وہ دہراتے نہیں تھکتے۔ فیض میرا محبوب شاعر تھا جب مجھے فیض کی تنگ دامانی اور اس کی بے وجہ تکرار کا احساس ہوا تو مجھے یوں لگا جیسے میں نے کچھ کھو دیا ہے۔

رشید حسن خاں: فیض کے مزاج کی رومانیت ان کو انقلابی بننے سے روکتی رہی۔ ہاں ان کی انقلاب پسندی میں رومانیت کے عناصر شامل ہوتے رہے اور اس طرح وہ رومانی باغی بن کر رہ گئے۔ عقیدے اور مزاج کی اس کشمکش کو ان کے کلام میں واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے اور وہ آج تک اس دوراہے پر کھڑے ہیں۔ ان کی شاعری کا بڑا حصہ اسی ادھورے پن کی آئینہ داری کرتا ہے۔

مندرجہ بالا اسناد سے یہ فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے کہ فیض کی شاعری میں ذہن و دل کی کشمکش نمایاں ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ عظیم شاعر نہیں بن سکے۔

AKHTER SHAHJAHANPURI
Rangin Chawl, Shahjahanpur-242001 (U.P.) UNDIA



لفظیات فیض

رؤف خیر

اس میں شک نہیں ہر دور کا اپنا محاورہ ہوتا ہے۔ گل وبلبل، شمع و پروانہ، بادہ و ساغر کی اصطلاحیں اور علامتیں مشاہدۂ حق کی گفتگو کے لئے چھوٹی پڑ جاتی ہیں۔ دار ورسن، طوق وگلو اور زنجیر کی جھنکار بہک ٹھہرتی ہے۔ اسی طرح صحرا، سایہ، دھوپ سمندر اور ریت بھی بے مزہ لگتی ہے یعنی لفظ پر بھی معاشیات کا قانون تقلیل افادہ (Law of Diminishing Utility) لاگو ہوتا ہے۔ کثرت استعمال سے لفظ اپنا آب ورونق کھو دیتا ہے۔ بعض علامتیں کلیشے Cliche بن کر بار گزرنے لگتی ہیں۔ یہ سب بھی مگر لفظ مرتو نہیں جاتا۔ زندگی نواز ہاتھوں میں آکر مردہ لفظ بھی جی اٹھتا ہے۔ ظاہر ہے شعر وادب کا سارا دارومدار لفظ ہی پر تو ہے۔ بس شرط یہ ہے کہ لفظ کو برتنے کا سلیقہ چاہئے۔ شاعر کیا سوچتا ہے (موضوع) کس طرح سوچتا ہے (تخیل) اور اس سوچ کو کن لفظیات کے حوالے کرتا ہے اور انہیں کس طرح برتتا ہے یہی سب کچھ اس کے تعین میں مددگار ہوتے ہیں اور اس کی پہچان بناتے ہیں یہ اسلوب اک راز غیر سربستہ (Open Secret) ہے۔ معاشیات ہی کے اصول Law of Utility Return کے تحت فیض نے لفظ کی زندگی بڑھا دی ہے۔ وہ لفظ جنھیں چھونے سے دیگر شعراء کتراتے رہے فیض نے اپنا جادو جگا کر ان کا حسن بڑھا دیا۔ گل، گلچیں، صیاد، قفس جیسے بے روح الفاظ فیض کی مسیحانفسی سے لودینے لگتے ہیں

دست صیاد بھی عاجز ہے کف گلچیں بھی
بوئے گل ٹھیری نہ بلبل کی زباں ٹھیری ہے
قفس اداس ہے یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہر خدا آج ذکر یار چلے

بقول احمد ندیم قاسمی:

"فیض نے اردو غزل کی مروجہ لفظیات کو اس سلیقے کے ساتھ اور ایسے تیوروں سے برتا کہ ان لفظوں کے آفاق پھیل گئے۔ وہ فیض کے لہجے سے تازگی حاصل کرکے نئے مفاہیم سے لد گئے۔"

فیض نے Cliche کلیشے پر قم باذن اللہ کہتے ہوئے اسے حرف راہدار Pass Word یعنی سم سم بنالیا۔ جیسے

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

یہاں 'بے وجہ' سم سم کی طرح اک جادوئی لفظ ہے۔

گلوں میں رنگ بھرے باد نوبہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

یہاں سارا حسن "کاروبار" سے پیدا ہورہا ہے۔

رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

بام پر آنا یہاں جو مزہ دے رہا ہے وہی فیض کا حصہ ہے۔
شلع تگت سے فیض کو کوئی علاقہ نہیں مگر بات میں بات پیدا کرنے کا ہنر دیکھئے۔

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

مصحفی ومومن نے جس مضمون کو پامال کرکے رکھ دیا تھا اس کو پھر بام تک پہنچا دیا۔

ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے

اتنے سارے لفظوں میں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہی ہے کہ موضوع تخیل اور لفظ پرانے اور از کار رفتہ ہونے کے باوجود محض سلیقۂ اظہار کی وجہ سے اک نئی معنویت لے کے ابھرتے ہیں۔ معذرت کے ساتھ میں اک غیر ادبی مثال دینا چاہتا ہوں کہ فیض Old is Gold کے قائل ہیں۔ فیض کے پاس جو Old Scrap ہے وہ اسے ردی کے بھاؤ نہیں بیچتے بلکہ اس پرانے ذخیرے کی پالش کرکے، اسے چمکا کر وقت سے ہم آہنگ کرکے، نئے مال سے زیادہ قیمت پر بیچتے ہیں کیوں کہ انہیں معلوم ہے کہ Made in Japan اور Made in England مال کا جنوں کریز عام ہے۔

غالب نے جس خلش کو جگر کے پار مگر تیر نیم کش کی صورت میں دیکھا

سرمہ مفت نظر ہوں مری قیمت یہ ہے
تا رہے چشم خریدار پہ احساں میرا

اور چشمہ فیض ملاحظہ فرمائیے۔

پیو کے مفت لگا دی ہے خون دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

اظہار کے فرق سے بات کہاں سے کہاں پہنچ جاتی ہے۔

درد دل لکھوں کب تک جاؤں ان کو دکھلاؤں
انگلیاں فگار اپنی خامہ خوں چکاں اپنا

فیض نے اپنے دور کی عکاسی اپنے لہجے اور موجود محاورے میں کچھ اس طرح کی ہے۔

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

دیر و کعبہ اگر وا نہ ہو تو غالب اپنی خود بینی و خود آرائی کی دہائی دے کر لوٹ جاتا ہے اور فیض لوٹتے ہوئے کہتے ہیں

گلوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

اور اس غزل کا اک شعر ملاحظہ فرمائیے۔ دل اور دست عدو کا فرق بھلانے میں فیض کس نازک مقام سے گزر گئے۔

وہیں لگے ہیں جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دست عدو کے گزند کیا کرتے

دیر نہیں حرم نہیں در نہیں آستاں نہیں
بیٹھے ہیں رہگزر پہ ہم غیر ہمیں اٹھائے کیوں
(غالب)

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں
(فیض)

'امیدوار' کی وجہ سے شعر کا لطف کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔

نہ صرف یہ کہ فیض نے پرانے موضوعات اور پرانی لفظیات کو نئی زندگی دی بلکہ وہ نیا لہجہ بھی دیا جو سکہ رواں کی طرح ہاتھوں ہاتھ چلا۔ اردو شاعری میں "آشیاں سازی" آشیانہ بنانا، آشیانہ تعمیر کرنا کوئی نئی بات نہیں ہے حتیٰ کہ مجدد شعر علامہ اقبال نے بھی حرف نفی کے ساتھ شاہیں کی ایک خصوصیت بتائی تھی

پرندوں کی دنیا کا درویش ہوں میں
کہ شاہیں بناتا نہیں آشیانہ

مگر فیض کا لہجہ دیکھئے کہ پیرایہ اظہار کو کتنی وسعت دے دی

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا

"آشیاں کردن" سے استفادہ سہی مگر اردو ٹکسال میں ڈھل کر تو یہ سکہ نکلا۔ اسی انداز کا اک اور اجتہاد لفظی ملاحظہ فرمائیں۔

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

اور اسی قسم کا اک اور غضب کا شعر سنئے اور آج کی زندگی اس میں ڈھونڈیے

جو کچھ بھی بن نہ پڑا فیض لٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعا و سلام ہوتی رہی

مختصر یہ کہ اردو غزل کو نیا لہجہ، نئی لفظیات بھی دیں اور اس دور میں جب کہ غزل ہی کو فرسودہ صنف سمجھ کر مسلسل نظر انداز کیا جا رہا تھا۔ فیض نے غزل کو وقار عطا کرنے کے ساتھ ساتھ نظم کو بھی سینے سے لگایا تو نئی نظم کا دم بھرنے والوں کے چہرے اتر گئے۔ نظم کے میدان میں بھی فیض نے اپنی انفرادیت کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اقبال کے یہ فرمانے کے باوجود کہ

گیا دور سرمایہ داری گیا
تماشہ دکھا کر مداری گیا

وہ مداری ہر دور میں رہا۔ اقبال سے پہلے بھی تھا اور بعد بھی رہا چنانچہ سرمایہ داری پہ ہر دور میں طنز ہوتا رہا۔ غالب نے کوہکن کے حوالے سے طنز کیا تو جوش ملیح آبادی نے تاجداران ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام ہم غلامان ازلی کا پیام کے ذریعے اسے ہدف ملامت بنایا۔ فیض کی انفرادیت یہاں بھی ابھرتی ہے۔ "کتے" ان کے یہاں مظلومیت کی علامت ہیں مگر اپنے آقاؤں کی ہڈیاں چبا سکتے ہیں۔

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے

بس شرط اتنی ہے کہ

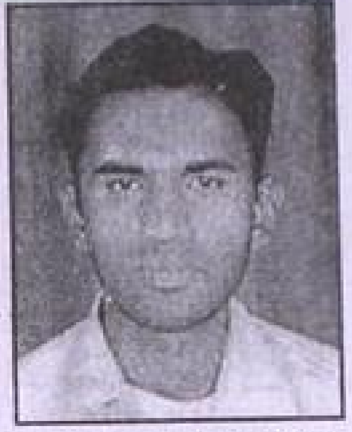
کوئی ان کو احساس ذلت دلا دے
کوئی ان کی سوئی ہوئی دم ہلا دے

فیض جس دور میں سانس لے رہے تھے وہ تمام تر نفرتوں کا دور تھا۔ سامراجیت سے نفرت غلامی سے نفرت، پھر آزادی کی شب گزیدہ سحر سے نفرت، جا بجا کوچہ و بازار میں بکتے ہوئے جسموں کی مجبوری سے نفرت، اتنی ساری نفرتوں کے بیچ رہ کر بھی فیض کا لہجہ کھردرا ہونے نہیں پاتا بلکہ اسی متانت سے جو فیض کی پہچان ہے۔ وہ کہتے ہیں۔

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے
اک فرصت گناہ ملی وہ بھی چار دن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے

وہ جاتے جاتے اپنے محبوب سے اپنے جانے کا جواز بھی بتاتے ہیں۔

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ
اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا (بقیہ صفحہ نمبر 96 پر)



فیض تعارف اور فن کی روشنی میں

اکبر علی (ریسرچ اسکالر)

فیض احمد خاں نام مگر ادب میں اپنے قلمی نام فیض سے مشہور ہوئے۔ ۱۲ر فروری ۱۹۱۱ء بمقام سیالکوٹ میں ایک معزز ومہذب گھرانے میں آنکھیں کھولیں۔آپ کے جداعلیٰ کا تعلق ہندوستان میں سین پال نام کا ایک راجپوت راجہ تھا جس کی اولاد میں ایک صاحب نے اسلام قبول کرلیا تھا۔فیض بھی اسی خاندان کے سلسلے کی ایک کڑی ہیں۔فیض کے پردادا کا نام سربلند اور دادا کا نام صاحب زادہ خاں تھا۔ فیض کے والد کا اصل نام سلطان بخش تھا لیکن بعد میں بدل کر سلطان محمد خاں کرلیا تھا۔

فیض نے تعلیم سیال کوٹ کے چرچ مشن اسکول میں حاصل کی۔اعلیٰ تعلیم لاہور گورنمنٹ کالج اور اورینٹل کالج میں حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء میں انگریزی میں ایم اے کیا۔ ۱۹۳۴ء میں عربی میں ایم اے کیا۔فارسی اور عربی کی تعلیم علامہ اقبال کے استاد شمس العلماء مولوی سید میر حسن سے لی۔

فیض کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لیتے ہیں تو دریا کے اتار چڑھاؤ کے مانند نظر آتی ہے۔طالب علمی کے زمانے میں فیض فارغ البالی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ شاعری کا شوق کالج کے زمانے سے ہی تھا۔ابتداءِ شاعری میں رنگینی ورعنائی نظر آتی ہے۔عشق کی واردات وکیفیات کلام میں جا بجا دیکھنے کو ملتی ہے۔طبیعت میں شوخی مزاج میں رنگینی فیض کی پہچان بن گئی۔

فیض کالج کی ملازمت ترک کر کے دوسری جنگ عظیم کے موقع پر فوج میں بھرتی ہوگئے اور ترقی کرتے ہوئے کیپٹن سے کرنل کے عہدے تک پہنچے۔عمدہ کارکردگی کی بنا پر حکومت برطانیہ نے ۱۹۴۶ء میں ایم بی ای کا خطاب عطا کیا بعد اس کے فوج کی نوکری سے استعفیٰ دے دیا۔ ۱۹۳۶ء کو دنیا کا سب سے مشہور لینن ایوارڈ بھی ملا۔

فیض ملازمت ترک کرنے کے بعد صحافت کی دنیا میں چلے گئے اور پاکستان ٹائمز کے چیف ایڈیٹر بن گئے۔فیض کی پاک دامانی میں راولپنڈی کیس کی غیر معمولی اہمیت ہے جس کی پاداش میں آپ ۹ر مارچ ۱۹۵۱ء کو گرفتار کر لیے گئے حالانکہ کبھی کوئی جرم ثابت نہیں ہوا کیوں کہ وہ بے گناہ و بے قصور تھے۔اس کیس میں فیض چار سال ایک ماہ گیارہ دن جیل میں رہے۔دوسری بار ۱۹۵۸ء میں جیل گئے اور پانچ ماہ کے بعد رہا ہوگئے۔اس حادثہ نے انہیں پریشان کر دیا۔وقت عملدار کے تعصبات اور نا انصافی کو دیکھ کر ان کا دل کباب ہوگیا۔وہ شاعر جو ابھی محبت کے گیت گنگنا رہا تھا انقلابی نعرہ بلند کرنے پر مجبور ہوگیا اور حالات سے شکوہ دراز ہوئے۔شعر ملاحظہ فرمائیے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے

فیض کی شاعری میں ہمیں حقیقت کی دھوپ چھاؤں کے منظر تو نظر آتے ہیں لیکن ان کا مخصوص نقطہ نظر عشق وعاشقی کے دائرہ میں گھومتا رہتا ہے۔فیض کی شاعری میں ایک مدت تک عشق ہی عشق کا غلغلہ مچا ہوا ہے۔فیض نے اپنی شاعری میں عشق کو جگہ تو دی مگر ان کے خیال عشق میں ایک نیا انداز اور منفرد نظریہ نظر آتا ہے۔لیکن ان کا عشق صرف خیالی نہیں بلکہ حقیقت اور واقعیت پر مبنی ہے۔عشق کی کیفیات کو اس طرح سماجی تقاضوں سے جوڑ دیا کہ اس میں ہمیں غم جاناں سے کہیں زیادہ غم دوراں کا احساس ہوتا ہے اور فیض شعر یوں کہتے ہیں

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض اردو شاعری کی کلاسیکی روایت سے خوب واقف تھے۔نرم ونازک لہجہ کے اس شاعر نے انقلابیت کی خاطر تغزل اور تغزل کی خاطر انقلابی ذہن کو کبھی قربان نہیں کیا۔اپنی فنی صلاحیتوں سے انقلابی فکر اور عاشقانہ مزاج کو ایسا بے معلوم جوڑ لگایا کہ زمانے نے کئی کروٹیں بدلی مگر پیوند میں جنبش نہیں آئی۔اس انداز نے ادب میں ایک نیا جمالیاتی حسن پیدا کر دیا۔فیض کی شاعری میں روایت کا عنصر نمایاں ہے لیکن خیالات کو نئے انداز میں سماجی شعور کے حوالے سے پیش کرنے کا سلیقہ خوب آتا ہے ـــ

تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں مری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں
مقام فیض کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے تو سوئے دار چلے

فیض کی شاعری میں تنگ دامانی کا گلہ تو درست ہے مگر ان کی شاعری کوئے یار سے نکل کر سوئے دار تک تو پہنچتی ہے لیکن ان دونوں مقامات کے درمیان جو مقام آتے ہیں انہیں کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔جب کہ انہوں نے اس محدود دائرہ میں وہ کمال فن کا مظاہرہ کیا ہے کہ ان کا اردو کے ممتاز شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔فیض جب کلاسیکی غزل کا خمیر تیار کر رہے ہوں گے تب ان کے ذہن میں یہ بات ضرور رہی ہوگی کہ غزل کو موجودہ حالات سے قریب کرنا ہے اور اس کے ذریعے جدید ذہنوں کی

تربیت کرنا ہے۔

فیض کی غزلیں روایاتی انداز کی نمائندگی تو کرتی ہیں لیکن کہیں کہیں جدیدیت کا پہلو بھی نمایاں نظر آتا ہے۔ رمز و ایمائیت اور الفاظ کی نغمگی فیض کی شاعری کا خاصہ ہے۔ ترنم والی بحروں کا برجستہ استعمال اور آہنگ سے جدت کا احساس ہوتا ہے۔ پرانے پیکر میں نئی تصویریں بنانے کا ہنر فیض کے یہاں دیکھنے کو ملتا ہے اور ان تصویروں میں جب وہ رنگ بھرتے ہیں تو چھپے ہوئے پہلو بھی نظر آنے لگتے ہیں اور یہ تصویر ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ اس کے خط و خال ہر ایک کو اپنے طرف متوجہ کرتے ہیں۔ ان کے لہجہ میں غنائیت اور فکروں میں انقلابیت ہے۔ فیض نے اپنی انقلابی فکروں کو تغزل کے پیرائے میں اس طرح بیان کیا کہ شاعری کا حسن بھی باقی رہا اور اپنی تفکرات کو عوام الناس تک خوبصورت انداز میں پیش کرنے کی کوشش بھی کی اور کامیاب رہے۔ چند اشعار سے کلام فیض کا رنگ سخن معلوم کیا جا سکتا ہے ؎

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گذار کے
ان میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں
رنگ پیراہن کا خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

غزل کا نرم و نازک لہجہ شاعر کو قید میں رکھتا ہے لیکن ایک پیامی شاعر ان حدود سے باہر قدم نکالتا ہے تو ناچار شاعر کو نظم کا سہارا لینا ہی پڑتا ہے۔ فیض بھی اقبال کی طرح پیامی شاعر ہیں۔ اقبال کی طرح فیض نے کوئی مربوط فلسفہ تو نہیں پیش کیا لیکن منفرد لب ولہجہ سے نظم گو شاعروں میں خاص مقام بنا لیا۔ ابتدائی کلام لفظ لفظ میں عشق و محبت کی داستان محبوب کے حسن کا سراپا لئے ہوئے ہیں۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے باد نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

حالات ہمیشہ یکساں نہیں رہتے۔ تبدیلی قدرت کا دستور ہے۔ فیض نے جب کالج کی زندگی سے باہر قدم نکالا تو دیکھا کہ افراتفری کا ماحول ہے۔ جنگ آزادی لڑی جا رہی تھی۔ ظالموں کے مظالم بڑھتے چلے جا رہے تھے لیکن اس وقت یہ ایک اچھی کوشش دیکھنے میں آ رہی تھی کہ سرمایہ داروں کے خلاف لوگ اپنی آواز بلند کر رہے تھے۔ وہ محنت کش طبقہ جو سرمایہ داروں کے ظلم و ستم کا شکار تھا ان میں بھی بیداری کے رجحانات دکھائی دے رہے تھے۔ شاعروں ادیبوں نے بھی سرمایہ داروں کے خلاف ایک تحریک چھیڑ دی جو ترقی پسند تحریک کہلائی۔ اس تحریک کے پرچم تلے جو شاعر ادیب سرمایہ داری کے خلاف اپنا ادب پیش کر رہے تھے۔ ان میں فیض بھی جا ملے اور تحریکات کے روح رواں بن گئے۔ اپنی شاعری میں عشق و محبت کی باتوں کو ترک کر کے ضرورت کی باتوں کو ترجیح دی۔ وہ ایک حساس طبیعت کے مالک تھے وطن سے بے پناہ محبت کا اظہار ان کی نظموں سے بخوبی ہوتا ہے۔ ان کی فکریں انقلابی شکل میں نمودار ہوئیں۔

فیض کی شاعری میں دو رنگی پائی جاتی ہے۔ ایک تو انقلابیت دوسرا ان کا محبوب جو ہمیشہ ان سے دامن گیر رہا۔ حکومت کے مظالم جب بڑھنے لگے زبانوں پر تالے پڑ گئے قلم رانی پر بندش لگا دی گئی لیکن ادیبوں شاعروں کے خیالات کو بیڑی نہیں پہنا سکے۔ جب جب بھی زبانوں پر قفل پڑیں گے تو اس وقت فیض کے یہ شعر ضرور دہرائے جائیں گے ؎

متاع لوح و قلم چھن گئے تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

فیض نے اردو شاعری کی بھرپور خدمت کی اور اپنی تخلیق کو حسن کے پیرائے میں بیان کیا۔ اس انداز نے انہیں اردو کا ممتاز شاعر بنا دیا۔ فیض ۲۰ رنومبر ۱۹۸۴ء کی دوپہر ایک بج کر بیس منٹ پر ہم سے رخصت ہو گئے۔ آپ کو لاہور کے ماڈل ٹاؤن کے قبرستان میں دفنایا گیا۔

AKBAR ALI
(Research Scholar)
31, Mohalla Kumbharwada, Behind Mohan Talkies,
Near Kalebhaui Haji, P.O.KHARGAON (MP)
Mob. 9977884374



فیض کی شاعری کا اجمالی جائزہ

نثار احمد صدیقی

معروف ترقی پسند، رومان پسند شاعر اور دانشور فیض احمد فیض کو اس جہان فانی سے رخصت ہوئے چھبیس سال گذر چکے ہیں۔ اردو دنیا ان کی ۲۶ ؍ ویں برسی پر بھی رسائل و اخبارات گراں قدر نمبر اور خصوصی گوشہ نکال کر خراج عقیدت پیش کر رہے ہیں۔ فیض احمد فیض ۱۳ ؍ فروری ۱۹۱۱ء کو سیال کوٹ میں پیدا ہوئے اور ۲۰ ؍ نومبر ۱۹۸۴ء کو اس جہان فانی سے منہ موڑ کر اپنی حقیقی دنیا میں چلے گئے۔ فیض، اقبال، غالب کے بعد اردو ادب کے عظیم شاعر ہیں۔ اقبال اور غالب شناسی کی طرح فیض فہمی بھی ایک تحقیقی و تنقیدی کاوش ہے۔ توصیف تنقید، توقیر، تائید، تردید اس کار ہنر کے چند اوصاف ہیں۔ ان میں توازن اور تناسب قائم رکھنا اور صحیح سیاق میں مطالعہ کرنا تنقید و تحقیق دونوں کی اساس ہیں۔

بلا شبہ فیض اپنا ایک خاص زاویہ نگاہ اور نظریہ حیات رکھتے تھے اور اس کی تشکیل و تنظیم کے لئے وہ ہمیشہ اپنے عہد سے جڑے رہے۔ فیض مخصوص معتقدات کے شاعر تھے اور تادم آخر ان اعتقادات پر قائم رہے۔ اس کا اعتراف انہوں نے اپنی نثر و نظم دونوں میں کیا ہے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ تحسین ناشناس اور سکوت سخن شناس سے بے نیاز ہو کر کیا ہے۔

فیض احمد فیض ذہین اور پڑھے لکھے شاعر تھے۔ عالمی ادب کے علاوہ انہیں مذہب کی بھی امتیازی معلومات حاصل تھی۔ انگریزی اور اردو کے علاوہ فارسی و عربی کے بھی طالب علم رہے۔ چنانچہ بعض نجی صحبتوں میں وہ اپنے موقف کی تائید میں قرآن کی آیات و احادیث کے بعض ٹکڑے بے تکان سنا دیتے تھے۔ اس کے باوجود بحیثیت شاعر انہوں نے فکر و حکمت کی گہرائیوں سے شاید شعوری طور پر گریز کیا یا پھر یہ سوچا ہو گا کہ جب اس دور میں علامہ اقبال فکر و حکمت کی معراج کو چھو چکے ہیں تو اس دور کے کسی دوسرے شاعر کو اس طرف سوچ سمجھ کر ہی رخ اختیار کرنا چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر فیض ایسا نہ کرتے تو اردو شاعری پر دوسرے کئی احسانات کے ساتھ ایک اور احسان بھی کر جاتے۔ جس طرح غوغائے انقلاب ان کے ہاں مترنم شعر میں ڈھل گیا۔ اسی طرح وہ فکر شاعری کو بھی فنی جمالیات کا ایک شعبہ بنا دیتے۔ اگر فیض فکر و حکمت کے مسائل سے گریز نہ کرتے تو ان کی شاعری بیسویں صدی میں غالب کی توسیع ثابت ہوتی۔ غالب ہمارے اردو شاعری روایت کا پہلا بڑا شاعر ہے جس نے شعور کو بھی شعر میں ڈھال دیا۔

جن لوگوں نے فیض کو پڑھا ہے انہیں اس بات کا بخوبی اندازہ ہے کہ فیض کمٹمنٹ کے بھی شاعر تھے اور ان کی پوری زندگی اس کمٹمنٹ کے لئے ہی وقف رہی۔

فیض کی شاعری کا آغاز رومان و وجدان میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ مگر جلد ہی زندگی کے تلخ حقائق سے واقف ہو گئے اور پھر اسے پھنکار کر وہ ذاتی ساکھ کے ساتھ عالم انسانیت پر مسلط ہو گئے۔ اس کے فن میں محبت اور حقیقت کا یہ امتزاج وہ جادو جگایا اور وہ طلسم کاری کیا کہ اردو شاعری کے کم ہی بڑے نام اس خصوصیت میں فیض کے مقابل لائے جا سکتے ہیں۔ ان دو بڑی طاقتوں کا امتزاج بھی فیض کے اسلوب میں نظر آتا ہے۔ یہ امتزاج اتنا متوازن ہے کہ نہ تو فیض کو محبت کرتے ہوئے اپنے انقلابی نظریات کی قربانی دینے کی ضرورت پیش آئی اور نہ ہی اس نے انقلابی موضوعات پہ نظمیں لکھتے ہوئے اسے عشق اور انقلاب دونوں پر بیک وقت محبوب رہے اور یوں فیض کا نہ صرف اپنا اسلوب خاص صورت پذیر ہوا بلکہ اس نے اپنے زمانے کے شاعروں کا بھی ایک اسلوب متعین کر دیا۔ ساحر لدھیانوی اور احمد فراز اس کی مثال ہیں۔

فیض کی ڈکشن سے متعلق بھی بہت سارے لوگوں کو غلط فہمیاں ہیں۔ فیض کی ڈکشن کے متعلق احمد ندیم قاسمی یوں رقم طراز ہیں:

”فیض کی ڈکشن کو دیکھئے کہ جس طرح غالب نے اپنے وقت میں اردو غزل کی زبان سراسر بدل ڈالی اور جس طرح اقبال نے اردو شاعری پر زبان کے معاملے میں متعدد جہات کھول دیں اس طرح کا انقلاب فیض کی ڈکشن میں نہیں مگر فیض اپنی طلسم کاری سے یہاں بھی باز نہیں آیا۔ اس نے اردو شاعری اور خاص طور پر اردو غزل کی مروجہ روایتی لفظیات کو اس سلیقے کے ساتھ اور ایسے تیوروں سے استعمال کیا کہ ان لفظوں کے آفاق پھیل گئے۔ ان کے دامان معانی میں وسعتیں پیدا ہو گئیں اور وہ مروجہ روایتی مفہوم دینے کے بجائے فیض کے لہجے سے تر و تازگی حاصل کر کے نئے مفاہیم پیدا کئے۔ دار و رسن، قفس، صیاد وغیرہ ایسے الفاظ ہیں کہ وہ گھس گھسا کر اور پٹ پٹا کر بے معنی ہو رہے تھے مگر فیض کے معجز نما لمس نے انہیں نئی زندگی بخش دی۔“

احمد ندیم قاسمی کے پیراگراف سے یہ ظاہر ہوا کہ فیض احمد فیض نے جو ڈکشن میں جدت پیدا کی وہ کسی اور کے بس کی بات نہیں تھی۔ قاسمی نے فیض کے ڈکشن سے متعلق دوسری جگہ یوں رقم طراز ہیں:

”فیض نے خواجہ حافظ شیرازی کی ڈکشن کو اپنی غزلوں میں اتنی استادانہ مہارت سے برتا کہ فارسی کی ساری ترکیبیں، بھی علامتیں اور تشبیہیں و استعارے پیکر اردو کا سرمایہ بن گئے اور آج قریب قریب اس ڈکشن پر ہی آج کے شعرا عمل پیرا ہیں۔“

مندرجہ بالا جملوں سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ فیض احمد فیض فارسی کے مایہ ناز

شاعر حافظ شیرازی کی ڈکشن کو اپنی غزلوں میں اس ہوشیاری اور استادانہ طریقے سے استعمال کیا ہے کہ وہ اردو کا پیکر بن گئے۔ یہ خوبی کسی دوسرے اردو شعراء کے یہاں نہیں ملیں گے۔

فیض احمد فیض کے یہاں صرف انقلاب، انقلاب کا نعرہ نہیں ملتا بلکہ ان کی شاعری میں حسن وعشق کے پھول، گلشن، موسم بہار اور مہک خوشبو کا تذکرہ بھی کثرت سے ملتے ہیں۔

دشت تنہائی کھل رہے ہیں ترے پہلو کے سخن اور گلاب
قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشیں گل کے نکھار کا موسم
ہم اہل قفس تنہا بھی نہیں ہر روز نسیم صبح وطن
یاروں سے معطر آتی ہے اشکوں سے منور جاتی ہے
مہک رہی ہے فضا زلف یار کی صورت
ہوا ہے گرمیٔ خوشبو سے اس طرح سرمست
رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں
دل عشاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

مندرجہ بالا اشعار پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے بڑی بھرپور اور شاداب زندگی گذاری اور وہ دنیا اور اہل دنیا سے کچھ لینے والے نہیں دینے والوں میں سے تھے۔ انہوں نے شاعری کو اپنے دور کے دکھ درد سے آشنا کیا اور اردو کو ایک نیا لہجہ اور آہنگ بخشا۔ "یاد ماضی سے غم گیں اور دہشت فردا سے نڈھال" لوگوں کو انہوں نے ایک تازہ ولولہ اور جینے کی نئی آس دی، سہمے ہوئے لب بستہ انسانوں کو انہوں نے جرأت گفتار سکھائی۔

بول کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول، کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دکاں میں
تند ہیں شعلے سرخ ہے آہن
کھلنے لگے قفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے
بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہو کہہ لے

فیض احمد فیض اپنے عہد کی آواز نہیں بلکہ ان کا عہد ان کی آواز بن گیا تھا۔

NISAR AHMED SIDDIQUI
C/o. Santa Medical Store, Purani Karim Ganj,
GAYA-823001. Mob. 09546308801,09835205497

بقیہ: فیض احمد فیض کی سیاسی بصیرت

"ایک نغمہ کربلائے بیروت کے لئے" پر اور بیروت پر ان کی دیگر نظمیں، مرثیہ خوانی نہیں، بلکہ عزم جہاد کی نمائندہ ہیں:

بیروت نگار بزم جہاں
بیروت بدیل باغ جناں
بچوں کی ہنستی آنکھوں کے
جو آئینے چکنا چور ہوئے
اب ان کے ستاروں کی لو سے
اس شہر کی راتیں روشن ہیں
اور رخشاں ہے ارض لبنان
بیروت نگار بزم جہاں

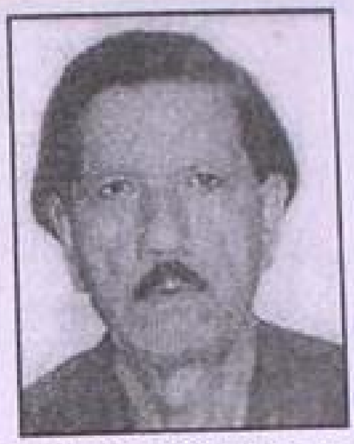
ہر ویراں گھر، ہر ایک کھنڈر
ہم پایہ قصر دارا ہے
ہر غازی رشک اسکندر
ہر دختر ہمسر لیلیٰ ہے
یہ شہر ازل سے قائم ہے
یہ شہر ابد تک دائم ہے
بیروت نگار بزم جہاں
بیروت بدیل باغ جناں

دو نظمیں فلسطین کے لئے، فلسطینی بچے کے لئے "لوری" کیا کریں اور اس موضوع پر دیگر شعری تخلیقات "لوٹس" کے اداریوں کا ماحصل ہی تو ہیں۔

فیض کا سارا شعری سرمایہ "نسخہ ہائے وفا" کے نام سے شائع ہوا، مگر مکمل فیض کے لئے "پاکستان ٹائمز" اور "لیل ونہار" کے ساتھ "لوٹس" کے اداریوں کا انتخاب بھی مد نظر رکھنا ضروری ہے۔

کتابیات: (۱) "نسخہ ہائے وفا" مکتبہ کارواں، کچہری روڈ لاہور
(۲) "سخن در سخن" از سید سبط حسن مکتبہ دانیال، کراچی
(۳) مضامین محمد علی صدیقی، کراچی۔
(۴) روشنائی، از سید سجاد ظہیر، کراچی ایڈیشن
(۵) لوٹس (انگریزی) صرف تین شمارے
(۶) ارتقا کراچی، مخدوم نمبر

SHAMEEM FAIZI
Ed. "Mahnama Hayat"



فیض کی شاعری میں تضاد

اختر شاہجہاں پوری

شمس الرحمن فاروقی نے ایک جگہ لکھا ہے کہ فیض کا بڑا کارنامہ دراصل یہ ہے کہ انھوں نے کلاسیکی اصطلاحاتی الفاظ کو دوبارہ زندہ کیا اور انھیں غزل میں مقبول کیا ورنہ فیض کے زمانے میں یہ سب خوبصورت الفاظ یا تو ترک ہو چکے تھے یا اپنے معنی کھو چکے تھے۔ اس جواب میں دو مشکلیں ہیں۔ یہ بیان مخدوش ہے کہ دار و رسن، قفس و نشیمن وغیرہ الفاظ کسی بھی وقت اپنے معنی کھو سکتے ہیں۔ یہ الفاظ دراصل ایک پورے رسومیاتی نظام کا حصہ ہیں اور ان پر غزل کی دنیا کے تمام مفروضوں کا دار و مدار ہے۔ جب تک وہ رسومیاتی لفظ مثلاً جور و ستم میر کے شعر میں بامعنی ہو اور آج کے زمانے کے شعر میں بے معنی ہو۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ جور و ستم قسم کے الفاظ اپنی دل کشی اور تازگی کھو چکے تھے۔ فیض نے انھیں دوبارہ دل کشی اور تازگی عطا کی۔ پھر سوال اٹھے گا کہ فیض نے یہ کارنامہ کیوں انجام دیا۔ آپ جواب دیں گے کہ فیض نے انھیں سیاسی معنی عطا کئے لیکن پھر وہی مشکل آن کھڑی ہوگی کہ فیض کے شعر میں سیاسی معنی کی دریافت ان معلومات پر مبنی ہے کہ فیض سیاسی اور انقلابی شخص تھے۔ لہٰذا کلاسیکی رنگ و آہنگ والے الفاظ میں جو دلکشی اور تازگی ہم فیض کے شعر میں دیکھتے ہیں وہ اس وجہ سے کہ ہم جانتے ہیں کہ فیض کے کچھ سیاسی عقائد تھے۔ یعنی فیض نے ان میں کوئی شاعرانہ خوبی نہیں پیدا کی۔ یہ تو محض ان کی سیاست کا کرشمہ تھا۔

فیض کی شاعری میں چند غزلوں اور نظموں کو چھوڑ کر سب کی سب سیاست گزیدہ محسوس ہوتی ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ فیض کے یہاں فکری تضاد ملتا ہے۔

فیض مزاجاً رومانی شاعر تھے لیکن فیض نے جس زمانے میں آنکھیں کھولیں اس میں سامراجی طاقتیں کمزور اور پسماندہ ممالک پر تسلط جمائے ہوئے تھیں اور ان کا طرح طرح سے استحصال کر رہی تھیں۔ فیض چونکہ ایک حساس ذہن کے مالک تھے اس لئے ان کو یہ دیکھ کر بڑا دکھ ہوا۔ انھوں نے اپنی شاعری میں اس وقت کے مسائل کا شدت سے ذکر کیا۔ عوام کو انقلاب برپا کرنے کی ترغیب دی اور تسلط جمائے ہوئے لوگوں کو غیر انسانی حرکتیں کرنے پر بہت کچھ کہہ ڈالا لیکن یہ بات سچ ہے کہ اگر فیض کی شاعری پر انقلاب کے وقتی اثرات نہ ہوتے تو ان کی شاعری اس صدی کی بہترین شاعری کہی جا سکتی تھی۔ فیض نے جہاں نعرے بازی سے اجتناب کیا ہے وہاں ان کی شاعری زیادہ طاقتور دکھائی دیتی ہے۔

فیض چونکہ ایک خاص نظریئے کے علمبردار تھے اس لئے ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی نظریئے کے زیر اثر معلوم ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں پر شکوہ الفاظ کی بھرمار ہے۔ ان کی شاعری میں سادگی، نرمی اور نزاکت جو اچھی شاعری کا خاصہ سمجھی جاتی ہے غزلوں میں تو نظر آتی ہے نظموں میں نہیں۔

اس معاملے میں فیض دوسروں کے مقابلے میں خوش قسمت ثابت ہوئے کہ ان کے ہم عصروں نے ان کی شاعری کے روشن پہلوؤں پر ہی لوگوں کی توجہ مرکوز کرائی۔ خامیوں کی نشاندہی نہیں کی جس کی وجہ سے وہ اپنی زندگی میں بڑے شاعر کی حیثیت سے ہی جانے گئے۔ لیکن اب ان کے کلام کا بڑی احتیاط سے جائزہ لیا جا رہا ہے اور اس کے اسقام کو بھی منظر عام پر لایا جا رہا ہے۔ یہ اس لئے اور بھی کہ جن حالات میں وہ شاعری کی گئی تھی وہ حالات تبدیل ہو گئے ہیں۔

فیض دل سے رومانی شاعر تھے لیکن ذہنی طور پر اشتراکیت پسند تھے۔ ان کی اشتراکیت پسندی نے ان کو شہرت، عزت اور دولت سے تو نوازا لیکن ان کو عظیم شاعر نہیں ہونے دیا۔ اس لئے کہ فیض نہ تو رومانی شاعر ہو پائے اور نہ باغی، ذہن و دل کے اسی تضاد نے انھیں بہت نقصان پہنچایا لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ان کی شاعری کم رتبہ ہے لیکن ان کی شاعری میں اچھی شاعری کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ خاص طور سے غزلوں میں۔ چند شعر مثال کے طور پر پیش ہیں ۔

نقش فریادی:

منت چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پا سمجھے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گزار کے

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پہ جو تیری رہ گذر بھی نہیں

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

ساری دنیا سے دور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو جائے

وہ رنگ ہے امسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِ نظر سے
پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

دستِ صبا:

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم
یہ دل کے داغ تو دکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم
وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں
وہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے
صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ چمن
تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں
ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے
اپنی نظر میں، کیا کریں پھیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہو تھا صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم

زنداں نامہ:

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی
شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
لمبی ہے غم کی شام مگر شام ہی تو ہے
وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر دیکھو تو

نقش فریادی، دست تہہ سنگ، دست صبا، زنداں نامہ اور سر وادی سینا کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوگئی کہ فیض کی نظمیں غزلوں کے مقابلے میں زیادہ بلند آہنگ نہیں اور وہ نظموں کے لہجے میں توازن بھی برقرار نہیں رکھ سکے۔ مثال کے طور پر نظموں کے کچھ بند پیش کرتا ہوں ۔

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی نہ کوئی علم

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں
جسم خستہ ہے ہاتھوں میں یارا نہیں

انتساب

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام
پوسٹ مینوں کے نام
تانگے والوں کے نام
ریل بانوں کے نام
کارخانے کے بھولے جیالوں کے نام
بادشاہِ جہاں والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض
دہقاں کے نام
جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکالے گئے
جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھالے گئے

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے پر
ہر ایک اپنے مسیحا کے خوں کا رنگ لئے
ہر ایک وصلِ خداوند کی امنگ لئے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دو نیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

خورشیدِ محشر کی لو

کب تمہارے لہو کے دریدہ علم
فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم
از کراں تا کراں کب تمہارے قدم
لے کے اٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم
جس میں ڈھل جائے گا آج کے دن کا غم
سارے درد و الم، سارے جور و ستم
دور کتنی ہے خورشیدِ محشر کی لو
آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

مندرجہ بالا نظموں کے علاوہ اور بھی بہت سی نظمیں ہیں جنھیں مثال کے طور پر پیش کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً دعا، دستِ تہہ سنگ، ہنکیا تنگ وغیرہ۔

یہاں فیض کی شاعری سے متعلق چند اہم لوگوں کی رائے لکھنا ضروری سمجھتا ہوں تاکہ فیض کی شاعری کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ کلیم الدین فیض کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں ملاحظہ ہو ۔

(بقیہ صفحہ نمبر 102 پر)

فیض: انقلاب کا مردِ آہن

سجاد حسین جعفری

ہم جب دنیائے اردو ادب پر طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو گذشتہ صدی کو اردو ادب کی سب سے زرین صدی کے نام سے موسوم کر سکتے ہیں۔ جس میں اردو کی بہت سی تحریکوں نے اپنی عملی سرگرمیوں سے پورے ادب کو لالہ زار کیا ہے۔ سماجی نقطہ نظر سے ترقی پسند تحریک نے ظلم اور جبر و استبداد کے خلاف زبردست ہلچل پیدا کی جہاں ایک جانب ادب میں قدامت پرستی کے بندھے ٹکے اصولوں کو بالائے طاق رکھا گیا اور روایات کی جکڑبندیوں کو توڑا گیا اصطلاحات اور علامتوں کو نیا جامہ پہنا کر ادب برائے زندگی کے نعروں کو نہایت زور و شور کے ساتھ روبہ عمل لایا گیا وہیں دوسری جانب ادب کے ذخیرہ میں ایسے نادر اور نایاب ادیبوں اور شاعروں کا اضافہ ہوا جس نے اردو ادب کو عالمگیری مقام دلانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔ پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سجاد ظہیر، سعادت حسن منٹو، شوکت تھانوی، مخدوم محی الدین، مجاز لکھنوی، سلام مچھلی شہری، سردار جعفری، ن۔م۔راشد، جاں نثار اختر، اختر حسین رائے پوری، مجنوں گورکھپوری اور فیض احمد فیض جیسی عظیم قد آور شخصیات نے اردو ادب کے ذخیرہ کو مالا مال کیا۔

کمیت اور مقدار کے لحاظ سے اس عہد کی سب سے اہم خوبی یہ رہی کہ اردو ادب کی ابتداء سے لے کر صدی کے نصف اول تک جتنا بھی ادب تخلیق کیا گیا اس سے کہیں زیادہ صدی کے نصف دوم کے محض چند سالوں میں ادب کا سرمایہ بنا۔ جب ہم اس ذخیرہ پر نظر ڈالتے ہیں تو بہت سی تخلیقات ہماری آنکھوں کو خیرہ کرتی ہیں اور اپنے خالقوں کو بام عروج پر متمکن کرتی ہیں۔ ان میں سب سے اہم اور ممتاز نام فیض احمد فیض کا ہے جس نے اپنے قلم کی سیاہی سے پورے عہد کو منور کر دیا۔

فیض اہم ہمہ جہت شخصیت کا مالک تھا جس کی شاعری برصغیر کی جغرافیائی حدود کو توڑ کر پورے عالم کو مسحور کرتی ہے۔ کبھی وہ ایک ایسا سیاست داں نظر آتا ہے جو جبر و استبداد کے خلاف سینہ سپر ہوتا ہے تو کبھی وطن عزیز کی محبت میں سرشار ہو کر فوجی لباس زیب تن کئے ہوئے، بندوق ہاتھ میں لئے سرحد پر کرنل کے فرائض انجام دیتا ہے اور جب نازک موقع آتا ہے تو قلم ہاتھ میں لے کر صحافت میں معرکہ آرائی کرتا ہے۔ دبے کچلے لوگوں اور مزدوروں کا مسیحا بن جاتا ہے اور کبھی وقت آنے پر اپنے ہی لوگوں کی سازشوں کا شکار ہو کر پابہ زنجیر ناتواں قیدی ہو کر اپنی ہی انگلیوں کو اپنے خون میں ڈبو کر عشق کی داستانِ وفا تحریر کرتا ہے اور پر اعتماد لہجہ میں کہتا ہے کہ ۔

لاؤ تو قتل نامہ مرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سر محضر لگی ہوئی

فیض کی آفاقی شخصیت کو سمجھنے کے لئے اس کی حیات کے تمام پہلوؤں کا مطالعہ کرنا ضروری ہے جس میں ایسے عناصر پوشیدہ ہیں جن کی بدولت فیض اپنے عہد پر چھائے ہوئے دکھائی دیتے ہیں ان عناصر کی وجہ سے ہی فیض میں انقلابی جذبہ ٹھاٹھیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ جو پہلو بہ پہلو فیض کی شخصیت کو تہہ دار بناتا جاتا ہے۔ یہی جذبہ عوام الناس میں عدل و انصاف اور انقلاب کی گرمی پیدا کرتا ہے۔

فیض کے سینے میں ایک دردمند انسان کا دل دھڑکتا ہے جو ہر وقت اس کے ہوش و حواس کو بیدار رکھتا ہے۔ اسی جذبے کے سبب فیض نے عدل و انصاف کو ہمیشہ ملحوظ خاطر رکھا اس ضمن میں بچپن کے اس واقعہ کا ذکر کرنا ضروری ہے جس نے فیض کو ایک آہن نما انسان بنا کر ظلم و استبداد کے مدمقابل لا کھڑا کیا۔ اپنے ایک انٹرویو میں وہ فرماتے ہیں:

''ہم جب پہلی مرتبہ مدرسہ بھیجے گئے تو بڑے اہتمام کئے گئے ہمیں مخملی کپڑے پہنائے گئے آنکھوں میں کاجل لگایا گیا یہ اور وہ نہ جانے کیا کیا اہتمام ہوئے دو گھوڑوں والی گاڑی میں بٹھا کر مدرسہ بھیجا گیا۔ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ ٹاٹ بچھا ہوا ہے اور میلے کچیلے کپڑوں میں بے چارے بچے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے لگے کہ یہ کون سا جانور آ گیا۔ بچوں نے ایسے ٹھٹھے لگائے ہم پر کہ بہت ندامت ہوئی اور فیصلہ کیا کہ آج کے بعد ہم یہ نہیں کریں گے کہ ہم اور یہ الگ الگ ہیں۔''

(شبستاں فیض نمبر، صفحہ ۱۸۶)

بظاہر یہ واقعہ بہت معمولی معلوم ہوتا ہے لیکن جب ہم اس کا نفسیاتی تجزیہ کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ فیض کو ناانصافی اور نابرابری پسند نہیں تھی۔ یہ جذبہ بچپن سے ہی اس کے دل و دماغ کی آبیاری لاشعوری طور پر کر رہا تھا جب وہ تنومند اور خوبرو ہو کر عہد شباب کی منزل پر پہنچے تب پورے آب و تاب اور روانی کے ساتھ نمایاں ہونے لگا جس کا عکس ٹریڈ یونینوں کی سربراہی اور ترقی پسند تحریک کے سرگرم کارکن کے قلم سے نازک لہجہ میں نکلنے والے اشعار کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے ابلتی ہے کہ نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

وطن کی محبت انسان کا فطری جذبہ ہے۔ فیض میں بھی یہ جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ وہ اپنے ملک کی عوام سے بے پناہ محبت کرتے تھے۔ ایک فیاض اور فراخ دل انسان ہمیشہ ان میں رچا بسا رہنا زیادہ پسند کرتا ہے۔ ان سے محبت اور ہمدردی کا اظہار ان کے اشعار میں کثرت سے ملتا ہے۔ عوام کے انقلابی جذبہ کو بیدار رکھنے کے لئے قید و بند کی اور وسائل کے محدود ہونے کے باوجود اپنے انقلابی عزم کو دہراتا رہتا ہے۔

اے خاک نشینوں اٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اچھالے جائیں گے
اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھیں گے تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے
کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے
اے ظلم کے ماتو لب کھولو چپ رہنے والوں چپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اٹھے گا کچھ دور تو نالے جائیں گے

عموماً انقلاب کے جذبے کو زبان کے اظہار میں چیخ و پکار اور گھن گرج کا سہارا لینا ایک فطری عمل ہے جس کی مثال شاعر انقلاب جوش ملیح آبادی کے انقلابی اشعار میں ان کا جوش و خروش اور شور شرابہ ہے لیکن اس کے برخلاف فیض کے انقلاب کا جذبہ نہایت گرم جوشی اور نرم و نازک لہجہ کے ساتھ ریشمی انداز بیان کا مظہر ہے۔ الفاظ کی شیرینی اور جملے کی نرم روی سے اس کے جذبے میں کہیں لچک اور کمزوری نہیں دکھائی دیتی۔ اسرائیل کے جبر و استبداد کے مقابلے فلسطینی مجاہدین آزادی کے درد بھرے نوحے اور نظم ایرانی طلبہ کے نام! اس کی بہترین مثال ہیں۔

مایوسی قوائے انسانی کو مضمحل، دل و دماغ کو سست اور حوصلوں کو پست کر دیتی ہے۔ نتیجتاً ساری صلاحیتیں ضائع ہو جاتی ہیں اور یہ صورت حال اس وقت اور دوگنی ہو جاتی ہے جب حساس ذہن آدمی ان مشکلات سے دو چار ہوتا ہے اور اس کے سامنے کوئی سانحہ وقوع پذیر ہوتا ہے۔ شاعر کا ذہن بھی نازک اور حساس ہوتا ہے۔ اس لئے اس پر ان اثرات کا پڑنا لازمی ہے۔ فیض بھی ان مشکلات سے گذرے ہیں لیکن وہ مایوسی اور رنجیدگی کے سامنے کبھی خمیدہ کمر نہیں ہوئے۔ برصغیر کی آزادی ایک خوش کن اور فرحت بخش لمحہ تھا لیکن ساتھ ہی ہندو پاک کی تقسیم ایک زبردست سانحہ تھا جس نے ملک عظیم کے ہر فرد کو مضطرب اور رنجیدہ کر دیا ہر شخص ایک انجانے خوف کے ماحول سے گذر رہا تھا۔ تقسیم کے نتیجے میں ہونے والے فسادات نے ہر شخص کی سوچ و فکر میں ہل چل پیدا کر دی تھی۔ ایسے حالات نے فیض کے دل و دماغ کو بھی جھنجھوڑا لیکن وہ مایوس نہیں ہوئے اور اپنے انقلابی سفر کو جاری رکھا۔

یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
نجات دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

افراتفری، قتل و غارت گری، مایوسی اور ذہنی ہیجان کے مناظر دیکھنے کے باوجود فیض نے اپنے انقلابی سفر کو کبھی درماندگی کا شکار نہیں ہونے دیا۔ انصاف و انقلاب کا سفر جو ٹاٹ پٹی سے شروع ہوا تھا وہ قید و بند اور تقسیم کے سانحہ کے بعد بھی نہیں رکا۔ یہ سلسلہ ۲۰ نومبر ۱۹۸۴ء کو لاہور میں فیض کے ابدی نیند سونے کے بعد جاری رہا۔ حق و انصاف اور انقلاب کا سفر اب بھی جاری ہے۔

SAJJAD HUSAIN JAFRI
(Lecturer Government Girls' College, Khargon)
Mob. 09826577985,08269124462

فیض کی نظم اقبال کا مطالعہ



ڈاکٹر ناظم الدین منور

فیض احمد فیض نے شعری مجموعہ نقش فریادی میں نظم اقبال لکھی ہے:

آیا ہمارے دیس میں اک خوش نوا فقیر
آیا اور اپنی دھن میں غزل خواں گذر گیا
سنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبا سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اتر گیا
اب دور جا چکا ہے وہ شاہ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں مقیم ہے
اور اس کی لے سے سینکڑوں لذت شناس ہیں
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور اس کا خروش اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثل شعلہ، جوالہ، تند و تیز
اس کی لپک سے باد فنا کا جگر گداز
جیسے چراغ وحشت صر صر سے بے خطر
یا شمع بزم صبح کی آمد سے بے خبر

فیض کہتے ہیں اقبال جن کی آواز دلکش جن کا کلام دلنشیں ہند میں پیدا ہوئے اقبال نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا لیکن اقبال کے کلام میں نظمیں زیادہ ہیں۔ اقبال کے کلام کا اپنا ایک مخصوص رنگ ہے جو دوسروں سے جداگانہ ہے۔ اقبال نے ہیئت کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ اقبال اشعار کے ذریعہ اپنے دلی جذبات کی ترجمانی کرتے ہیں۔ مخالفین کی کبھی پرواہ نہیں کی۔ اقبال نے اپنے کلام کے ذریعہ مایوس قوم کے اندر ایک نیا جذبہ پیدا کیا۔ اقبال نے اپنے اشعار کے ذریعے مردہ دلوں کو زندہ کیا۔ ساکت ذہن کو جھنجھوڑا۔ مستقبل سے مایوس قوم کو امید کی روشنی بتائی۔ روشن مستقبل کی طرف اشارہ کیا کہ تاریکی ہمیشہ باقی نہیں رہتی ایک نئی صبح پیام لے کر آئے گی۔ امید و یقین کا پیام دیا۔ اس دور میں بہت کم لوگ اقبال کے کلام، مفکرانہ خیالات، فلسفہ، خودی اور خون جگر کو سمجھ سکے۔ اقبال کا کلام سینکڑوں انسانوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوا اور ایک امید افزا پیام بن گیا۔ اقبال نے اپنے فلسفہ کو نظم ساقی نامہ میں پیش کیا کہ زندگی ہر دم محرک ہے ہر جگہ حرکت و انقلاب ہے۔ اقبال نے اپنی طویل نظم شکوہ میں مسلمانوں کے شاندار ماضی کو پیش کرتے ہوئے موجودہ زبوں حالی کا تذکرہ کیا۔ یہ نظم اس دور کے مسلمانوں کے دلی جذبات کی ترجمان تھی بعد میں جواب شکوہ لکھ کر اقبال نے عمل و جہد کی دعوت دی۔ شمع و شاعر میں مسلمانوں کا مقام، راہ عمل، قومی زوال اور درخشاں مستقبل کو پیش کیا۔ اقبال مسلمانوں کے زوال کے اسباب بے عملی تن آسانی، انفرادی کردار کا خاتمہ، اخلاقی پستی، موثر قیادت کا فقدان، آپسی نفاق اور انتشار بتاتے ہیں۔ وطن سے محبت کی بے مثال نظم ترانہ ہندی ہے جو آج لاکھوں عوام کی زبان پر جاری ہے۔ نظم ہمالہ کے ذریعہ ہندوستان کی تاریخ بیان کی۔ پرندے کی فریاد کے ذریعہ اہل وطن کے دلوں میں آزادی کی شمع روشن کی۔ ترانہ ملی کے ذریعہ ملی اتحاد کا ثبوت پیش کیا۔ فیض کہتے ہیں اقبال کا کلام آج بھی اپنا ایک منفرد مقام رکھتا ہے۔ اقبال کی شاعری کا بنیادی فلسفہ خودی ہے۔ انسانی زندگی کا آغاز اپنی خودی کا شعور ہے۔ اقبال جذبات و تخیل کے ساتھ امید آفرینی اور آزادی پر زور دیتے ہیں۔ انسانیت کو تکمیل کے مدارج کا پتہ بتاتی ہے۔ خودی پوشیدہ انسانی قوتوں کے سرچشمے کا پتہ دیتی ہے اور انسان کو فعال اور ذی ہوش بناتی ہے۔ خودی کی بنیاد پر ذہنی اور عملی قوت کارآمد ہوتی ہے۔ عمل خودی کا سرچشمہ ہے خودی کا رہنما عشق ہے۔ عشق مرد مومن کی صفات ہے۔ فیض کہتے ہیں اقبال کا کلام اپنے اندر ایک رہنمایانہ صفات رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ایسا معلوم ہوتا ہے ابھی لکھا گیا ہے۔ اقبال سرمایہ دارانہ نظام، اشتراکیت، مادہ پرستی کے مخالف تھے۔ عمل مسلسل اور جہد تسلسل جاری رکھنا چاہئے راہ طلب میں آگے بڑھنا چاہئے۔ سکون، جمود، ٹھہراؤ انسان کے لئے موت کا پیام ہے۔ اقبال سوز و خلوص پر زور دیتے ہیں۔ یہی خلوص جس کی پرورش جذبے کے آغوش میں ہوتی ہے۔ سوز و خلوص کو خون جگر سے تعبیر کرتے ہیں۔ خون جگر کے بغیر سارے نقش ناتمام ہیں۔ اقبال کے مرد مومن میں علم و محبت، عقل و عشق ہے۔ لالہ اور شاہین اقبال کی محبوب علامتیں ہیں۔ اقبال افراد کی سیرت پر لالہ صحرائی خاموشی و دل سوزی اور شاہین کی طرح فقر و غنا، غیرت و حمیت اور وسیع النظری چاہتے ہیں اور کہتے ہیں بلند مقاصد عمل کے بغیر بے معنی ہیں۔ تاریخ اقوام کی زندگی کے لئے قوت حافظہ کا حکم رکھتی ہے۔ اقبال نے عقل کے مقابل عشق کو ترجیح دی۔ عشق کے بغیر منزل تک پہنچنا ممکن نہیں۔ عشق کی مدد کے بغیر عقل آگے نہیں بڑھ سکتی۔ عقل جہاں پس و پیش ہے عشق رہبری کرتا ہے۔ ایسے کارنامے جس نے قوموں کی زندگی بدل دی اسی جذبہ (عشق) کے تحت انجام پائے۔ اقبال عقل کے خلاف نہیں جدید تہذیب اور عقل پرستی کے مخالف ہیں۔

DR. NAZUMUDDIN MUNAWWAR Cell: 9440596586
H.No.2-7-510/1, Mukrampura, Karimnagar-505001 (AP)

فیض احمد فیض کی سیاسی بصیرت

شمیم فیضی

مخدوم محی الدین کی صد سالہ سالگرہ کے جشن کے دوران بہت سے مقالہ نگاروں نے مخدوم اور فیض کی شاعری کا تقابلی جائزہ لیا جو غلط بھی نہیں کیوں کہ یہ دونوں ہی شاعر ترقی پسند ادبی تحریک کے دو درخشاں ستارے ہیں جنہوں نے ادبی استعاروں کو نئی سیاسی معنویت عطا کی۔ ان تقابلی جائزوں میں بالعموم یہ تاثر قائم کرنے کی کوشش کی گئی کہ رومانی استعاروں اور روایتی شعری زبان کے استعمال کی وجہ سے فیض کا سیاسی تاثر پھیکا پڑ جاتا ہے۔ بعض معاندانہ مضامین میں فیض کی سیاسی بصیرت کو بھی چیلنج کرنے کی کوشش کی گئی۔

جہاں تک رومانی استعاروں اور روایتی شعری زبان کے استعمال کا تعلق ہے تو سچائی یہ ہے کہ اس میں بھی فیض نے نئی جہت پیدا کی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے اپنے مضمون "فیض احمد فیض اور روایتی شعری زبان" میں مدلل انداز میں ان مفروضوں کو مسترد کرتے ہوئے بالکل درست نتیجہ اخذ کیا ہے کہ فیض نے "روایتی شعری زبان سے اپنے دھیمے مزاج، خوبصورت تہذیبی رچاؤ اور سائنسی صداقت پر قائم سائنسی ایقان کے لئے جس انتہائی منفرد انداز سے کام لیا ہے وہ نہ صرف ان کی فنکارانہ عظمت کا ثبوت ہے، بلکہ اس حقیقت کا منہ بولتا اعلان بھی ہے کہ انہوں نے روایتی زبان پر اٹھائے جانے والے جملہ اعتراضات کو بے محل اور غیر واجب قرار دے دیا ہے۔"

مختصراً روایتی شعری زبان اور رومانی استعمال سے فیض کی وہ سیاسی بصیرت متاثر نہیں ہوتی جس کا اعلان انھوں نے اپنے دوسرے انتخاب "دست صبا" کے ابتدائیہ میں کر دیا تھا۔ ابتدائیہ کی ابتدا ہی اس اعلان سے ہوتی ہے کہ "ایک زمانہ ہوا غالب نے لکھا تھا کہ جو آنکھ قطرے میں دجلہ نہیں دیکھ سکتی، وہ دیدۂ بینا نہیں بچوں کا کھیل ہے۔" اس کی مزید وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"یوں کہیے کہ شاعر کا کام محض مشاہدہ نہیں، مجاہدہ بھی اس پر فرض ہے، گرد و پیش کے مضطرب قطروں میں زندگی کے دجلہ کا مشاہدہ اس کی بینائی پر ہے، اسے دوسروں کو دکھانا اس کی فنی دسترس پر اس کے بہاؤ میں دخل انداز ہونا اس کے شوق کی صلابت اور لہو کی حرارت پر اور یہ تینوں کام مسلسل کاوش اور جد و جہد چاہتے ہیں۔"

یہی وہ منشور ہے جو فیض کی سیاسی بصیرت کی اساس بنا اور تاعمر انھوں نے اس کی پاسداری کی۔ فیض نے اپنے ذہنی اور نظریاتی ارتقا کی داستان ماسکو سے چھپی اپنی کتاب "مہ و سال روشنائی" میں کافی تفصیل سے بیان کی ہے۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کی تاسیسی کانفرنس اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوئی مگر فیض اس سے پہلے ہی اس راہ پر گامزن ہو چکے تھے۔ بلاشبہ اس راہ پر ڈالنے میں ڈاکٹر محمود الظفر اور ڈاکٹر رشید جہاں کی رفاقت کا اہم کردار ہے۔ فیض خود لکھتے ہیں:

"۱۹۳۴ء میں ہم لوگ کالج سے فارغ ہوئے اور ۱۹۳۵ء میں میں نے ایم اے او کالج امرتسر میں ملازمت کر لی۔ یہاں سے میری اور بہت سے ہم عصر لکھنے والوں کی ذہنی اور جذباتی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ اس دوران کالج میں اپنے رفقاء محمود الظفر مرحوم کی بیگم رشید جہاں سے ملاقات ہوئی۔ پھر ترقی پسند تحریک کی داغ بیل پڑی، مزدور تحریکوں کا سلسلہ شروع ہوا اور یوں لگا کہ جیسے گلشن میں ایک نہیں کئی دبستان کھل گئے۔ اس دبستان میں سب سے پہلا سبق جو ہم نے سیکھا تھا کہ اپنی ذات کو باقی دنیا سے الگ کر کے سوچنا اول تو ممکن ہی نہیں اس لئے کہ اس میں بہر حال گرد و پیش کے سبھی تجربات شامل ہیں اور اگر ایسا ممکن ہو بھی تو انتہائی غیر سود مند فعل ہے کہ ایک انسانی فرد کی ذات اپنی سب محبتوں اور کدورتوں، مسرتوں اور رنجشوں کے باوجود بہت ہی چھوٹی سی، بہت ہی محدود اور حقیر شے ہے۔ اس کی وسعت اور پہنائی کا پیمانہ تو باقی عالم موجودات سے اس کے ذہنی اور جذباتی رشتے ہیں، خاص طور سے انسانی برادری کے مشترکہ دکھ درد کے رشتے۔ اس نئے احساس کی ابتدا "نقش فریادی" کے دوسرے حصہ کی پہلی نظم سے ہوتی ہے۔ اس نظم کا عنوان ہے "مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ" اور اگر آپ خاتون ہیں تو "مرے محبوب نہ مانگ"۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ اس واضح اعتراف اور اعلان کے باوجود ساری عمر فیض ان اعتراضات کے تیر جھیلتے رہے کہ روایتی شعری زبان کی وجہ سے ان کا سیاسی تاثر پھیکا پڑ جاتا ہے۔ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ ان کی نظم "صبح آزادی" پر بھی ایسے ہی اعتراضات ہوئے۔ فیض کے سب سے قریبی رفیق سید سبط حسین نے لکھا ہے:

ابھی گرانیٔ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی

اس نظم پر دائیں جانب سے بھی اعتراض ہوئے اور بائیں جانب سے بھی۔ دائیں بازو والوں نے اس پر آزادیٔ وطن سے صریحاً غداری کا فتویٰ صادر کیا۔ بائیں بازو کے بعض نقادوں کا کہنا تھا کہ یہ نظم بہت مبہم ہے۔ ان کی نظر میں نظم کی عمومیت ہی اس کا سب سے بڑا نقص ہے کیوں کہ بقول ان کے نظم کا عنوان اگر ہٹا دیا جائے تو یہ پتہ نہیں چلے گا کہ یہ نظم آزادی کی نوعیت پر تنقید ہے۔ ان کو یہ بھی شکایت تھی کہ رومانوی علامتوں کی کثرت سے نظم کا سیاسی تاثر کمزور ہو گیا ہے۔۔۔ یہ حضرات مرزا غالب کو تو یہ

اجازت دیتے ہیں کہ وہ مشاہدۂ حق کی گفتگو "بادہ و ساغر" کے حوالے سے کریں لیکن فیض صاحب کو یہ حق دینے کو تیار نہیں۔"

اسی وجہ سے بعض لوگوں نے فیض کے کمٹ منٹ تک پر شک وشبہ کا اظہار کیا۔ دسمبر ۱۹۸۴ء میں "نگار پاکستان" نے فیض پر جو خصوصی شمارہ شائع کیا اس میں بھی یہ شکایت موجود تھی:

"فیض احمد فیض کمٹ منٹ کے شاعر ہیں لیکن یہ کمٹ منٹ اشعار کی سطح پر تیرتا نظر نہیں آتا۔ اگر کسی کو ان کے خیالات ونظریات کا پہلے سے پتہ نہ ہو تو محض ان کے کلام سے سراغ لگانا مشکل ہے۔" سید سبط حسین نے اپنی کتاب "سخن در سخن" میں تفصیل سے ان تمام مفروضوں کو رد کیا ہے (سخن در سخن" فیض اور سبطے بھائی دونوں کی وفات کے بعد شائع ہوئی تھی) سبط حسین نے ان مفروضوں کو رد کرتے ہوئے بااصرار لکھا ہے:

"فن کی خوبی تو یہی ہے کہ فنکار کی وابستگی سطح آب پر نہ تیرے ورنہ آرٹ نہیں خالص پروپیگنڈہ بن جائے گا۔ اس کے برعکس فن کا کمال یہ ہے کہ فن کار کی وابستگی کی لہریں تہہ آب گہرائیوں میں آہستہ آہستہ بہیں۔ یوں بھی فیض صاحب چیخنے چلانے کے قائل نہ تھے بلکہ زیر لب گفتگو کرنے کے عادی تھے اور ان کو یقین تھا کہ میرا قاری میرے اشاروں کنایوں کی تہہ تک پہنچنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ بات یہ ہے کہ فیض صاحب کی نظمیں بھی غزل کے رنگ میں ڈوبی ہوتی ہیں۔ وہی غزلوں کا سا سوز، درد، وہی حسن وعشق کی سی میٹھی میٹھی زبان، وہی رس بھری نغمگی، وہی ترکیبیں، بندشیں اور خیالی تصویریں، غرض کہ ان کی نظموں کی ساری فضا غزل کی ہے۔۔۔

"اس کے باوصف ان کی شاید ہی کوئی نظم ہو جو ان کے مسلک کی واضح طور پر ترجمانی نہ کرتی ہو۔ "مجھ سے پہلی سی محبت"، "موضوع سخن"، "لوح و قلم"، "شورش بربط و نے"، "طوق و دار کا موسم"، "دو عشق"، "نثار میں تیری گلیوں کے"، "زنداں کی صبح وشام"، "ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے"، "افریقہ"، "بنیاد کچھ تو ہو"، "شورش زنجیر"، "آج بازار میں پابجولاں چلو"، "انتساب"، "سر وادی سینا"، "دعا"، "فلسطین"، "دل من مسافر من" وغیرہ سب فیض صاحب کے مافی الضمیر کی آئینہ دار ہیں: نظموں کا ذکر ہی کیا، ان کی غزلیں بھی ان کے خیالات ونظریات کی غمازی کرتی ہیں۔"

ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے بھی "فیض اور مجروح" پر اپنے تقابلی جائزہ میں اسی نقطہ نظر کو اجاگر کیا ہے کہ فیض کی نظموں اور غزلوں کی زبان اور استعاروں میں کوئی بعد نہیں ہے۔

رومانوی استعاروں اور روایتی شعری زبان پر فیض کے اصرار پر زیادہ اعتراضات "زنداں نامہ" کی اشاعت اور اس کے بعد کی شاعری پر ہوئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایام اسیری کے دوسرے دور میں منٹگمری راولپنڈی سازش کیس میں سزایاب ہونے کے بعد فیض کو اسیری کی باقی ماندہ مدت، منٹگمری جیل میں یکا و تنہا گزارنی پڑی۔ اس دوران وہ قید تنہائی کی اذیت سے بھی دوچار ہوئے۔ اسیری کے پہلے دور کی داستان ان کے ساتھ کے فوجی قیدیوں، ریٹائرڈ میجر محمد اسحاق اور کیپٹن ظفراللہ پوشنی نے کافی دلچسپی پیرائے میں بیان کی ہے۔ یہ ایک طرح سے "قیدیوں کی پکنک" کی داستان ہے۔ منٹگمری دور کی قید تنہائی کا ذکر کرتے ہوئے سید سبط حسین لکھتے ہیں:

"ایام اسیری میں فیض صاحب پر دو دور آئے۔ پہلے دور کی نمائندہ ان کی حیدرآباد جیل کے زمانے کی شاعری ہے اور دوسرے دور کا اظہار منٹگمری جیل کے کلام میں ملتا ہے۔ حیدرآباد جیل کے دو سال ان کو دوستوں کی محبت میسر تھی اور وقت بے فکری سے گزارا جا رہا تھا۔ مشاعرے اور قوالی کی محفلیں جمتیں، تاریخ تصوف، فلسفہ اور سیاست پر بحثیں ہوتیں، درس وتدریس کی نشستیں ہوتیں اور فرصت کے بقیہ اوقات کھیل کود، ہنسی مذاق اور لطیفہ گوئی کی نذر ہو جاتے۔ قید کا نیا نیا تجربہ تھا جو حساس ذہنوں کے لئے کسی حیرت انگیز انکشاف سے کم نہیں ہوتا۔ مقدمے کی رسمی کارروائی سے کسی کو دلچسپی نہ تھی کیوں کہ ہر شخص مقدمے کی اصل نوعیت اور آئندہ ہونے والے فیصلے سے بخوبی واقف تھا۔ فیض صاحب نے اپنے اشعار میں اس عدالتی ڈھونگ کی طرف جا بجا بڑے طنزیہ اشارے کئے ہیں

بنے ہیں اہل ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں، کس سے منصفی چاہیں

یا

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہ گار کھڑے ہیں
ہاں جرم وفا دیکھئے کس کس پہ ہو ثابت
وہ سارے خطاکار سر دار کھڑے ہیں

سازش کے ملزم جیل میں پک نک منانے کے موڈ میں تھے مگر باہر لوگ مقدمے کے ذکر سے بھی کتراتے تھے اور اچھے بھلے ہمت والوں پر بھی ہیبت طاری تھی۔ ان حالات میں فیض صاحب کو کسی سے چارہ گری کی توقع تو نہ تھی البتہ اس کا غم ضرور تھا کہ بعض ایسے قریبی دوستوں نے بھی آنکھیں پھیر لی تھیں جن کے ساتھ ان کا روز کا اٹھنا بیٹھنا تھا اسی تلخ تجربے کا اظہار کرتے ہوئے انھوں نے لکھا تھا کہ

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

فیض صاحب نے اپنے محبوب شاعر سودا کی زمین میں جو غزل کہی ہے اس میں غیر ملکی آقاؤں کے ساتھ یار طرحدار کی جانب بھی اشارہ کیا ہے۔

قصہ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں
شکوۂ یار طرحدار کہوں یا نہ کہوں
جانے کیا وضع ہے اب رسم وفا کی اے دل
وضع دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں

فیض صاحب جانتے تھے کہ سازش کا جال کس کے اشارے پر بنا جا رہا ہے ان کو یہ بھی معلوم تھا کہ اگر ارباب اختیار کو اپنی حمایت کا ہلکا سا عندیہ بھی دے دیا جائے تو یہ مقدمہ چشم وزدن میں داخل دفتر ہو جائے گا۔ شاید صاحبان اقتدار کی جانب سے اس قسم کی کوئی پیش کش ہوئی بھی تھی کہ وفاداری کی ضمانت دے دو تو رہا کر دیئے جاؤ گے۔

اسی کے جواب میں فیض صاحب نے کہا تھا کہ ؎

فیض ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

حیدرآباد جیل کا ماحول تمرد، سرکشی اور خوداعتمادی کا تھا۔ فیض صاحب کی اس زمانے کی شاعری میں مبارزت کی للکار ہے، ارباب اختیار کے جوروستم کے تذکرے ہیں، سنت منصور وقیس کی تجدید کا عہد ہے، سرمایہ ومحنت کی جنگ کی جانب اشارے ہیں، شہیدان وفا کی قربانیوں کے قصیدے ہیں اور غم وہجر وفراق کا وہ پاکیزہ جذبہ ہے جو دل بے قرار کو جینے کا حوصلہ بخشتا ہے اور شاعر کی بے چین روح کو سکون ومسرت کی خوشبوؤں سے معطر کرتا ہے۔

طاقت کا غرور وہ زہر ہلاہل ہے جس سے ہر نمرود خدائی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے حالاں کہ اس کے اختیار کا دائرۂ کار بہت محدود ہوتا ہے اور اس کی خدائی کے دن بہت تھوڑے ہوتے ہیں۔ حق بالآخر باطل پر غالب آجاتا ہے۔ کوئی طاقت قدرت کے اس قانون کو بدل نہیں سکتی۔ فیض صاحب ہم کو اس تاریخی حقیقت کی جانب بار بار متوجہ کرتے ہیں

قفس ہے بس میں تمھارے، تمھارے بس میں نہیں
چمن میں آتش گل کے نکھار کا موسم
صبا کی مست خرامی تہ کمند نہیں
اسیر دام نہیں ہے بہار کا موسم

دست صیاد بھی عاجز ہے کف گلچیں بھی
بوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

یا

چاند کو گل کرو تو ہم جانیں

فیض صاحب کی مشہور قوالی ''وہ آئیں تو سر مقتل تماشا ہم بھی دیکھیں گے'' اسی موڈ کی غماز ہے۔

اپنے آدرش پر اعتماد اور اپنی بے گناہی پر یقین ہو تو قید کی پابندیاں تخیل کے لئے تازیانہ ہوتی ہیں ؎

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق ولب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

اس دور کی نظموں میں ''ایرانی طلبا کے نام'' نثار میں تری گلیوں کے، شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، زنداں کی ایک شام (زنداں کی ایک صبح) شامل ہیں۔

منٹگمری جیل کا زمانہ، فیض صاحب کے بقول تھکن اور اکتاہٹ کا زمانہ تھا۔ مقدمے کی سماعت دو سال بعد جولائی ۱۹۵۳ء میں ختم ہوئی اور عدالت نے فیض صاحب کو چار سال قید سخت کی سزا دی لیکن اس سے بڑی سزا دوستوں کی محفل کا درہم برہم ہونا تھا۔ سجاد ظہیر جو فیض صاحب کے سب سے عزیز دوست تھے، مچھ (بلوچستان) بھیج دیئے گئے اور فیض صاحب کو میجر اسحاق سمیت منٹگمری جیل منتقل کر دیا گیا۔ یہ قید خانہ ''عادی مجرموں'' کے لئے مخصوص ہے۔ قیدیوں پر سختی اور تشدد وہاں روزمرہ کا معمول ہے اور وہاں وہی افسر تعینات کئے جاتے ہیں، بے رحمی اور سنگ دلی جن کی فطرت بن چکی ہوتی ہے۔ جیل میں داخل ہو تو آسمان سے باتیں کرتی دیواروں کا دورویہ سلسلہ دیکھ کر دم گھٹنے لگتا ہے۔ ''شاہی وارڈ'' جس میں سیاسی قیدی رکھے جاتے ہیں اونچی چہار دیواریوں کے حصار میں واقع ہے وہاں پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا اور ہر وقت ہو کا عالم رہتا ہے۔ اب کہاں وہ حیدرآباد کی جیل پہل اور کہاں منٹگمری جیل کا وحشت ناک سناٹا۔ اس تبدیلی سے فیض صاحب کو بڑی روحانی اذیت پہنچی۔

فیض صاحب منٹگمری جیل میں ستمبر ۱۹۵۳ء سے رہائی کے وقت تک قید رہے۔ البتہ دانتوں کے علاج کی غرض سے تھوڑے عرصے کے لئے لاہور بھی گئے جہاں انھوں نے اپنی نظم ''روشنیوں کے شہر'' مکمل کی۔ فیض صاحب کا کہنا ہے کہ اکتاہٹ اور تھکن کی جو کیفیت مجھ پر منٹگمری جیل میں گزری اس کی نمائندہ یہی نظم ہے

سبزہ سبزہ سوکھ رہی ہے پھیکی زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دور افق تک گھٹتی بڑھتی اٹھتی گرتی رہتی ہے
کہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر

مگر ''روشنیوں کے شہر'' ہی پر کیا منحصر ہے اس دور کے سارے کلام پر بیزاری، تلخی، تلملاہٹ اور جھنجلاہٹ کا غلبہ ہے۔ ملاقات، واسوخت، ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے، دریچہ، درد آئے گا دبے پاؤں، افریقہ، یہ فصل امیدوں کی ہمدم، بنیاد کچھ تو ہو، غرض کہ کوئی ایسی نظم یا غزل نہیں ہے جس سے ان کی ذہنی کیفیت، ان کے سوچنے اور محسوس کرنے کا انداز ظاہر نہ ہوتا ہو۔ ان کے دل میں رہ رہ کر جو چوٹیں اٹھتی تھیں، اس کا ماجرا بیان کرنے کے لئے انھوں نے جو ترکیبیں وضع کیں اور جن علامتوں سے کام لیا وہ بھی ان کی زخمی روح ہی کی آوازیں ہیں، آہوں کی آنچ، غم کے شرار، درد کا شجر، درد کی رات، درد کا ہنگام، درد کا رشتہ، درد کی گدلی لہر، درد کے فاصلے اور درد کا دامن، سیہ شاخ کی کمان، خون گل، خاک آشیاں، تنہائی کا زہر، دار کی خشک ٹہنی، دریچے کی صلیبیں، اندھیرے کی فصیلیں، ہجر کی پناہ، وحشی سائے، جوش غضب کا انگار، طیش کی آتش جرار، شعلوں کا رجز، لہو کی تال، بھالوں کے مرگ نین، بسمل پودے، لہو کی کھاد اور کوئے ستم کی خامشی اور اسی قسم کی دوسری بندشوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ منٹگمری جیل میں فیض صاحب کس شدید کرب میں مبتلا رہے۔''

فیض کے سیاسی کمٹ منٹ پر بنگلہ دیش کی جدوجہد آزادی کے دوران سب سے زیادہ سوال اٹھائے گئے۔ کہا گیا کہ دائیں بازو کے رجعت پرستوں کے دباؤ میں فیض نے بنگلہ دیش کی تحریک آزادی کی ان دیکھی کی۔ مگر یہ سچ نہیں ہے اس مدت میں مشرقی بنگال کی خونیں حادثوں سے متاثر ہو کر کئی غزلیں اور نظمیں کہیں۔ اس دور کی شاہکار نظموں، ''شرح بے دردئ حالات نہ ہونے پائی'' اور ''حذر کرو مرے تن سے'' کا راست تعلق بنگلہ دیش کے واقعات سے ہے۔ جب بنگلہ دیش میں خون کی

بارش ہو رہی تھی، فیض نے وہ نظم کہی جو پوری طرح سے لہو رنگ ہے:

خورشید کا سندن لہو
مہتاب کی چاندی لہو
صبحوں کا ہنسنا بھی لہو
راتوں کا رونا بھی لہو

ہر شجر مینار خوں، ہر پھول خونیں دیدہ ہے
ہر نظر اک تارِ خوں، ہر عکس خوں مالیدہ ہے
موجِ خوں جب تک رواں رہتی ہے اس کا سرخ رنگ
جذبۂ شوقِ شہادت، دردِ غیظ و غم کا رنگ
اور تھم جائے تو کجلا کر
فقط نفرت، شب کا، موت کا
ہر اک رنگ کے ماتم کا رنگ
چارہ گر ایسا نہ ہونے دے
کہیں سے لا کوئی سیلابِ اشک
آبِ وضو
جس میں دھل جائیں تو شاید دھل سکے
میری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو

(۸ / اپریل ۱۹۷۱ء)

بنگلہ دیش سے متعلق ان کی نظموں "شام شہریاراں" اور "چلو پھر سے مسکرائیں"، فیض کی رجائیت کی آئینہ دار ہیں۔ مگر اس تعلق سے ان کی نظم "ڈھاکہ سے واپسی" کو سب پر فوقیت حاصل ہے۔ بھٹو صاحب خیر سگالی کے دورے پر ڈھاکے گئے تو فیض صاحب کو بھی لیتے گئے، ڈھاکہ میں وہ ایک طرح سے ہوٹل کے کمرے میں قید رہے۔ دوستوں سے کوئی کوئی ملاقات نہ ہوئی۔ "ڈھاکہ سے واپسی" پر اسی بے دردی اور محرومی کا شکوہ ہے۔

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اتنی ملاقاتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کتنی مداراتوں کے بعد
کب نظر آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خون کے دھبے دھلیں گے کتنی برساتوں کے بعد
تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صبحیں مہرباں راتوں کے بعد
دل تو چاہا پر شکستِ دل نے مہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شکوے بھی کر لیتے مناجاتوں کے بعد
ان سے جو کہنے گئے تھے فیض جاں صدقہ کیے
ان کہی ہی رہ گئی وہ بات، سب باتوں کے بعد

نو آزاد ملکوں کے تعلق سے فیض کا یہ انداز فکر نیا نہیں ہے۔ فیض ابتدا سے ہی اس برصغیر کے عوام میں دوستی اور ہم آہنگی کے علم بردار رہے ہیں۔ ۱۹۶۲ء میں انھیں لینن امن انعام سے سرفراز کیا گیا۔ انعام قبول کرتے ہوئے انھوں نے اردو میں تقریر کی۔ اپنے نظریاتی موقف کا اعادہ کرتے ہوئے فیض نے یہ بھی کہا:

"سامراجی اور غیر سامراجی قوتوں کی لازمی کشمکش کے علاوہ بدقسمتی سے بعض ایسے ممالک میں شدید اختلافات موجود ہیں، جنھیں حال ہی میں آزادی ملی، ایسے اختلافات ہمارے ملک پاکستان اور ہمارے سب سے قریبی ہمسایہ ہندوستان میں موجود ہیں۔ بعض عرب ہمسایہ ممالک میں اور بعض افریقی حکومتوں میں موجود ہیں۔ ظاہر ہے ان اختلافات سے وہی طاقتیں فائدہ اٹھا سکتی ہیں جو امن عالم اور انسانی برادری کی دوستی اور یگانگت کو پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے صلح پسند اور امن دوست صفوں میں ان اختلافات کے منصفانہ حل پر غور و فکر اور اس کے حل میں امداد دینا لازم ہے۔"

قوموں میں ہم آہنگی، سامراجیت کے خلاف لگاتار جد و جہد امن عالم اور نو آزاد ملکوں کی ترقی، وہ اعلیٰ آدرش ہیں جو زندگی کے آخری دنوں میں فیض کو سب سے زیادہ عزیز رہے۔ بھٹو حکومت کے ساتھ پانچ برس کام کرنے اور "ہم خواہوں" کی شرانگیزی سے دل برداشتہ ہو کر، فیض ۱۹۷۷ء میں افرو ایشیائی مصنفین ایسوسی ایشن کے ترجمان "لوٹس" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے بیروت چلے گئے۔ "لوٹس" کے ایڈیٹر کی حیثیت سے انھوں نے افرو ایشیائی ادیبوں کی تحریک کو نئی جلا بخشی۔ اسے صرف ایشیاء اور افریقہ تک محدود رکھنے کے بجائے، فیض نے اپنے ہم مشربوں، پبلو نیرودا وغیرہ کے تعاون سے اسے تیسری دنیا کی آزادی اور ترقی کا فورم بنا دیا۔

حالاں کہ اس وقت عرب دنیا زبردست انتشار اور کشمکش سے دو چار تھی، بیروت میدان کارزار بنا ہوا تھا، یہ سچ ہے کہ اس دور کی فیض کی شاعری کا محور فلسطین ہے مگر انھوں نے اسے عرب پر مظالم کی نوحہ خوانی تک محدود نہیں رکھا۔ "لوٹس" کے اداریوں کے ذریعہ انھوں نے عالم انسانیت کو للکارا۔ سامراج دشمن تحریک آزادی کو نئی معنویت عطا کی۔ لاطینی امریکہ میں تبدل و تغیر کا جو طوفان ہم آج دیکھ رہے ہیں اسے رنگ و روپ دینے میں "لوٹس" کے مدیر کی حیثیت سے فیض کا گراں قدر حصہ ہے۔ "لوٹس" میں انھوں نے برسرپیکار، عرب، لاطینی، امریکہ اور افریقہ شاعروں، ادیبوں اور دانشوروں کو ابھرتی ہوئی سامراج دشمن جد و جہد سے جوڑنے میں نمایاں کردار ادا کیا۔

میدانِ کارزار بنے، بیروت کا قیام (۱۹۷۸ء-۱۹۸۱ء) فیض کے لئے دوہرے آزار کا سبب تھا۔ ایک طرف وطن کی یاد تھی جو ضیاء شاہی کی آمریت تلے کراہ رہا تھا تو دوسری طرف بیروت کا خوبصورت شہر سچ مچ کا میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ فیض کی نظم "دعا" ان کے اس دوہرے آزار کی نمائندگی کرتی ہے۔

جن کا دیں پیرویٔ کذب و ریا ہے ان کو
ہمتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے
جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں، ان کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

(بقیہ صفحہ نمبر 108 پر)

نشانِ منزل

مسعود اختر جمال

جھکے گا خاک پہ یہ قصر آسماں اک دن
ہمارے زیر قدم ہوگی کہکشاں اک دن
بڑھے گا جانب منزل یہ کارواں اک دن
فضائے ارض و سما ہوگی ہم عناں اک دن
حیاتِ خضر ملے گی ہر ایک ذرے کو
ہمارا نقش قدم ہوگا جاوداں اک دن
ابھی جو خرمن اہل وفا پہ گرتی ہیں
چراغِ راہ بنیں گی وہ بجلیاں اک دن
سحر کے نور سے چھٹ جائے گی یہ تیرہ شبی
افق پہ مہر مبیں ہوگا ضو فشاں اک دن
فضائیں گونج اٹھیں گی ہمارے نغموں سے
زعرش تا بہ سرا پردۂ مکاں اک دن
ہماری مائیں ہمارے ہی گیت گائیں گی
انہیں سے دیں گی وہ بچوں کو لوریاں اک دن
انہیں کی لے سے جوانانِ بزم جاگیں گے
انہیں سے ذوق جنوں ہوگا کامراں اک دن
انہیں سے منزل نو کا ملے گا ہم کو سراغ
انہیں سے راہ پہ آئے گا کارواں اک دن
یہ ''خون دل'' جو ابھی صرف دامن غم ہے
اسی کے رنگ سے نکھرے گا گلستاں اک دن
ثبوت دے گی ہماری وفا شناسی کا
''ہر ایک حلقہ زنجیر کی زباں اک دن''
''وہ بات جس کا نہیں ذکر داستاں میں ابھی
جمالؔ ہوگی وہی زیب داستاں اک دن''

رفیق منزل

رفعت سروش

تجھے رفیق کہوں ، ہم سفر کہ راہ نما
مری نوا میں ترا سوز و ساز شامل ہے
مچل رہی ہے جو منزل ترے تصور میں
وہی مرے بھی شعور جنوں کی منزل ہے

جہانِ درد میں ہم سب ہیں ''نقش فریادی''
جہاں کا درد ترے نغمہ و کلام میں ہے
عجب ادا سے تو اس دور میں ہے نغمہ سرا
نوا کی گونج تری بزم خاص و عام میں ہے

''یہ داغ داغ اجالا یہ شب گزیدہ سحر''
کہ جس کی تاب نہ لائے شعورِ اہلِ نظر
ترے جنوں کو نیا عزم اسی نے بخشا ہے
تری غزل ہے کہ اک نغمہ عروجِ بشر

فرازِ دار و رسن پر ہوا تو نغمہ سرا
حیات تیرے لئے بے قرار گذری ہے
نشانہ سنگ ملامت کا کیوں نہ بن پایا
''یہ بات ان کو بہت ناگوار گذری ہے''

شاعر عصر

فارغ بخاری

تیری باتوں میں وقت کی دھڑکن
تیرے شعروں میں زندگی کا گداز
شاعر عصر تیرے نغموں میں
ڈھل گئی ہے اس عہد کی آواز

نبض جمہور پر ہے ہاتھ ترا
تیرے افکار کی اساس ہے یہ
چاندنی ، رقص ، روشنی ، خوشبو
تیرے اشعار کا لباس ہے یہ

تو نے کتنی ہی دکھ بھری راتیں
دل بیداد میں سمو لی ہیں
چھن گئے جب بھی تجھ سے لوح وقلم
انگلیاں خون میں ڈبو لی ہیں

کبھی یکسر ہے ''نقش فریادی''
کبھی شہر صبا تری منزل
درد کا رشتہ استوار رہا
کبھی پاؤں فگار ہیں کبھی دل

کوئے دار و رسن کیا آباد
صحن زنداں کبھی بساتا رہا

آسمان وطن کے رخشاں چاند
تو بہر طور جگمگاتا رہا

موج درد فراق یار میں بھی
شانۂ بام پر دمکتا رہا
مشعل نور بن کے تیرا قلم
ظلمت یاس میں چمکتا رہا

کبھی چھلکا کے جام محفل میں
گرمیاں پھونک دیں مغاں کی طرح
کبھی اپنے لہو سے کاسۂ داغ
پُر کیا جام ارغواں کی طرح

اشک ٹپکا کے گلستاں میں کبھی
رنج کم ظرفیٔ بہار کیا
کبھی اپنی نوائے خونیں سے
دامن گل کو لالہ زار کیا

تیرے ہی دم سے گلستاں میں سدا
گرم الفت کا کاروبار رہا
تیرے ہی فیض سے زمانے میں
پرچم امن کا وقار رہا

پاس رہو

(پیروڈی)

تم مرے پاس رہو۔
میرے قاتل مرے دلدار مرے پاس رہو (فیض)

سید ابوالبرکات نظمی

تم ذرا دور رہو
میرے قاتل، مرے ہمدم، میرے پیارے سگریٹ
جس گھڑی دوست خریدیں سگریٹ
چند سکوں کا لہو دے کے خریدیں سگریٹ
''کیپسٹن'' کوئی اور کوئی ''سیزرس لئے
''ڈائمنڈ'' ہی کوئی ہونٹوں میں دبیئے
بڑھ کے اخلاق سے پیکٹ کو مری سمت بڑھائے
تم ذرا دور رہو
میرے قاتل، مرے ہمدم، میرے پیارے سگریٹ
''جب کوئی بات بنائے نہ بنے''
جیب سے اوروں کی بھی جب کوئی سگریٹ نہ ملے
''مفت سگریٹ'' کی امید نہ برآئے
مجھ کو رہ رہ کے جماہی آئے
اپنا پیکٹ ہی مرے ہاتھ کی رہ تکنے لگے
تم مری جیب میں انگڑائی لو
نشۂ کام و دہن کی مجھے دعوت دے دو
ہاں یہی وقت ہے پیارے سگریٹ
میرے قاتل، مرے ہمدم، میرے پیارے سگریٹ

فیض

(فیض احمد فیض کی گرفتاری کی خبر پڑھ کر)

نریش کمار شاد

کہاں یہ علم ہے زنداں کے گھپ اندھیروں کو
کہ ان کی چھاؤں میں تیرے چراغ جلتے ہیں
تری نظر میں جو رقصاں ہے التہاب کے ساتھ
اس ایک لو میں کئی آفتاب پلتے ہیں
جنہیں شعور کی تابانیوں نے سینچا ہو
وہ ولولے بھی کہیں تیرگی میں ڈھلتے ہیں

نسیم صبح کے نکہت بدوش جھونکوں کو
نہ کوئی روک سکا ہے نہ روک سکتا ہے
ستم گروں کے ستم جس قدر مسلتے ہیں
ترے خلوص کا پھول اور بھی مہکتا ہے
بہار بن کے کئی داغدار سینوں میں
تری جوان امنگوں کا دل دھڑکتا ہے

پگھل رہی ہیں ترے عزم کی حرارت سے
جفا و جبر میں ڈھالی ہوئی یہ زنجیریں
نئی حیات کی گل ریز شاہراہوں میں
بکھر رہی ہیں ترے ولولوں کی تنویریں
ترے ہی ناچتے خوابوں کو چومنے کے لئے
ابھر رہی ہیں افق سے حسین تعبیریں

نظام آتش و آہن پہ مسکراتی ہے
تری نوا کی لطافت ترے خیال کی تاب
ترے جنوں میں وہ خوشبوئے سوز ہے جس سے
مہک رہے ہیں شرارے دہک رہے ہیں گلاب
ترے ضمیر کی معصومیت کا کیا کہنا
"گناہ گار نظر کو بھی آ رہا ہے حجاب"

ترے عمل نے یہ ثابت کیا کہ اہل وفا
کبھی ہوس کے اشاروں پہ چل نہیں سکتے
ہزار طوق و سلاسل ہوں راہ میں حائل
وہ اپنی راہ گذر کو بدل نہیں سکتے
مسافروں پہ اندھیرے جھپٹ تو سکتے ہیں
مسافروں کو اندھیرے نگل نہیں سکتے

صعوبتوں کے انہیں سنگدل اندھیروں میں
کیا ہے عظمت آدم کو ضو فشاں تو نے
"زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں تو نے"
"متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں تو نے"

تنہائی

(پیروڈی)

"پھر کوئی آیا دل زار نہیں کوئی نہیں" (فیض)

کنھیا لال کپور

فون پھر آیا دل زار نہیں فون نہیں
سائیکل ہوگا کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات اترنے لگا کھمبوں کا بخار
کمپنی باغ میں لنگڑانے لگے سرو چراغ
تھک گیا رات کو چلا کے ہر اک چوکیدار
گل کرو دامن افسردہ کے بوسیدہ داغ
یاد آتا ہے مجھے سرمۂ دنبالہ دار
اپنے بے خواب گھروندے ہی کو واپس لوٹو
اب یہاں کوئی نہیں کوئی نہیں آئے گا

استفادہ (فیض کی لفظیات سے)

احمد وصی

اک جنریشن گیپ ہے
پھر بھی
"دستِ صبا"
اور "زنداں نامہ"
یا ہو
"شامِ شہریاراں"
چاہے
"نسخہ ہائے وفا" ہو
ایسے اور بھی مضموں ہیں
جن سے
گلوں میں رنگ بھرا
جن سے
مہکے پھول نظر میں
جن سے
دل میں شمعیں جلیں
راستہ تکتی راہگذار
سب
بے خواب کواڑوں کو
مقتل مقتل کھول چکی
کوئے یار ہے
دار کی ٹہنی
چاہے یاد نہ رسم دعا ہو
پاس
متاعِ لوح وقلم ہے
"بول کہ لب آزاد ہیں تیرے"
پھر سے
تخت گرائے جائیں
پھر سے
تاج اچھالے جائیں

K-304, Hanjar Nagar, Pump House, Anderi(E) Mumbai
Mob.09833094497

طرحی غزل

"قفس اداس ہے یارو صبا سے کچھ تو کہو" (فیض)

راز ساغری

غرور غمزہ و ناز و ادا سے کچھ تو کہو
خموش کیوں ہو میاں ، بے وفا سے کچھ تو کہو

خدا نے اہل وفا کو زبان بخشی ہے
حضور ، ساکن شہر جفا سے کچھ تو کہو

لبوں کی مہر خموشی کو توڑ دو جاناں
زبان چپ ہے تو چشم حیا سے کچھ تو کہو

ستم طراز زمانہ ازل سے بہرہ ہے
خدا تو سنتا ہے اپنے خدا سے کچھ تو کہو

جناب فیض کے نقش قدم پہ راز چلو
اداس اداس ہے موسم صبا سے کچھ تو کہو

Nishat Manzil, Tekri Mohalla,
Khargon (MP) 451001
Mob.9329710912

طرحی غزل

"وہ جا رہا ہے کوئی شب غم گذار کے" (فیض)

راز ساغری

بکھری ہوئی حیات کی زلفیں سنوار کے
قابل میں ہو گیا ہوں ترے اعتبار کے

کپڑے اتار لے گی خزاں برگ و بار کے
پھر بھی نشان باقی رہیں گے بہار کے

حاوی ہے عشق دل پہ ، زمانہ دماغ پر
دونوں نہیں رہے یہ مرے اختیار کے

گل پیراہن ذرا سا مجھے حوصلہ تو دے
کانٹے میں چن رہا ہوں تری رہ گذار کے

اپنی سماعتوں کو بچاؤ گے ، کس طرح
پھیلے ہوئے ہیں دائرے میری پکار کے

ساحل کی خاموشی میں نہیں رقص زندگی
میں خوش ہوں اپنی کشتی بھنور میں اتار کے

آنکھوں سے رنگ ونور کی خواہش ہی چھین لی
بے منظری میں اپنے زمانے گذار کے

نمکین اتنا پہلے سمندر نہ تھا ، میاں
آنسو گرے ہیں اس میں کسی شرمسار کے

اے راز دور نو کی حماقت تو دیکھئے
خوش ہو رہا ہے اپنے ہی کپڑے اتار کے

Nishat Manzil, Tekri Mohalla,
Khargon (MP) 451001
Mob.9329710912

فیض کی یاد۔۔۔!

اسحاق ملک

فیض اپنے کسی درد کو بے فیض سمجھ کر
آہستہ سے چیخا تو جہاں کانپ اٹھا تھا
آواز عجب تھی
خود فکر و نظر ڈھونڈنے نکلی وہ صدا تھی
کیا ذہن تھا، کیا بات تھی، کیا طرز ادا تھی
پر جوش جنوں تھا
روداد شب ہجر کی یا وصل کا قصہ
مٹنے کا ہو کوئی باب کہ غم کا کوئی حصہ
سمجھا یا سلجھ کر
الجھا ہوا اک شخص زمانے کی فضا سے
شیرینی کھرچتا ہوا ہر تلخ دوا سے
گھر میں بھی تھا بے گھر
آزاد منش ہو کے بھی وہ شخص تھا پابند
شہرت کی ہوا راس، زمانے کی ہوا بند
اب ہم میں نہیں وہ!
لیکن ابھی دنیا میں شب و روز میں جب تک
اس شخص کا نام اور لیا جائے گا تب تک

C/o. Ismail M.Alloli,
H.No.144, Sidheshwar Peth,
Flart No.19, National Complex,
Opp. Pangal High School,
SOLAPUR 413001 (M.S.)

فیض پھر فیض ہے

انصاری عبداللہ ہلال مالیگ

اب کہاں باقی وہ آواز جو ایوانوں کو
اپنے الفاظ کی گرمی کی حرارت دے کر
حوصلہ دیتی تھی ہر راہ پہ انسانوں کو
اب کہیں اس کا کوئی ذکر نہیں ہو سکتا
ظلم کیا چیز ہے دہشت کا تماشہ کیا ہے
کیا کوئی امن کے بیج آج نہیں بو سکتا
کیا ہوا؟ دار و رسن آج پڑے ہیں سونے
کوئی منصور نہیں کوئی قلندر بھی نہیں
اے زمیں کیوں نہ جیالے کیے پیدا تو نے
اب سلاسل کا کہیں شور نہیں اٹھ پاتا
زندہ انسان کو زنداں میں جو تڑپا جائے
ہو گیا آج زمانے پہ ستم کا سایہ
پھر کوئی نغمہ جو زنجیر پہ گایا جائے
آؤ پھر سے کوئی ایسی کہ فلک کانپ اٹھے
پھر کوئی لے جو قفس کو بھی اڑا لے جائے
انقلاب آئے نیا ایسا ہو دستور کوئی
ظلم اور جبر کے تابوت میں کیلیں ٹھونکیں
یعنی باقی نہ رہے دنیا میں مغرور کوئی
عالم بالا سے اک روز کہے گا سب کو
خون دے کر نئی راہوں کا تعین ہو ہلالؔ
فیضؔ پھر فیض ہے وہ فیض ہی دے گا سب کو

Chamanistan-e-Urdu,
1048, Kalampura, Malegaon
423203, Distt. Nasik (M.S.)
Mob. 9270706418

اقبال گرامی

یہ غم نہیں ہے محبت میں دل کو ہار چلے
کسی کی زلف پریشاں کو ہم سنوار چلے

سوال اس کا نہیں کس طرح کہاں گزری
گزارنے کے لئے آئے تھے گزار چلے

جو ہم چلے تو چلیں گردشیں زمانے کی
جو تم چلو تو زمانے کا کاروبار چلے

یہ کیا جنوں کہ چلے اور چل کے رک جائے
جنوں تو وہ ہے کہ دامن کا تار تار چلے

کسی طرح کسی صورت خدا کو ہم اقبالؔ
پکارنے کے لئے آئے تھے پکار چلے

Khadakpura, KHADWA (MP)
Mob.09826958637

قیام الدین قیام

''ہم پرورش لوح وقلم کرتے رہیں گے''

دنیا جو نہیں کرتی وہ ہم کرتے رہیں گے
زخم کو غزلوں میں رقم کرتے رہیں گے

پتھر کو صنم اپنی وفاؤں سے کرو تم
ہم اپنی محبت سے حرم کرتے رہیں گے

جو اپنے اجالوں سے اندھیروں کو مٹا دے
ہم ایسے چراغوں پہ کرم کرتے رہیں گے

جب تک ہمارے جسم میں جاں باقی رہے گی
در پر ترے پیشانیاں خم کرتے رہیں گے

سینہ میں ترے غم کو ہم آباد کریں گے
ہر درد کو اشعار میں ضم کرتے رہیں گے

Mob.9977235152

فکروفن کا مغنی

(نذر فیض احمد فیض)

خیال اثر مالیگانوی

وہ غم کو اپنا سمجھ کے ہر دم
غموں کو دل سے لگانے والا
وہ اپنے زخموں کی روشنی سے
زمین کا منظر بنانے والا
وہ فکروفن کا
دہکتا شعلہ
غزل سے سبزے اگانے والا
وہ جس کے سوچنے سے بھی پہلے
خیال آتا تھا
اس سے ملنے
وہ جس کے قدموں میں
دھوپ اکثر
آ ہی جاتی تھی چھاؤں بننے
وہ فکروفن کا
حسیں مغنی
نئے ترانے سنا گیا ہے
حیات نو سے ملا گیا ہے

912, Kamalpura,
Malegaon-423203 (MS)
Mob.9146353990

ریاض احمد

(نذر فیض احمد فیض)

گو شوق طلب دل میں زیادہ بھی نہیں تھا
پر ترک تعلق کا ارادہ بھی نہیں تھا

وہ وقت بھی گزرا ہے ہم آشفتہ سروں پر
دستار تو کیا تن پہ لبادہ بھی نہیں تھا

آباد تھا جن لوگوں سے میخانۂ ہستی
حصے میں انہیں لوگوں کے بادہ بھی نہیں تھا

ہم آبلہ پا جاتے کہاں دشت جنوں سے
منزل تو بہت دور تھی جادہ بھی نہیں تھا

کھلتے نہ تھے یادوں کے کنول بھی شب غم میں
زخم دل آزردہ کشادہ بھی نہیں تھا

پھر جذب جنوں لے گیا اس شخص کے در پر
جس سے کبھی ملنے کا ارادہ بھی نہیں تھا

171/1A, P.N.8, Zaitoon Pura,
Malegaon-423203 (MS)
Mob.9029348490

گلشن کہنہ

(فیض احمد فیض کے مصرع پر کہی گئی غزل)

پیار کے گلشن میں کیوں لیتے ہو ویرانے کا نام
مسکراہٹ ہے تمہاری پھول کھل جانے کا نام

بات لب پر آ نہ جائے تیری چشم ناز کی
لوگ دے دیں گے کسی دن اس کو افسانے کا نام

اس نے یوں چاہا تجھے وہ اس طرح تڑپا کیا
ہر کوئی اب جانتا ہے تیرے دیوانے کا نام

تو ہٹا دے رخ سے گیسو ہو اجالا چار سو
"ہے شب تاریک تیری زلف لہرانے کا نام"

کر دیا مدہوش مجھ کو جب نگاہ ناز نے
کس طرح آئے گا لب پر پھر سے پیمانے کا نام

گرچہ ہے مرغوب ان کو غنچہ و گل کی فضا
دل میں گلشن کے نہیں لیتے مگر آنے کا نام

92, Grove Road, Houslow
TW3 3PT

رؤف خیر

(نذر فیض احمد فیض)

اب کیا کہیں کہ اپنے لئے کیا تھے کیا نہ تھے
وہ لوگ جو عجیب سفر پر روانہ تھے

ہم خود ہی اپنے آپ سے کھلواڑ کر گئے
ورنہ ہمیں جو درد ملے لادوا نہ تھے

اب خرچ ہو گئے کہ ترے کام آ گئے
ہم یوں بھی کچھ اثاثۂ بے انتہا نہ تھے

جو سرزمین پاک کو ناپاک کر گئے
رشتے برادرانہ نہیں تاجرانہ تھے

دن ہی کا اور چھور یہاں تھا نہ رات کا
خود ہم بھی بے مکان نہیں بے ٹھکانہ تھے

سب ڈھیر تھے، بس آنکھ اٹھانے کی دیر تھی
حملے جو تھے حریفوں کے سب بزدلانہ تھے

مشکل ہے اب زمین سے وہ سر اٹھا سکیں
کل تک جو آسمان کے شانہ بہ شانہ تھے

آخر رؤف خیر ہمیں مان ہی گئے
اہل قلم جو مان کے دیتے ذرا نہ تھے

H.No.9-11-137/1, Moti Mahal,
Golconda, Hyderabad-500008
Cell:094440945645

ندا فاروقی

(نذر فیض احمد فیض)

جو تیری یاد کے سائے میں چلنے لگتے ہیں
تو چھالے پاؤں کے خوشبو اگلنے لگتے ہیں

خیال یار میں جب جاگتی ہے شہنائی
چراغ درد کے آنکھوں میں جلنے لگتے ہیں

بس ایک ہلکی سی دستک بہار دیتی ہے
برہنہ پیڑوں کے تیور بدلنے لگتے ہیں

ان آفتابوں پہ میں کیسے اعتبار کروں
جو شام ہونے سے پہلے ہی ڈھلنے لگتے ہیں

مکان ذات میں قندیل تم جلائے رکھو
وگرنہ ذہن میں آسیب پلنے لگتے ہیں

Amanpura, Malegaon-423203
Mob.9960651682

اے خسروِ شیریں سخناں!

عبدالاحد ساز

آہ اے شاعر شیریں سخن و گرم نوا
آج دنیا سے ترے کوچ کی جانکاہ خبر
یک بیک چھوڑ گئی ایسی فضاؤں میں مجھے
تیرے شعروں میں جہاں ہے مرے خوابوں کا سفر

تیرے نغموں سے عبارت ہے نہ جانے کتنی
میری صبحوں کی لطافت، مری شاموں کی مہک
کتنی مانوس ہے الفاظ کے چہرے سے ترے
دل کے دکھنے کی ادا، رات کے ڈھلنے کی کسک

میرے احوال و کوائف کی فضا کاری میں
تیری نظموں، تری غزلوں کے کئی رنگ رہے
یوں ہے جیسے مرے احساس کی سرگوشی سے
تیرے گیتوں کے خم و پیچ ہم آہنگ رہے

ہے خود اک تربیت ذوقِ طلب تیرا سخن
عارض و لب کے فسانے، قد و گیسو کے فسوں
فکر فردا، غم ایام، شعورِ ہستی
دار سے کوچۂ دلدار تلک شرحِ جنوں

حرف اور صوت کی بندش میں ابھرتے پیکر
ایسے مضموں کہ جنہیں دیکھ سکیں، چھو بھی سکیں
پھول سے نرم و سبک لہجے میں خوشبو سا کلام
زندگی بھر جسے دہراتے رہیں اور نہ تھکیں

تو کہ خاموش ہے آج اے شہ شیریں سخناں!
کتنے ہونٹوں پہ ہے غلطاں تری آواز کا رنگ
کتنے پیرایوں میں ہے "رنگ تکلم" تیرا
"حرفِ سادہ کو عنایت کیے اعجاز کا رنگ"

نئی راہیں، نئی سمتیں، نئی منزل ہے مگر
آج بھی تیری صدا سنگ نشاں ٹھہری ہے
"تو نے جو طرز فغاں کی تھی قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرز بیاں ٹھہری ہے"

(نومبر ۱۹۸۴ء)

فیض کے نام

(عصری ماحول پر پانچ نظمیں)

ابراھیم اشک

ستم کی آندھی

ستم کی آندھی رواں دواں ہے
چراغ سارے بجھے پڑے ہیں
ہم اپنے سر پر کفن کو باندھے
اندھیری سمتوں میں چل رہے ہیں
نہ کوئی منزل نہ رہگزر ہے
ہر اک قدم پر کوئی قیامت
عجیب دہشت کا یہ سفر ہے
نہ صبح اپنی نہ شام اپنی
نہ کوئی لمحہ کہ جس کو جی لیں
خوشی کی محفل کوئی سجا لیں
سکوت چھایا ہے ہر دشا میں
کھلی سڑک پر محافظوں نے
نہ جانے کتنی ہی سازشوں کے
بچھا رکھے ہیں وہ جال جن میں
الجھنے والا جو بے گناہ ہے
اسے ہی مجرم بنا رہے ہیں
ہزاروں جھوٹی کہانیاں اب
جہاں میں سچ کو مٹا رہی ہیں
عدالتوں سے بھی جیسے انصاف اٹھ چکا ہے
وطن ہمارا
پرانی قدروں کو کھو چکا ہے
ستم کی آندھی میں
مٹ گیا ہے، یہ لٹ چکا ہے
لبوں پہ تالے پڑے ہوئے ہیں
ہر ایک مظلوم بے زباں ہے
ستم کی آندھی رواں دواں ہے

ظلمت شب

نہ ہوگی کبھی ختم یہ ظلمت شب
بہت صبر سے کام لینا پڑے گا
ادھر حادثے ہیں، اُدھر حادثے ہیں
کوئی سمت بھی تو سلامت نہیں ہے
کسی بھی جگہ پر حفاظت نہیں ہے
نہیں ہے کسی نور کا بھی اجالا
سفر زندگی کا یہ اندھا سفر ہے
ہر اک لمحہ گردش میں ڈوبا ہوا ہے
سفر میں بھنور ہے، بھنور میں سفر ہے
سحر کی تو امید کھوئی نہیں ہے
مگر ہم نے امید کوئی نہیں ہے
تماشا ہے یہ زندگی اک تماشا
نہ کوئی سڑک ہے نہ رستا ہے کوئی
ہمیں ایک رسی پہ چلنا ہے یارو
ادھر گہری کھائی اُدھر گہری کھائی
بہت ہی سنبھل کر نکلنا ہے یارو
نہ ہوگی کبھی ختم یہ ظلمت شب
بہت صبر سے کام لینا پڑے گا

زخموں کی پرورش

سمیٹ کر اپنے درد سارے
لگے ہیں زخموں کی پرورش میں
لہو میں اپنے نہا کے نکلے
وفا کے نغمے لبوں پہ اپنے
سجا کے نکلے
خلش یہ دل کی بڑھا کے نکلے
تمام گلیاں، تمام کوچے
تمام بازار سج گئے ہیں
ترے دوانے سرور میں ہیں
کہ جب سے تیرے حضور میں ہیں
ہیں گردشوں میں قدم یہ لیکن
ہر اک قدم رقص میں ہے ڈوبا
مچل رہے ہیں، بہک رہے ہیں
کہیں زمیں پر مہک رہے ہیں
کہیں فلک پر چمک رہے ہیں
جہاں کی ہر ایک انجمن میں
دوانے تیرے ہوئے ہیں رسوا
کسی سے لیکن نہیں ہے شکوہ
یہی ادا ہے ہر اک روش میں
سمیٹ کر اپنے درد سارے
لگے ہیں زخموں کی پرورش میں

محبوب

میرا محبوب نرالا ہے زمانے بھر سے
خاک میں اس کی چمن زار کھلے رہتے ہیں
اس کے دریاؤں میں جھرنوں میں ہے جیون امرت
خوشبوئیں اس کی ہواؤں میں بکھر جاتی ہیں
چاند سورج تو ہیں پیشانی پہ بندی جیسے
مانگ میں اس نے ستاروں کو سجا رکھا ہے
اس کے رخسار کی لالی میں سحر کا منظر
اس کے ہونٹوں پہ محبت کے ہزاروں نغمے
اس کی دھڑکن میں ہے صدیوں کی نرالی تہذیب
اس کی ہر سانس میں تاریخ کے افسانے ہیں
ایک میں ہی نہیں اس کے کئی دیوانے ہیں
اس کی آنکھوں میں سمندر کی ہزاروں موجیں
چال میں اس کی ہر اک گاؤں کی پگڈنڈی ہے
کھیت کی فصلوں میں بکھرا ہوا جوبن اس کا
اس کے دامن میں کئی رنگ چھلکتے دیکھے
اونچے پربت کی طرح اس کے حسیں نقش ونگار
جس طرف جائے نظر پھیلی ہوئی اس کی بہار
میرا محبوب ہے وہ، خوب ہیں باتیں اس کی
اشک یہ میرے دل وجان اسی پہ ہیں نثار

یادِ جاناں

کسی نے پھر مرے سینے پہ آ کے ہاتھ رکھا
قفس میں جیسے بہاروں کی رت چلی آئی
صبا نے رقص کیا اور ہوائیں مست ہوئیں
صدائے دل میں محبت کے گیت گونج اٹھے
خیال یار نے جیسے مجھے پکار لیا
سکوتِ شب میں اشاروں کی رت چلی آئی
ہمارا پھر در زنداں نے احترام کیا
فرشتے آئے گنہگار کو سلام کیا
مقام قید بھی آزاد ہو گیا جیسے
ہر ایک گوشہ ہی آباد ہو گیا جیسے
کہ عید ہو گئی جیسے ترے دوانے کی
تھکن اتر گئی پھر دل سے اک زمانے کی

C-3,302, Al-Ansar, Millat Nagar,
ANDHERI(W) MUMBAI-400053
Mob.09820384921

زمین فیض میں چند غزلیں

(تخلیقی خراج عقیدت)

ابراهیم اشک

☆

چراغ بجھنے لگے انجمن سے یار چلے
کہو کہ اب نہ اِدھر بادِ نو بہار چلے
زمین ہو گئی فردوس آسماں والے
یہ کیسے آدم خاکی کے کاروبار چلے
بس ایک ان کی تمنا کے بعد کچھ بھی نہیں
ذرا سی بات پہ ہم زندگی گذار چلے
ہمیں پہ ختم ہو افسانہ ہائے جانِ وفا
ہمارے نام سے ہی ذکر یار و دار چلے
اب اتنی پاس کہاں بستیاں محبت کی
کہ اپنے گھر سے اٹھے اور کوئے یار چلے
جہان عشق میں رکھنی تھی اس کی بات ہمیں
جو ہم کو جیت گیا ہم اسی کو ہار چلے
جدھر نگاہ اٹھائی ادھر ہی تھی منزل
تلاشِ شوق میں ہم پھر بھی بار بار چلے

☆

پھولوں نے ہم کو زخم دیے نوکِ خار کے
آئے نہ ہم کو راس زمانے بہار کے
اک عمر ہو گئی ہے ترے انتظار میں
لیکن چراغ بجھ نہ سکے انتظار کے
زخم دل تباہ سے روشن ہے کائنات
قصے سنا رہا ہوں شب تار تار کے
ہیں ایک ساتھ سینکڑوں طوفاں اٹھے ہوئے
تو ولولے نہ پوچھ دلِ داغدار کے
تیرے غموں کی بات الگ ہے اے ہم سفر
یہ غم ملے تو غم نہ رہے روزگار کے
دیر و حرم میں آئے تو دیکھی عداوتیں
جائیں کہاں دوانے بھلا کوئے یار کے
اے اشکؔ ہم مثالِ محبت ہیں، دیکھنا
مرجھائیں گے نہ پھول ہمارے مزار کے

☆

کچھ اس طرح سے شب انتظار گذری ہے
ہر ایک سانس رگِ جاں کے پار گذری ہے
وہ زندگی کہ طلب تیری تھی جسے ہر دم
ترے بغیر بھی کچھ یادگار گذری ہے
اثر کچھ ایسا ہوا میری بے نیازی کا
یہ کائنات بہت بے قرار گذری ہے
کوئی بچا نہ سکا اپنے دامن دل کو
صدائے درد جگر مشکبار گذری ہے
زبان کھول کہ راحت کا ہو سبب کچھ تو
تری خموشی مرے دل پہ بار گذری ہے
تمام عمر تڑپنا پڑے گا اب دل کو
نگاہِ ناز تری کر کے وار گذری ہے
نہ جانے شام تلک زندگی پہ کیا گذرے
نسیم صبح اٹھا کر غبار گذری ہے

☆

فصل بہار کیا کہوں آئی جو آج کل گئی
پہلے تو دل مہک گیا پھر جیسے جاں نکل گئی
اپنی وفا کی داستاں چھیڑی نہ ہم نے ہر کہیں
پوچھا تو مسکرا دیے اور یوں ہی بات ٹل گئی
ایسے ستم بھی ڈھائے ہیں ہم پر جناب وقت نے
منزل کے پاس جب گئے منزل بدل بدل گئی
تیرے کرم کا یہ اثر ہم پر ہوا ہے ہم سفر
غم تو خوشی نہ بن سکا، غم میں خوشی بھی ڈھل گئی
اچھا کیا جو آپ نے چھوڑا ہے اپنے حال پر
اب لگ رہا ہے زندگی جیسے سنبھل سنبھل گئی
یہ شمع آرزو ہے کیا، اس کا نصیب ہے یہی
دم بھر میں جیسے بجھ گئی دم بھر میں جیسے جل گئی
کتنے سوال آ گئے اے اشکؔ اپنے سامنے
موج وفا جو عشق کی دل میں اگر مچل گئی

تضمین بر غزل فیض احمد فیض

ڈاکٹر محبوب راہی

چھری سی جیسے کلیجے کے پار گزری ہے　　ہر اک گھڑی کہ گلے سے کٹار گزری ہے
ہمیں رلاتے ہوئے زار زار گزری ہے　　"تم آئے ہو نہ شب انتظار گزری ہے"
"تلاش میں ہے سحر بار بار گزری ہے"

سراپا کر کے ہمیں سوگوار گزری ہے　　کیا ہے محو فغاں، اشکبار گزری ہے
ہم آئے جیسے بھی اس کو گزار، گزری ہے　　جنوں میں جتنی بھی گزری بکار گذری ہے
"اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے"

بہ قصد توبہ رہے ہم کہ با وضو جس شب　　پرے اٹھا کے رکھے جام اور سبو جس شب
رہے ہیں دیر تلک ان کے روبرو جس شب　　"ہوئی ہے حضرت ناصح سے گفتگو جس شب"
"وہ شب ضرور سر کوئے یار گزری ہے"

کسی کے سننے سنانے میں جس کا ذکر نہیں　　کہیں بھی سارے زمانے میں جس کا ذکر نہیں
کسی بھی حیلے بہانے میں جس کا ذکر نہیں　　"وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں"
"وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے"

لگائے کرب میں ڈوبی ہوئی صدا گزری　　جو اس پہ گزری ہے کچھ جان سے سوا گزری
کہ وہ مٹاتی ہوئی اپنے نقش پا گزری　　"چمن میں غارت گلچیں سے جانے کیا گزری"
"قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے"

At Post Barsi Takli, (AKOLA) Mob.0942175106

غزل

(نذر فیض احمد فیض)

عشرت جالندھری

چھلاوہ ہے کوئی کہ وہ عدا ایسے نہیں ہوتا
کہ حاتم بھی گرفتار بلا ایسے نہیں ہوتا

اچانک وادیٔ ظلمات کی اندھی گپھاؤں میں
چمک اٹھے تری آواز پا ایسا نہیں ہوتا

مجھے کانٹا چبھے اور خون نکلے ان کے تلوے سے
مرے ہمدرد ایسا معجزہ ایسے نہیں ہوتا

قبیلے میں یقیناً کوئی آدم خور ہے ورنہ
قضا کا سلسلہ در سلسلہ ایسے نہیں ہوتا

ہزاروں گھر جلا کر اک نیا مندر بنا لوں میں
مجھے سب لوگ مانیں دیوتا ایسے نہیں ہوتا

صراط علم سے بھٹکا ہوا غول بیابانی
بنا لے آپ اپنا راستہ ایسا نہیں ہوتا

عقیدت فیض احمد فیضؔ سے رکھتا ہوں میں عشرت
نہ ہو شہرت مری بھی جا بجا ایسے نہیں ہوتا

Jogeshwari, MUMBAI
Mob.9920046470



نوکِ خار

کالم نویس:
قاضی مشتاق احمد

یادیں فیض کی: کھل گئے زخم کوئی پھول کھلے یا نہ کھلے

دعا

آئیے ہاتھ اٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسم دعا یاد نہیں
ہم جنہیں سوز محبت کے سوا
کوئی بت، کوئی خدا یاد نہیں
آئیے عرض گذاریں کہ نگار ہستی
زہر امروز میں شیرینی فردا بھر دے
جنہیں تاب گراں باری ایام نہیں
ان کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے
جن کی آنکھوں کو رخ صبح کا یارا بھی نہیں
ان کی راتوں میں کوئی شمع منور کر دے
جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
ان کی نظروں پہ کوئی راہ اجاگر کر دے
جن کو دیں پیروی کذب و ریا ہے ان کو
ہمت کفر ملے، جرات تحقیق ملے!
جن کے سر منتظر تیغ جفا ہیں ان کو
دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے
جن کے سر منتظر جفا ہیں ان کو
دست قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے
عشق کا سر نہاں جان تپاں ہے، جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے
حرف حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اقرار کریں اور خلش مٹ جائے

☆

میں دل فگار نہیں، تو ستم شعار نہیں
بہت دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے ان اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں
(فیض احمد فیض)

فیض احمد فیض کا نام فیض احمد خان ہے۔ آپ ۱۳ر فروری ۱۹۱۱ء میں گانو کالا قادر (پاکستان) ضلع سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ میر سیال کوٹی کے مکتب میں عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ چار برس کی عمر میں قرآن حفظ کرنا شروع کیا۔ گورنمنٹ کالج سے انگریزی میں ایم اے اور اورینٹل کالج سے عربی میں ایم اے کیا۔

۱۹۳۵ء میں امرتسر کے ایم اے او کالج میں بحیثیت لیکچرر مقرر ہوئے۔ ۱۹۴۲ء میں فوج میں آگئے کیپٹن بنے اور کرنل کے عہدے تک پہنچ گئے۔ فوج سے استعفیٰ دے کر پاکستان آرٹ کونسل کے سکریٹری بنے پھر لندن چلے گئے بعد میں کراچی آئے۔ ۱۹۴۱ء میں مس ایلیس جارج سے شادی کی۔ شیر کشمیر شیخ عبداللہ نے نکاح پڑھایا۔

قیام پاکستان کے قریباً تین سال بعد ۱۹۵۱ء میں لیاقت علی خان حکومت کا تختہ پلٹنے کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ یہ کیس "راولپنڈی سازش مقدمہ" کے نام سے مشہور ہوا۔ سجاد ظہیر اور دوسرے فوجی افسر بھی گرفتار ہوئے۔ فیض نے چار سال ایک مہینہ گیارہ دن قید کی صعوبتیں اٹھائیں۔ انہیں نہ بیوی بچوں سے ملنے کی اجازت تھی نہ اپنے قلم کے استعمال کی۔ "زنداں نامہ" کی بہت سی نظمیں زمانہ قید کی یادگار ہیں:

متاع لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خون دل میں ڈبوئی ہیں انگلیاں میں نے
لبوں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقہ زنجیر میں زباں میں نے

اپریل ۱۹۵۹ء میں فیض کو رہائی نصیب ہوئی۔

میر تقی میر کے ۷۲ اشعار ان کے ۷۲ نشتر کہے جاتے ہیں۔ فیض کے ۷۲ نشتر بھی اردو شاعری میں ایک مخصوص مقام کے حامل ہیں۔ ان میں سے چند:

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
ایک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں
اک تیری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دنیا میں کیا نہیں باقی
صبا نے پھر در زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے دل سے کہو نہ گھبرائے
رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسم گل ہے تمہارے بام پہ آنے کا نام
مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے
عمر جاوید کی دعا کرتے
فیض اتنے وہ کب ہمارے تھے
آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ گویا کبھی آشنا نہ تھے
آخر کو آج اپنے لہو پر ہوئی تمام
بازی میان قاتل و خنجر لگی ہوئی
خوشا کہ آج ہر اک مدعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا
ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

لاہور جیل

۱۱ر فروری ۱۹۵۹ء

اقبال اور فیض کی شخصیت اور فن میں بہت سی باتیں مشترک تھیں۔ دونوں سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ دونوں مغربی زبانوں کے ادب پر دسترس رکھتے تھے۔ دونوں اپنا

مخصوص انقلابی ذہن رکھتے تھے۔ دونوں نے روایت اور کلاسیکی ادب کے قدروں اور خصوصیات سے پوری طرح استفادہ کیا لیکن اپنا مخصوص لب ولہجہ، آہنگ اور جہانِ معنی پیدا کیا۔ فیض اقبال کے مداح تھے لیکن مقلد نہیں تھے۔

ادارۂ یادگار غالب کراچی میں فیض نے اقبال کے بارے میں کہا تھا:

"ایک تو اردو شاعری میں اسمائے معارفہ کا استعمال بہت کم ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں علامہ اقبال نے سب سے پہلے اس پر توجہ دلائی ہے۔ انہوں نے اسمائے معارفہ استعمال کئے جیسے دلی، سمرقند اور دجلہ، فرات، عراق، اصفہان۔ ان سے ایک اپنی فضا وابستہ ہے۔ ہمارے ذہن میں زمان ومکان کی وجہ سے ایک خاص قسم کا نقشہ پیدا ہوتا ہے۔"

"بہت سی بحور جو اردو میں رائج نہیں تھیں یا کم از کم مانوس نہیں تھیں علامہ نے استعمال کیں۔ جس طرح کم مستعمل اور اچھوتے الفاظ استعمال کر کے علامہ نے ایک خاص فرحت اور شاعری ایک اچنبھے کی سی صورت پیدا کی بالکل اسی طرح نسبتاً کم مانوس بحور استعمال کر کے انہوں نے فرحت میں اضافہ کیا۔ مسجد قرطبہ کی بحر اردو میں بہت کم استعمال ہوئی ہے اور بھی چند نظمیں ایسی ہیں جن میں ایسی غیر مستعمل بحریں استعمال کی ہیں۔"

یہ حقیقت ہے کہ مرزا غالب، میر اور علامہ اقبال کے بعد اگر کسی شاعر کو اردو کا عظیم شاعر کہا ہے تو وہ ہیں فیض احمد فیض۔ اردو والوں میں ہمیشہ اس بات پر بحث ہوتی رہتی ہے کہ آخر اقبال کو نوبل انعام سے کیوں محروم رکھا گیا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ آج کی طرح اس زمانہ میں بھی اردو معاشرہ بکھرا ہوا تھا۔ اقبال کے جتنے دوست اور مداح تھے اس سے زیادہ ان کے دشمن بھی تھے۔ جس طرح "بنگالی لابی" نے ٹیگور کے لئے لابنگ کی تھی ویسے اقبال کے لئے نہیں ہوئی۔ ٹیگور کی عظمت کے اردو والے بھی معترف ہیں اور ان کا احترام بھی کرتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے اولین نوبل انعام یافتہ ہیں اور یہ سال ان کی پیدائش کا ۱۵۰ واں سال ہے۔ اس لئے ان کی سرکاری اور غیر سرکاری اداروں کی جانب سے ٹیگور تقریبات کا اعلان ہو چکا ہے۔ ۲۰۱۱ء فیض کی صد سالہ پیدائش کا سال ہے۔ یہ ہمارے لئے انکشاف ہے کہ فیض احمد فیض اردو کے واحد شاعر ہیں جنہیں ۱۹۸۴ء میں نوبل انعام کے لئے نامزد کیا گیا تھا لیکن وہ اس انعام کے لئے منتخب نہ ہو سکے۔ یہ انکشاف ہوڑہ کارپوریشن نیز فیض وٹیگور صد سالہ تقریبات کمیٹی کے صدر محمد نصیر الدین نے کیا ہے۔ فیض احمد فیض کی دختر نیک اختر نے ای میل کے ذریعہ ہندوستان اور خصوصاً ہوڑہ والوں کو مبارکباد دی ہے۔ "انجمن ترقی پسند مصنفین" نے ۲۰۱۱ء میں اردو، ہندی اور تیلگو زبانوں کے سات مرحوم شعراء و ادباء کی صد سالہ جشن سالگرہ منانے کا اعلان کیا ہے۔ ان میں اردو کے فیض احمد فیض اور اسرار الحق مجاز بھی شامل ہیں۔ ماہنامہ "بیباک" کا زیر نظر شمارہ اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ فیض عالمی ادب میں ایک بلند پایہ مقام رکھتے ہیں۔ آپ کے آٹھ شعری مجموعے اور چھ نثری مجموعے شائع ہو چکے ہیں جن کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہوئے ہیں۔ انہوں نے صحافت میں بھی قابل قدر خدمات انجام دیں۔ ریڈیو کے لئے ڈرامے بھی لکھے۔ دو فلموں کے گانے اور مکالمے بھی لکھے۔ آپ ٹریڈ یونین سے بھی وابستہ رہے اور سجاد ظہیر کے ساتھ انجمن ترقی پسند مصنفین کے قیام میں بھی حصہ لیا۔ یہ انجمن باقاعدہ طور پر اپریل ۱۹۳۶ء میں قائم ہوئی۔ اس انجمن کا نظریہ اشتراکیت کا حامی اور مساوات پر مبنی نظام حیات کا علمبردار تھا۔ اس نظریہ کے تحت امیر طبقہ اپنے فائدے کے لئے غریبوں کا استعمال کرتا ہے اور اسے اس کا جائز حق نہیں دیتا۔ اس لئے ادنیٰ غریب طبقہ کی حمایت میں آواز بلند کی جائے۔ ادب کی تخلیق میں "ادب برائے زندگی" اور "ادب برائے عوام" کو ترجیح دینے کی حمایت کی گئی۔ قوم کا غم، قومی فلاح و بہبود کی فکر، قومی یکجہتی، باہمی عصبیت کی مخالفت، محکومی، مظلومی اور استحصالی عناصر کی مخالفت، فرقہ واریت کی سخت مذمت اور انگریزوں کی غلامی اور سامراج شاہی سے بغاوت اس انجمن کے مقاصد میں شامل تھے۔ اس رجحان نے "ترقی پسند تحریک" کی صورت اختیار کر لی اور اس تحریک نے کائناتی احساس کا جذبہ جگایا۔ ملک و قوم سے متعلق موضوعات ادب کا حصہ بن گئے۔ کہنہ پرستی اور فرسودگی کے خلاف آوازیں بلند ہونے لگیں۔ ادب کا طرز کہن بدل گیا۔ نئے رجحانات اور نئی ہیئتوں نے ادب میں تخلیق کے دائرہ کو وسیع کر دیا۔ اس تحریک کے بنیاد گذاروں میں فیض احمد فیض کا نام سجاد ظہیر کے ساتھ لیا جاتا ہے۔

فیض کی شاعری کے بارے میں احمد ندیم قاسمی نے لکھا ہے:

میں بے وطنی ہوں

میں بے وطنی ہوں
مجھے اپنی آنکھوں میں محفوظ کر لو
جہاں بھی جاؤ، مجھے اپنے ساتھ رکھو
پھر چہرے کی رنگت
جسم کی حرارت مجھ میں واپس لاؤ
آنکھوں کی روشنی
اور دل کی روشنی مجھ میں واپس لاؤ
مجھے روٹی کا نمک اور روٹی کی لے دو
مجھے دھرتی کا سودا، وطن کا ذائقہ دو
مجھے اپنی آنکھوں کی ڈھال دو
مجھے دکھوں کے گھر کی ایک یادگار کی
طرح اپنے ساتھ رکھو
مجھے میرے المیے کی ایک شعر کی طرح
اپنے ساتھ رکھو
مجھے ایک کھلونے کی طرح
مکان کی ایک اینٹ کی طرح
اپنے ساتھ رکھو
تا کہ ہمارے بچے یاد رکھیں
کہ انہیں واپس جانا ہے

(شاعر: محمود درویش)
(فلسطینی جلاوطن) (اردو ترجمہ: اجمل کمال)

☆

پس شہر فغاں، میں کیوں نہیں ہوں
جہاں تم ہو وہاں میں کیوں نہیں ہوں
ہوئی کیوں برف سی اپنے بدن میں
ان آنکھوں سے رواں میں کیوں نہیں ہوں
مجھے گر رائیگاں ہونا ہی ٹھہرا
ابھی تک رائیگاں میں کیوں نہیں ہوں
بتاؤں کیا کسی کو اپنی بات
کہاں کیوں ہوں کہاں میں کیوں نہیں ہوں

(شاہدہ حسن)

پطرس بخاری کا خط
ایلس کے نام

پیاری ایلس! سخت تعجب ہے کہ تم میرا القاب صرف ''بخاری'' لکھتی ہو، نہ مسٹر نہ صاحب، نہ پروفیسر، تم عورتیں ہم مردوں کے برابر کب سے ہوئی ہیں جو بے تکلفی برتنے لگیں۔ بچے بڑوں کے ہمسر کب سے ہو گئے۔ کب۔۔۔ خیر اتنا ہی کافی ہے۔ میں ہمیشہ سے مختصر ڈانٹ کا قائل ہوں جو شفقت اور قرینے سے پلائی جائے۔ اس کا اثر زیادہ دیرپا ہوتا ہے۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں کہ تم ابھی سے اپنے کئے پر نادم اور آئندہ کے لئے مودب اور محتاط رہنے کا عہد کر چکی ہو۔ بہت اچھا ہوا تم نے یاد کر لیا۔ جی چاہتا تھا کہ کہیں سے (فیض) گھر آنے کی خبر آئے اور میں جانتا تھا کہ وہ خود کبھی نہیں لکھے گا۔ شاعر مست جو ٹھہرا، کیوں؟ کہیں سے سنا تھا کہ اسے جیل بھیج رہے ہیں جہاں سادہ پانی اور نانجوں سے اس کی تواضع کریں گے۔ پھر سنا کہ اپنی بات سے پھر گئے ہیں اور میزبانی کی پیشکش واپس لے لی ہے ٹھیک سے کہہ نہیں سکتا کہ کس بات پر زیادہ ہنسی آئی۔ اس پر کہ اسے بند کر رہے ہیں یا اس پر کہ نہیں کر رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہی سمجھو۔ اگرچہ وہ تو راہ حق میں کام آنا زیادہ پسند کرتا لیکن میں اور تم (کہ حرص و آواز کے بندے ہیں) غالباً یہی چاہیں گے کہ وہ ہمارے پاس ہی رہے۔ اس کے بجائے کہ اسے دیکھنے کے لئے فارم پر کرتے پھریں۔ ویسے وہ تو تمہارے پاس ہے ہی؟ میرا مطلب ہے پہلے سے زیادہ۔ اب میں جو وہاں نہیں ہوں، امید تو یہی ہے اور یوں نہیں تو پھر۔

(۲۹ ر اپریل ۱۹۵۸ء)

''فیض کی شاعری کا آغاز رومان وجدان میں لپٹا ہوا ہے مگر جلد ہی زندگی کے کڑے اور تلخ حقائق اس خول کو چٹخا دیتے ہیں اور وہ ذاتی دکھ کے ساتھ ہی عالم انسانیت پر مسلط دوسرے بے شمار دکھوں کی جلن بھی اپنے اندر محسوس کرنے لگتا ہے۔ اس فن میں محبت اور حقیقت کا یہ امتزاج وہ جادو جگاتا اور طلسم کاری کرتا ہے کہ اردو شاعری کے کم ہی بڑے نام اس خصوصیت کے مقابل لائے جا سکتے ہیں۔ ان دو بڑی قوتوں کا امتزاج بھی فیض کا اسلوب قرار پاتا ہے۔ یہ امتزاج اتنا متوازن ہے کہ نہ تو فیض کو محبت کرتے ہوئے اپنے انقلابی نظریات کی قربانی دینے کی ضرورت پیش آئی نہ اس کے انقلابی موضوعات پر نظمیں لکھتے ہوئے اس شوخ کے آہستہ آہستہ کھلتے ہوئے ہونٹوں پر سے نظریں ہٹا لینے کے گناہ کا ارتکاب کیا۔ اسے عشق اور انقلاب، دونوں بیک وقت محبوب رہے اور یوں فیض کا نہ صرف اسلوب خاص صورت پذیر ہوا بلکہ اس نے اپنے زمانے کے شاعروں کا بھی ایک اسلوب متعین کر دیا۔''

ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے ملک میں بھی سرکاری طور پر فیض اور مجاز کی صد سالہ سالگرہ کا جشن منایا جائے۔ ان دونوں شعراء کی یاد میں ڈاک ٹکٹ بھی جاری ہوں اور جس طرح جگن ناتھ آزاد کی کوششوں سے علامہ اقبال کا جشن سرکاری طور پر منایا گیا تھا اب اسی طرح ان دونوں کو سرکاری طور پر خراج عقیدت ادا کرنا ضروری ہے۔ اب جگن ناتھ آزاد بھی نہیں رہے اس لئے یہ ذمہ داری گوپی چند نارنگ اٹھائیں تو یقیناً اردو معاشرہ میں ان کی عزت و توقیر میں اضافہ ہوگا۔ ہندوستان بھر کی فعال ادبی انجمنیں، ادبی مجالس، نمائشیں، تھیٹریکل اسکٹ اور میوزیکل پروگراموں کا انعقاد کریں اور اس بات کا ثبوت دیں کہ ہم اپنے ادب کے معماروں کو نہیں بھولے اور ان کے ادھورے چھوڑے ہوئے کاموں کو ہم پورا کریں گے۔

بقول نسیم انصاری:

''سانحہ یہ بھی ہے کہ اکیسویں صدی کی پہلی دہائی میں کوئی نام ایسا ابھر کے سامنے نہیں آیا جسے فیض، احمد ندیم قاسمی، ساحر، کیفی، کرشن بیدی، خواجہ احمد عباس کے ہم پلہ کہا جا سکے۔''

فیض کی شاعری میں ہندوستان کے کھیت کھلیان، پگڈنڈیاں، یہاں کے غریبوں سے ہمدردی بھی نمایاں ہے۔ ان کی نظموں سے برصغیر کے باذوق سامعین آج بھی محظوظ ہوتے ہیں۔ فیض کی صد سالہ تقریب سے ان کی یادیں مزید تازہ ہوں گی۔''

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سلگاؤ آبگینوں میں

(حوالے: اردو شاعری: میر سے پروین شاکر تک، قاضی مشتاق احمد، مکتبہ جدید، نئی دہلی: ۲۰۰۲ء)

QAZI MUSHTAQUE AHMED
B/6, Ray-Venue Society, I.C.S, Colony,
Ganesh Khind, PUNE-411007
Mob.09423317129

فیض کی ایک نظم
جس روز قضا آئے گی

کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور کبھی اول شب
بے طلب پہلے پہل مرحمت بوسۂ لب
جس سے کھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے
شاید اس طرح کہ جس طور کبھی آخر شب
نیم وا کلیوں سے سرسبز سحر
یک بیک حجرۂ محبوب میں لہرانے لگے
اور خاموش دریچوں سے بہ ہنگام رحیل
جھنجھناتے ہوئے تاروں کی صدا آنے لگے
کس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اس طرح کہ جس طور تہ نوک سناں
کوئی رگ واہمۂ درد سے چلانے لگے
اور قزاق سناں دست کا دھندلا سایہ
از کراں تابہ کراں دہر پہ منڈلانے لگے
جس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبوب صفت
دل سے بس ہوگی یہی حرف ودع کی صورت
للہ الحمد بانجام دل دل زدگاں
کلمۂ شکر بنام لب شیریں دہناں

(فیض احمد فیض)

آپ کے خطوط

آل انڈیا اردو ایڈیٹرس کانفرنس کے صدر م۔ افضل کا خط

ایک طویل مدت کے بعد میں آپ سے مخاطب ہو رہا ہوں۔ گذشتہ ۵ رسال سے انگولا اور ترکمانستان میں سفارتی ذمہ داریاں نبھانے کے باعث میں اپنے ملک سے دور رہا لیکن آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس کے سلسلہ میں میری خواہش تھی کہ اس کی سرگرمیاں جاری رہیں اور صدارتی ذمہ داری کوئی دوسرا ممبر سنبھال لے۔

اس سلسلے میں ''آزاد ہند'' کلکتہ کے مدیر اعلیٰ سعید ملیح آبادی صاحب سے میں نے درخواست کی تھی، لیکن انہوں نے معذرت چاہی۔ ان حالات میں دفتری طور پر کانفرنس کا کچھ نہ کچھ کام تو چلتا رہا لیکن جو کام ہونا چاہئے تھا وہ میری غیر حاضری کے باعث متاثر رہا۔ ہندوستان واپس آ کر میں نے کانفرنس کے تعلق سے غور وخوض کیا اور حالات کا جائزہ لیا۔ مقامی صحافیوں سے بھی رابطہ قائم کیا اور کر رہا ہوں، جس سے اندازہ ہوا کہ اردو اخبارات کے مسائل وہی ہیں جو پہلے تھے۔ البتہ نوعیت بدلی ہوئی ہے۔ بیورو کریسی اپنی من مانی کر رہی ہے جس سے اخبارات کی اقتصادی صورت حال ابتر ہے۔

میں نے پایا کہ آج بھی اردو اخبارات اپنے وجود کی لڑائی لڑ رہے ہیں۔ صورت حال کافی پیچیدہ ہے۔ اس کا مقابلہ متحد ہو کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس سلسلہ میں مجھے آپ کے مشوروں کی اشد ضرورت ہے۔ آپ نے ماضی میں بھی اپنا بیش قیمت تعاون دے کر 'آل انڈیا اردو ایڈیٹرز کانفرنس' کو فعال بنانے میں مدد دی ہے۔ آپ کی رائے ملنے کے بعد ملکی سطح پر کوئی مضبوط لائحہ عمل تیار کرنے کی کوشش ہوگی تاکہ اردو اخبارات ورسائل سے متعلق مسائل کا کوئی ٹھوس حل نکلے۔

آپ کے جواب کا میں انتظار کروں گا۔ میرے لئے جو خدمت ہو یاد فرمائیں۔

<u>رفیق شاہین (علی گڑھ)</u>: زاہدہ زیدی پچھلے ماہ ہارٹ اٹیک کی نذر ہو گئیں۔ اس لئے ان کے ڈراموں کے بارے میں اب کچھ پتہ چلنا مشکل ہے۔ آپ فیض نمبر کی تیاری میں مشغول ہیں اس لئے خط لکھ کر ڈسٹرب کرنا نہیں چاہتا تھا مگر دل نہ مانا۔ فیض نمبر آ جائے اس کے بعد انشاء اللہ مجاز پر بہت اچھا مضمون لکھوں گا۔

مجاز اکتوبر ۱۹۱۱ء میں ردولی میں پیدا ہوئے اور بلرام پور اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں انہوں نے ۵ ردسمبر ۱۹۵۵ء کی شب میں ۱۱ ربج کر ۲۲ رمنٹ پر سجاد ظہیر، سردار جعفری، احتشام حسین، عصمت چغتائی اور شاداب ردولوی کی موجودگی میں آخری سانس لی اور اگلے دن لکھنؤ کے نشاط گنج قبرستان میں ان کی تدفین ہوئی۔ علی گڑھ میں ان کی موجودگی کا زمانہ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۵ء ہے۔ انہیں پہلا دماغی دورہ ۱۹۴۰ء میں دوسرا ۱۹۴۵ء میں اور تیسرا ۱۹۵۲ء میں پڑا۔ اب کی طبعی عمر ۴۴ رسال اور ادبی عمر ۲۵ رسال ہے۔ صفیہ اختر کی چھوٹی بہن ڈاکٹر حمیدہ سالم سے میں نے ۱۹۵۵ء میں مجاز سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا انہوں نے جنوری میں علی گڑھ آنے کا وعدہ کیا ہے مگر شومیٔ قسمت سے ۵۲۰ ردسمبر کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے اور ان سے ملاقات کا ارمان میرے دل میں ہی رہ گیا۔ ان کی نظم آوارہ کے کچھ بند مجھے آج بھی یاد ہیں۔ ان کا لکھا ترانہ یونیورسٹی میں آج بھی گونجتا ہے۔ ترانے کی دھن بنانے والے اشتیاق حسین سے بھی میری ملاقات ہوئی۔ موصوف نے امراؤ جان فلم میں نواب کا رول بھی نبھایا تھا۔

مجاز کے وقت میں علی گڑھ یونیورسٹی کو Oxford کا درجہ حاصل تھا کیوں کہ مجاز، اختر حسین رائے پوری، جاں نثار اختر، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، سعادت حسن منٹو، جذبی، عصمت چغتائی اور علی سردار جعفری جیسے بھی نوجوان یہاں موجود تھے۔

<u>مراق مرزا (ممبئی)</u>: بیباک کا تازہ شمارہ بدست ہوا۔ کہانی کی اشاعت کے لئے دل سے شکر گزار ہوں۔ تازہ شمارے میں محترم عبدالاحد ساز کا گوشہ لائق قدر ہے۔ ڈاکٹر داؤد کاشمیری نے ساز کی شاعری پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ علاوہ ازیں ساز کی نظمیں، غزلیں، دوہے، ماہیے اور علی سردار جعفری کی نظموں سے ان کا مکالمہ، یہ سبھی تحریریں اعلیٰ ادب کا نمونہ ہیں۔ ہمیشہ کی طرح آپ کی گفتگو (اداریہ) بھی جاندار اور شاندار ہے۔ دیگر شمولات بھی بیباک کی ادبی وفکری روایت کے پاسدار ہیں۔ مظفر حنفی اور اشتیاق سعید کے مضامین آنند لہر کی کہانی ''دادی ماں'' اور قاضی مشتاق احمد کا مستقل کالم ''نوک خار'' مطالعے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شعری حصہ بھی دلکش ہے۔

<u>انور ظہیر انصاری (بڑودہ)</u>: فیض احمد فیض اور مجاز لکھنوی سے متعلق دو مقالات حاضر خدمت ہیں۔ بے باک اس سے قبل بھی دو ایک بار باصرہ نواز ہوا تھا اور سرسری دیکھا بھی تھا لیکن پچھلے دنوں کرم فرما دیپک بدکی صاحب کے ساتھ شب گزاری کا موقع ملا تو تفصیل سے یہ رسالہ دیکھا بھی۔ بدکی صاحب سے میرے دیرینہ مراسم ہیں ان ایام سے جب وہ یہاں بڑودہ میں پوسٹڈ تھے۔ نیک انسان ہیں اس لئے ابھی تک نبھ رہی ہے۔

دلّی قیام کے دوران ان کے یہاں بھی قیام رہا اور گفتگو بھی تا دیر رہی۔ بیباک سے وابستگی کی خواہش تو پہلے ہی تھی معلوم ہوا کہ ترقی پسند خیالات کا حامی ہے تو اشتیاق اور بڑھا۔ میں خود پروفیسر محمد حسن صاحب کا شاگرد ہوں اور اس نظریئے کو افضل مانتا ہوں۔ میرے مضامین سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔ میرا تعلق مئوناتھ بھنجن سے ہے۔ ۱۹۸۶ء سے بڑودہ یونیورسٹی سے وابستہ ہوں۔ ساحر لدھیانوی، حیات اور کارنامے پر مجھے پی ایچ ڈی کی ڈگری اسی یونیورسٹی سے ملی ہے اور میں نے یہ کام بغیر نگراں کے Unde Self Guidance اسکیم کے تحت مکمل کیا ہے۔ بعد میں ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ نے اسی نام سے کتاب بھی شائع کر دی ہے۔ یقین ہے آپ کی نگاہ سے گزری بھی ہو۔ مضمون سے متعلق اپنی رائے اور رسید سے نوازیئے گا تو مجھے بہت اچھا لگے گا۔

فیض احمد فیض کی یاد میں خصوصی تقریب

لاہور۔فیض کی شاعری میں بات خواہ داغ داغ اجالے کی ہو، سر وادی سینا کی ہو یا ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے کا ذکر ہو، فیض کی شاعری میں اول تا آخر انسان کا دکھ ہے، وہ عوامی شاعر تھے اور انہوں نے دنیا بھر کے مظلوموں کے حق میں صدائے احتجاج بلند کئے رکھی۔ تیسری دنیا قحط الرجال کی نہیں بلکہ قہر رجال کی ماری ہوئی ہے۔ان خیالات کا اظہار ممتاز مزاح نگار اور دانشور مشتاق احمد یوسفی نے مقتدرہ قومی زبان کے زیر اہتمام "فیض احمد فیض" کی یاد میں خصوصی تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کیا۔ انہوں نے مزید کہا کہ فیض کی ہمہ گیر شاعری اور ان کی شخصیت کی سحر انگیزی پڑھنے والوں کو اپنا گرویدہ کئے دیتی ہے ان جیسا مقام اور توقیر اب تک کسی بڑے شاعر کے حصے میں نہیں آئی۔ مشتاق احمد یوسفی نے اپنی روایتی شگفتہ بیانی سے لندن میں فیض کے ساتھ ملاقاتوں کا ذکر بڑے، دلچسپ پیرائے میں کرتے ہوئے بہت سے واقعات بیان کئے۔ایک واقعہ یوں سنایا کہ ایک صبح جب میں فیض صاحب سے ملنے پہنچا تو انہوں نے کہا میاں ہم تو ہائیڈ پارک ... کرنے جارہے ہیں۔ مجھے بہت مایوسی ہوئی کہ میں تو ان کی صحبت سے مستفید ہونے گیا تھا۔ کچھ دیر بعد ایک خاتون تشریف لائیں جو کچھ زیادہ ہی خوش لباس تھیں۔انہیں دیکھ کر فیض صاحب نے مجھ سے کہا "میاں یوسفی اب آپ ہائیڈ پارک واک کر آئیں ہم تو اب یہیں ہیں۔" یوسفی صاحب نے کہا کہ افتخار عارف نے مقتدرہ کی طرف سے فیض اور دیگر مشاہیر پر جو کتابیں شائع کی ہیں وہ فیض کے طالب علموں اور تحقیق نگاروں کے لئے نادر ذخیرہ ہیں۔ "فیض بہ نام افتخار عارف" کتاب کی اشاعت سے افتخار عارف نے اپنے تصویری خزانے کو گنج عام کرکے وسیع القلبی کا ثبوت دیا ہے۔ قبل ازیں ممتاز شاعر اور مقتدرہ کے صدر نشین افتخار عارف نے کہا کہ مشتاق احمد یوسفی اسلام آباد آئیں اور یہاں کے موسم شرارت نہ کرے یہ ہو ہی نہیں سکتا۔انہوں نے مزید کہا کہ فیض احمد فیض ہماری تہذیبی و ادبی زندگی کی قد آور شخصیت ہیں جن کی شخصیت کے کئی پہلو ہیں۔ فیض صدی تقریبات کا بھرپور آغاز ہو چکا ہے جو سال بھر جاری رہے گا۔ انہوں نے تقریب میں شریک ممتاز اہل علم و ادب کا شکریہ ادا کیا اور مشتاق احمد یوسفی کو اظہار خیال کی دعوت دی۔

رونق جمال کو صدمہ عظیم

رونق جمال کی والدہ محترمہ نواب قمر النساء پروین کا پانچ مارچ ۲۰۱۱ء بروز جمعہ کو حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال ہو گیا۔ان کی عمر اسی (۸۰) سال تھی۔ رونق جمال کے علاوہ ان کے دو بیٹے روشن کمال اور اختر اقبال اور دو بیٹیاں شبانہ سمیع و تمنا شکیل ہیں۔ اللہ سے دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے اور ان تمام متعلقین کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ آمین!

(تمنا خان، درگ، بھلائی واداروبیباک مالیگاؤں)

رونق جمال کے افسانہ "عبادت" کی پذیرائی

سامعین جذبات سے مغلوب



مدھیہ پردیش اردو اکادمی نے کل ہند پیمانے پر شب افسانہ کا اہتمام کیا جس میں درگ چھتیس گڑھ سے رونق جمال، جھارکھنڈ سے اسلم جمشید پوری، دہلی سے عذرا نقوی اور بھوپال ایم پی سے نعیم کوثر صدیقی نے شرکت فرمائی۔ رونق جمال نے ڈاکٹر صفات علوی ساکن انگلینڈ پدرس فیلڈ یونیورسٹی کی مرتب کردہ کتاب "یوتھینیزیا" میں شامل اپنا افسانہ عبادت سنایا جسے بے حد پسند کیا گیا۔کہانی سن کر ہال میں موجود کئی خواتین و حضرات کی آنکھیں نم ہو گئی تھیں۔ کاروان ادب بھوپال کے مدیر جاوید یزدانی صاحب نے رونق جمال کو گلے لگایا اور کہا میاں کہانی سن کر زندگی میں پہلی بار رو یا ہوں!! شب افسانہ میں بحیثیت مہمان خصوصی معروف استاد افسانہ نگار جناب اقبال مجید صاحب اسٹیج پر موجود تھے ان کے ہمراہ اسٹیج پر اکادمی کے چیئرمین بشیر بدر صاحب، نائب صدر بیگ صاحب، سکریٹری نصرت مہندی صاحبہ بھی موجود تھیں۔ سامعین میں مدیر و کہانی کار جناب کوثر صدیقی صاحب، مدیر جاوید یزدانی صاحب، افسانہ نگار نثار راہی صاحب اور بھوپال کے کئی نامور قلمکار و سامعین موجود تھے۔ شب افسانہ کے اختتام پر اقبال مجید صاحب نے چاروں افسانہ نگاروں کے افسانوں پر روشنی ڈالی اور خصوصاً رونق جمال کے افسانے "عبادت" کی تعریف کرتے ہوئے ان کی حوصلہ افزائی کی اور کہا رونق جمال آج بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ مستقبل میں بھی ان سے اردو ادب کو کافی امیدیں ہیں۔ چیئرمین بشیر بدر نے رونق جمال کو گلدستہ پیش کیا۔

(تمنا خان، سکریٹری انجمن ترقی درگ بھلائی شاخ)

آبروئے لوح وقلم — مصنف: شائل ادیب ایم اے — قیمت: ۱۵۰ روپے

رابطہ: شائل ادیب، ۳/۹/۴-۳۰۴-۴-۱، زیب منزل، حیدرآباد ۴۸ — تبصرہ نگار: ڈاکٹر الیاس صدیقی

شائل ادیب اردو دنیا کے لئے ایک جانا پہچانا نام ہے۔ مختلف رسائل وجرائد میں ان کی نوبہ نو تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں جن کے ذریعے انھوں نے اپنی شناخت کو مستحکم کیا ہے۔ موصوف نے نصف صدی سے بھی زیادہ اردو زبان وادب کی خدمت میں گذارا ہے۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو کر مقبول خاص وعام ہو چکی ہیں۔ ۸ مجموعہ ہائے کلام اور نثر کی ۶ کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ عمر کی پچھترویں منزل پر بھی ان کا قلم رواں دواں اور ذہن تحقیق وتنقید میں فعال ہے جس کا ثبوت ان کے تنقیدی وتحقیقی مضامین کا زیر تبصرہ مجموعہ "آبروئے لوح وقلم" ہے چونکہ تبصرہ نگار کی نظر میں یہ ایک اہم کتاب ہے اس لئے قدرے تفصیلی تبصرہ کو بہتر جانتا ہے۔ پیش لفظ قمر جمالی صاحبہ (مدیرہ تناظر، حیدرآباد) نے تحریر فرمایا ہے جس میں ادبیت کی خوشبو رچی بسی ہے۔

کتاب میں کل ۱۳ عنوانات پر مضامین شامل ہیں۔ پہلا مضمون "اردو شاعری کا ماہ تمام، پروین شاکر" اگرچہ محض ۶ صفحات پر پھیلا ہے لیکن شاعرہ کی شخصیت، فن اور شاعری کا جامع احاطہ کرتا ہے۔ اس میں مختصراً شاعرہ کی سوانح کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ یہ جملہ شائل ادیب کی تنقیدی بصیرت پر دال ہے۔ "قدرت نے انھیں جو نسائی بصیرت عطا کی تھی، وہی ان کی شاعری کے لب ولہجہ کی امین بنی۔"

ڈاکٹر فراز حامدی کے تعلق سے تحریر کردہ ایک جاندار مضمون میں انھوں نے ماہیا، دوہے، دوہا گیت، سری گیت وغیرہ میں جو خدمات انجام دی ہیں اور جو تجربات کئے ہیں، انھیں بیان کیا گیا ہے۔ "حیدرآباد میں حمدیہ ومناجاتی شاعری، بیسویں صدی کے دوسرے نصف میں" ایک قابل قدر، قدرے تفصیلی مضمون ہے جس میں ۱۶ شعراء کے مختصر سوانح کے ساتھ ان کی شاعری سے حمدیہ شاعری کی مثالیں تلاش کی گئی ہیں۔ دیگر ۳ شعراء کے تعلق سے صرف مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ اگر موصوف مزید محنت وتوجہ صرف کرتے تو ایک مبسوط کتاب تیار ہو سکتی تھی۔ "عاصی کاشمیری کا اسلوب غزل" میں موصوف کی ادبی خدمات کے ساتھ ساتھ ان کے تین مجموعہ غزلیات کی روشنی میں اسلوب غزل اور فکر وفن کا فنکارانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ "آندھرا پردیش اور کرناٹک کے ماہیا نگار" بھی ایک تحقیقی مضمون ہے جس میں دونوں جنوبی ریاستوں میں اردو ماہیا نگاری کرنے والے ۱۳ شعراء کا تذکرہ اور کلام کی مثالیں شامل ہیں۔

فیض الحسن خیال بنیادی طور پر نظم کے شاعر ہیں جن کے پانچ شعری مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔ شائل ادیب نے "فیض الحسن خیال کا شعری شناس نامہ" میں موصوف کے شعری موضوعات اور شاعرانہ پس منظر کا خصوصی جائزہ پیش کیا ہے۔ بعد ازاں ساحر شیوی کے حمدیہ ونعتیہ ماہیوں کا جائزہ شامل ہے۔ ساحر شیوی نے ہر صنف سخن یعنی نظم، غزل، حمد، نعت، منقبت، سلام، قطعہ، رباعی کے علاوہ ماہیا، ہائیکو اور دوہا وغیرہ پر بھی طبع آزمائی کی ہے لیکن اس مضمون میں ان کے حمدیہ ماہیوں پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔ جس طرح شمالی ہند میں دہلی اور جنوبی ہند میں حیدرآباد کو بطور اہم اردو مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے، اسی طرح وسط ہند میں ناگپور بھی ایک اہم مرکز ہے۔ محفوظ اثر کا تعلق اسی مقام سے ہے۔ "محفوظ اثر کا شعری رویہ" ان کے اولین شعری مجموعہ "نقش خیال" کی روشنی میں لکھا گیا ہے۔ مشہور محقق ڈاکٹر لطیف سبحانی کی تحقیقی، تخلیقی اور تنقیدی سرگرمیوں اور صلاحیتوں سے ایک دنیا واقف ہے۔ انھوں نے "ودربھ میں اردو صحافت" کے نام سے ایک قابل قدر تحقیقی کتاب لکھی ہے۔ شائل ادیب نے اس کتاب پر بہترین انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ ڈاکٹر شباب للت، ڈاکٹر ودیا ساگر آنند اور غفور انیس کی شاعری کے تعلق سے تین مضامین بھی خوب ہیں۔

شائل ادیب کے ان مضامین سے نہ صرف ان کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادبی منظر نامہ کے "میمنہ میسرہ" سے بھی کماحقہ واقف ہیں۔ مطلب یہ کہ ان کا مطالعہ صرف مشہور اصناف سخن تک محدود نہیں ہے بلکہ ان اصناف کی نزاکتوں کا شعور بھی رکھتے ہیں جنھیں "متفرقات" میں شمار کیا جاتا ہے۔ البتہ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ موصوف منفی رائے اور مثبت مشورہ دینے سے ہمیشہ دامن بچالے جاتے ہیں۔ بایں ہمہ امید کی جاسکتی ہے کہ یہ کتاب اہل علم وذوق کی تسکین اور طالبان ادب کے استفادے کے کام آئے گی۔

آواز تم نے جب دی — مرتب: عنایت علی — قیمت: ۱۵۰ روپے — تبصرہ نگار: ڈاکٹر الیاس صدیقی

ناشر: دلرس ایجوکیشنل، کلچرل، چیریٹیبل اینڈ لیٹریری سوسائٹی، پلاٹ نمبر ۲۹، سکندر علی وجد روڈ، دلرس کالونی، آصف باغ، گھاٹی، اورنگ آباد ۴۳۱۰۰۱

شہر خجستہ بنیاد، اورنگ آباد کی تاریخی حیثیت مسلم ہے لیکن اس کے علاوہ بھی اورنگ آباد قدیم زمانے سے ایک علمی ادبی اور تہذیبی مرکز کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس خوبصورت شہر کی مٹی کے ہر ذرہ میں علم وفن کی خوشبو بسی ہے۔ جس قدر جلیل القدر ہستیاں یہاں سے اٹھیں یا جن عظیم شخصیات کی تشکیل اس شہر میں ہوئی ان کی ایک طویل فہرست ہے۔ خصوصاً گذشتہ صدی میں جن لائق قدر شخصیات کی قلبی وابستگی اس شہر سے رہی، اس کی بناء پر اسے "باکمالوں کا شہر" نام دیا جاسکتا ہے۔ انھیں قابل ذکر شخصیتوں میں ایک نام مرحوم اختر الزماں ناصر کا بھی ہے۔ عنایت علی کی مرتب کردہ زیر تبصرہ کتاب "آواز تم نے جب دی" دراصل مرحوم ناصر صاحب کی شخصیت، کارہائے نمایاں، سوانح، ادبی وعلمی خدمات، ان کے فن اور شاعری کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔

کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اختر الزماں ناصر نے بطور شاعر، ادیب، معلم اور ماہر اقبالیات کے شہرت حاصل کی۔ خصوصاً علامہ اقبال کے افکار وخیالات سے عوام کو

متعارف کروانے میں ان کی کوششیں ناقابل فراموش ہیں۔ انھوں نے اقبال اکاڈمیوں کی تشکیل کی، یوم اقبال منانے کی روایت ڈالی، اقبال کی شاعری پر مضامین لکھے اور اقبالیات کے تعلق سے درس وتقاریر کا سلسلہ جاری کیا جو اخیر عمر تک جاری رہا۔ اورنگ آباد اور مراٹھواڑہ کے دیگر علاقوں میں منعقدہ کوئی بھی علمی مجلس، سیمینار، کانفرنس، مشاعرہ، کتابوں کی تقریب رونمائی اور یوم اقبال کی تقریبات موصوف کی شرکت کے بغیر ادھوری رہتی تھیں۔

آج کل یونیورسٹیوں میں ہرکس وناکس نے تحقیقی کام کرنے کا گویا "دھندا" اٹھالیا ہے۔ "فلاں ابن فلاں، فن اور شخصیت" قسم کے مقالوں کا تو انبار لگا ہوا ہے جن کا معیار جگ ظاہر ہے۔ شاید اسی کے پیش نظر مرتب کتاب نے کتاب کا عنوان "اختر الزماں ناصر فن اور شخصیت" دینے کی بجائے مرحوم کے ایک شعر سے عنوان اخذ کیا ہے، جو قابل تحسین ہے۔ زیر تبصرہ کتاب میں سب سے پہلے "باب شخصیت" کے تحت ۱۶ علمی وادبی شخصیتوں کی تحریریں شامل ہیں۔ "باب فن" عنوان کے تحت ملک و بیرون ملک کے مقتدر، ممتاز و معتبر شعراء و ادباء نے موضوعات کے فن کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔ ان میں وارث علوی، حمایت علی شاعر، زبیر رضوی، ندا فاضلی، فضیل جعفری، اور بشر نواز وغیرہ کی شرکت نے کتاب کی وقعت میں اضافہ کردیا ہے۔ "باب اقبالیات" میں اختر الزماں ناصر کی تحریر کردہ اقبال کی بعض نظموں کی شرحیں اور تقریریں شامل ہیں۔ "باب نثر" میں ناصر صاحب کے چند مضامین ہیں اور "باب شاعری" میں ان کی نعتوں، غزلوں اور نظموں کا ایک مختصر انتخاب شامل ہے۔

باب اقبالیات کے مضامین موصوف کو اقبالیات کا ماہر ثابت کرتے ہیں نیز یہ کہ تفہیم اقبال کے تعلق سے ان کا اپنا زاویہ نظر بھی تھا۔ ان کے ذریعے موصوف ایک مستند شارح اقبال کے روپ میں سامنے آکر اپنی تفہیمی اور تدریسی صلاحیتوں کا لوہا منواتے ہیں۔ اسی طرح باب نثر انہیں ایک تنقید نگار، تبصرہ نگار اور تجزیہ نگار کے روپ میں سامنے لاتا ہے۔ البتہ باب شاعری میں شامل ان کی غزلوں اور نظموں پر تفصیلی نظر ڈالنے کی ضرورت ہے۔ تبصرہ نگار کو اس میں بہت سی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ اسی طرح موصوف کی نثری تخلیقات، خصوصاً علامہ اقبال کے تعلق سے ان کی تحریروں کے حسن وقبح کا بھی بھرپور طریقے سے جائزہ لینے اور بہ نظر غائر مطالعہ کرنے کی ضرورت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ ناصر صاحب کی نثری تحریروں کا تنقیدی مطالعہ شعروسخن کے ساتھ انہیں تنقید، تشریح، تجزیہ اور تبصرہ میں بلند مقام پر فائز کرسکتا ہے۔ ادب کے طلبہ اور اساتذہ کے لئے اس کتاب میں درس وتدریس کے سیکڑوں عناصر موجود ہیں جن سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔

دلرس سوسائٹی مبارکباد کی مستحق ہے کہ اس نے عام روش سے ہٹ کر نہ صرف ناصر صاحب کی شخصیت اور فن کا آئینہ پیش کیا ہے بلکہ مرحوم کی علمی، ادبی، سماجی، تدریسی اور تخلیقی خدمات کو سچا خراج عقیدت پیش کیا ہے۔

قلم کی روشنی	مرتب: حامد لطیف ملتانی قادری	قیمت: ۱۵۰روپے	ناشر: محفل ادب، آندھرا پردیس، حیدرآباد
دستیابی کا پتہ: ایوان قادری، ۳۔۸۷۳-۱-۲۱ سلطان پورہ، حیدرآباد (اے پی)		تبصرہ نگار: ڈاکٹر الیاس صدیقی	

"قلم کی روشنی" خود مرتب اور ان کی کتابوں کے تعلق سے لکھی گئی تحریروں کا مجموعہ ہے۔ آج کل اسی قسم کی کتابوں کا چلن عام ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابوالفتح شمس الدین ملتانی بادشاہ قادری، شہر بیدر کے مشہور بزرگ تھے جو بہمنی سلطنت کے زمانے میں گذرے۔ یہی حامد لطیف صاحب کے جداعلیٰ ہیں۔ حامد للطیف صاحب کے تعارف میں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے مضمون نگاری اور صحافت وغیرہ میں جو سرمایہ پیش کیا ہے اس کا مقصد محض تصنیف وتالیف نہیں ہے بلکہ ان کا مقصد تاریخی شہر حیدرآباد کے دوسو سالہ تہذیبی، علمی وادبی ورثے کی حفاظت ہے۔ زیر تبصرہ کتاب دراصل ان کی شائع شدہ سات کتابوں پر تحریر کردہ پیش لفظ، تبصروں اور مضامین کے علاوہ ادیبوں اور صحافیوں کے موصوف کے نام لکھے گئے خطوط، نیز ان کی شخصیت اور کتابوں پر لکھے گئے تہنیتی کلام پر مشتمل ہے۔

کتاب سے "ظاہر" ہوتا ہے کہ مرتب کتاب عہد حاضر کے ایک اچھے نثر نگار ہیں۔ وہ شاعر تو نہیں البتہ شعر فہم ضرور ہیں۔ موصوف کئی ایک علمی وادبی اداروں اور انجمنوں کے ذمہ دارانہ عہدوں پر فائز رہتے ہوئے اردو زبان وادب کی گذشتہ نصف صدی سے خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ان کی پہلی کتاب "دکن کا تاریخ گو شاعر" جون ۱۹۷۹ء میں طبع ہوئی جس میں انہوں نے علامہ حکیم عاشق حسین ہاتف اور ان کے فرزند حکیم خواجہ شفیع حسن عارف ابوالعلائی کی شاعری، تاریخ گوئی اور بحیثیت طبیب ان کی خدمات کو تفصیل سے بیان کیا ہے۔

ان کی دوسری تصنیف "عہد عثمانی کا تاریخ گو شاعر" (۱۹۸۷ء) فن تاریخ گوئی پر خاصی معلومات فراہم کرتی ہے۔ تیسری کتاب "سلطان العلوم اور ان کی خدمات" (۱۹۹۳ء) میں سلطان العلوم آصف جاہ سابع نواب میر عثمان علی خان بہادر کے تعلیمی کارناموں کا بیان ہے۔ چوتھی کتاب (۱۹۹۹ء) "ہمارے دیش کی مٹی سونا ہے" بچوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں ہندوستان کے تاریخی ورثے اور جغرافیائی وسائل کا بیان کرکے دیش کی مٹی کو سونا ثابت کیا گیا ہے۔ دیدۂ بیدار (۲۰۰۳ء) ان کی پانچویں کتاب ہے جس میں حضرت حکیم عاشق حسین ہاتف کو بیک وقت طبیب حاذق اور صوفی منش انسان کے طور پر ابھارا گیا ہے۔ چھٹی کتاب ذائقے (۲۰۰۳ء) میں مرتب کے مذہبی، تاریخی، سماجی ومعلوماتی مضامین یکجا کئے گئے ہیں۔ ان میں بعض مضامین نقطہ نظر سے اہم "بتائے" گئے ہیں۔ ساتویں کتاب (۲۰۰۶ء) "بات کہی کبھی کبھی" میں بھی اسی قسم کے مضامین شامل ہیں۔

اس کتاب سے حضرت حامد لطیف ملتانی قادری صاحب کی ہمہ جہت شخصیت اور ان کے فن اور فکر ہی کا نہیں بلکہ ان کی علمی، ادبی، مذہبی سرگرمیوں اور ان کی گراں قدر خدمات کا بھرپور تعارف ہوجاتا ہے۔ اس لحاظ سے کتاب اپنے مقصد میں کامیاب ہے۔

اس قسم کی کتابوں کی سب سے بڑی خاصیت یہ ہے کہ قاری کے سامنے اصل متن موجود نہیں ہوتا جسے پڑھ کر وہ اس کے حسن وقبح، عیوب ومحاسن کا خود فیصلہ کرسکے۔ دوسرے یہ

کہ جن لوگوں کی آراء کتاب میں شامل ہیں، اصل متن کی عدم موجودگی میں یہ فیصلہ نہیں ہوتا کہ وہ کتنا سچ بول رہے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ اسے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصل متن کیسا ہے اور کتنا ہے اور بس! کتابوں کے تعلق سے پیش کردہ آراء اور تبصروں کی روشنی میں اگر قاری میں اصل متن کے پڑھنے کی خواہش جاگتی بھی ہے تو اس متن تک رسائی ایک مسئلہ ثابت ہوتی ہے۔

بہرحال جنھیں حامد لطیف ملتانی قادری سے غائبانہ ملاقات اور ان کے کارناموں کو جاننے کا شوق ہو یہ کتاب ان کے کام آسکتی ہے۔

کلام راہی اور صنائع بدائع	مصنف: محمد ادریس رضوی ایم اے	قیمت: ۱۵۰ روپئے
ناشر: مصنف، سنی جامع مسجد، پتری پل، کلیان ۴۲۱۳۰۶		تبصرہ نگار: ڈاکٹر الیاس صدیقی

صحت زبان کے بارے میں سنجیدگی اور بیان کے سلسلے میں حزم و احتیاط اب خواب ہوتی جارہی ہے۔ وہ علماء و ادباء جن کے جملے بطور حوالے پیش کئے جاسکیں روز بہ روز کم ہوتے جارہے ہیں۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں درس و تدریس کی صورت حال سے ایک زمانہ واقف ہے۔ اس کے علاوہ اساتذہ اور طلبہ کی لسانی صلاحیتوں اور استعداد کا گراف جس تیزی سے نیچے آیا ہے وہ اردو کے ہر سنجیدہ قاری کو فکر ہی نہیں کرب میں مبتلا کرنے کے لئے کافی ہے۔ زبان میں فصاحت و بلاغت اور صنائع بدائع کے استعمال کے تعلق سے اور زیادہ بے حسی کا مظاہرہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اس ماحول میں جب "کلام راہی اور صنائع بدائع" جیسی علمی کتاب منظر عام پر آتی ہے تو مایوسی کے بادل چھٹنے لگتے ہیں اور امید و رجا کا سورج دوبارہ پوری آب و تاب سے جلوہ گری کرنے لگتا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب اپنی نوعیت کی ایک انوکھی، منفرد اور مفید تصنیف ہے۔ عموماً یہ دیکھا جاتا ہے کہ زبان کی لفظی و معنوی خوبیاں بیان کرنے کے لئے بلاغت کی جو کتابیں لکھی جاتی ہیں ان میں یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ ایک مخصوص صنعت کی تعریف بیان کرنے کے بعد مختلف شعراء کے کلام سے ایک دو مثالیں پیش کر دی جاتی ہیں۔ ایسا شاذ و نادر ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ صنعتوں کے بیان کے بعد کسی ایک شاعر کے یہاں پائی جانے والی مثالیں تلاش کر کے انھیں یکجا کیا گیا ہو۔ مولانا محمد ادریس رضوی صاحب ایم اے نے اس ضمن میں غلام مرتضیٰ راہی ایم اے کے کلام کا بجا طور پر انتخاب کیا ہے اور ایک "ماہر اسلوبیات کی طرح زبان کی ہر سطح پر راہی کے کلام کی اسلوبی خصوصیات کو دریافت کیا ہے۔"

غلام مرتضیٰ راہی ایم اے اردو کے ایک ممتاز شاعر ہیں۔ اردو میں ان کے پانچ شعری مجموعے اور ایک ہندی میں شائع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں دو مثنویاں اور ایک خود نوشت سوانح عمری بھی ان کی تخلیقات میں شامل ہے۔ کسی بھی شاعر کے کلام کی تفہیم، تشریح یا تجزیہ کے لئے جملہ شعری علوم، شعر کے عیوب و محاسن، شعر و سخن کی روایت کے علاوہ علم بیان و معنی کا جاننا ضروری ہے۔ ورنہ کلام کی تشریح کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ خوش قسمتی سے کلام غلام مرتضیٰ راہی اس قابل ہے کہ اسے تجزیاتی مطالعے کا ہدف بنایا جاسکے اور مولانا ادریس رضوی میں وہ صلاحیت و استعداد ہے کہ وہ کلام راہی میں صنائع بدائع دریافت کر کے قاری کے سامنے رکھ سکیں۔

زیر تبصرہ کتاب میں پہلے تو مصنف نے مختلف لفظی و معنوی صنعتوں کے عنوانات قائم کئے ہیں پھر ان کی تعریف، توضیح اور تشریح کے لئے مختلف کتب اور لغات سے استفادہ کیا ہے۔ اس راہ سے وہ نہ صرف منشائے شاعر تک پہنچنے میں کامیابی پاتے ہیں بلکہ کلام کے سمندر میں غوطہ زنی کر کے لفظی و معنوی صنعتوں کے گوہر آبدار کے حصول میں بھی کامیاب رہتے ہیں۔ اس کام کے لئے بڑے ریاض کی ضرورت ہے لیکن رضوی صاحب نے بہتر طریقے سے نبھایا ہے جو قابل قدر بھی ہے اور لائق تحسین بھی۔ اس کتاب میں انھوں نے مختلف تجانیس کے علاوہ تصدیر، صنعت قلب، تضاد، تلمیح، ایہام، مراعات النظیر، تجاہل عارف، واسع الشفتین، تشبیہ، استعارہ، کنایہ، مجاز مرسل سے لے کر پیکر تراشی، محاورے اور شاعرانہ تعلی تک کی خوبیاں کا بیان کیا ہے۔

محمد ادریس رضوی کے قلم مہارت رقم کا کمال بے مثال یہ ہے کہ مختلف صنعتوں کی وضاحت کے دوران کچھ ایسے شعری محاسن بھی خود بخود سامنے آتے چلے جاتے ہیں جن کے لئے کوئی عنوان نہیں قائم کیا گیا ہے۔ کتاب کے اختتام پر وہ قاری تک یہ تاثر پہنچانے میں کامیاب رہتے ہیں کہ راہی کی شاعری نہ صرف گنجینۂ معنی کا طلسم ہے بلکہ زبان و بیان کی گوناگوں خوبیوں سے بھی متصف ہے۔ یہ کتاب ادب کے طلبہ و اساتذہ کے لئے تحفۂ بے بہا کا حکم رکھتی ہے۔ البتہ ایک عرض یہ کرنی ہے کہ حد سے بڑھی ہوئی عقیدت کبھی کبھی انصاف کا دامن داغ دار کر دیتی ہے ورنہ کلام راہی میں بعض اسقام ایسے ضرور ہیں جن کی نشان دہی کی جاسکتی ہے اگر چہ کم۔ لیکن ایک سچے ناقد کو عیوب و محاسن کے دونوں پہلوؤں پر نظر رکھنا ضروری ہے۔ اگر ایسا کیا جاتا تو کتاب کی قدر و قیمت و افادیت دو چند ہو جاتی۔

درد کی حد سے پرے (افسانے)	افسانہ نگار: جتیندر بلو	تبصرہ نگار: احمد عثمانی	ناشر: الیاس شوقی
قیمت: ۲۰۰ روپے			

مصنف کا پتہ: 6, Corfton Lodge, Corfton Road, EALING, London WS 2H4 UK

تقسیم کار: قلم پبلی کیشنز، ۱۷/۱۷، ایل آئی جی کالونی، کرلا (مغربی) ممبئی ۷۰ — کتاب دار، ۱۰۸/۱۱۰، جلال منزل ٹیمکر اسٹریٹ ممبئی ۴۰۰۰۰۸

سیفی بک ایجنسی، امین بلڈنگ، ابراہیم رحمۃ اللہ روڈ، نزد جے جے اسپتال جنکشن ممبئی ۳ — مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ ممبئی، دہلی، علی گڑھ

جتیندر بلو نے "درد کی حد سے پرے" کو اپنے پیغمبری دور کے دوست ندا فاضلی اور بھلے وقتوں کے دوست انور قمر اور الیاس شوقی کے نام کی ہے۔ بھلے برے وقت کو یاد کرنے والے جتیندر بلو نے پردیس بسایا لیکن اردو کو ہمیشہ اپنے فن میں سجا کر رکھا۔ بلو جو ۱۹۷۵ء تک ممبئی میں زندگی بسر کرنے کے لئے جدوجہد کر رہے تھے لیکن کامیابی کی منزل کہیں اندھیرے میں گم ہوگئی تھی اس لئے اجالے کی کرن پردیس میں ہی نظر آئی۔

جتیندر بلو نے بدیس جاتے ہی اردو ادب کو پرائی دھرتی اپنے لوگ سے واقف کرایا۔ پھر ایک افسانوی مجموعہ پہچان کی نوک سے پنجاب کرائی۔ اپنے دیسی، بدیسی تجربات کو ایک ناول مہانگر میں ڈھالا۔ پھر ان کا قلم رکا نہیں انہوں نے پھر ایک افسانوی مجموعہ جزیرہ ابھار دیا۔ نیا دیس نیا ہوتا ہے اس میں کیا کیا بیتتی ہے انہوں نے نئے دیس میں سمو دیا۔ پھر جہاں جہاں اعتقاد اور ایمان کا ٹکراؤ ہوا سے وشواس گھات میں ڈبو دیا۔ زندگی میں اتنے چکر کاٹے اور کھائے کہ ایک افسانہ چکر لکھ کر مجموعہ ترتیب دے ڈالا۔ پھر سودا ایسا مجموعہ اردو ادب کو دیا اور انجانا کھیل سے بھی واقف کرایا۔

زیر نظر مجموعہ "درد کی حد سے پرے" ان کی دسویں تخلیق ہے۔ اس مجموعے کے سرنامے درد کی حد سے پرے کو مزید واضح کرنے کے لئے پکاسو کی ایک نادر پینٹنگ دی گئی ہے۔ پینٹنگ دیکھ کر ہی "درد کی حد سے پرے" کا بھرپور تاثر ابھرتا ہے۔ سرنامے کے افسانے "درد کی حد سے پرے" کو جتیندر بلو نے سات سمندر ڈوب کر لکھا۔ افسانے میں افسانہ نگار کا ذاتی کمٹ منٹ نہیں ہے۔ افسانہ خود بخود آگے بڑھتا ہے اور کہانی بنتی چلی جاتی ہے۔ اردو ادب ہی نہیں دنیا کے ہر ادب نے داستان کو ناول کی روپ ریکھا دی۔ کہانی نے افسانے کا روپ دھارن کیا اور ماں کی ہک اور میٹھی لوری نے شاعری کی منزل پر پڑاؤ ڈالا۔ جتیندر بلو کو کہانی سے افسانہ بننے کا ہنر بہت خود آتا ہے۔ رمن بھائی کے اندر آخری عمر کا جو درد چھپا ہوا ہے اسے بلو نے بڑی خوبصورتی سے الفاظ کا لباس پہنایا ہے۔

بڑا بیٹا جب باپ، وہ باپ جس نے اس کے لئے زندگی لگا دی، کہتا ہے:

"باپو! میا (ماں) چلی گئی۔ آپ اکیلے رہ گئے ہو۔۔۔ دیکھ بھال کرنا کھانا بنانا وقت کاٹنا اکیلے میں مشکل ہوگا۔۔۔ روگ بھی پرانا ہے۔ آپ ٹھیک سمجھو تو کیئر ہوم میں بات کریں۔"

بیٹے کی اس بات سے رمن بھائی پر جو گذری وہی درد کی حد سے پرے ہے۔

اس مجموعے کے افسانوں کو پڑھ کر محسوس ہوا کہ جتیندر بلو نے پہلے رنگ برنگے ریشم کے دھاگوں کو الجھایا پھر دھیرے دھیرے انہیں سلجھایا اور افسانہ بنا۔ رنگ دار، سوچ دار، چمک دار، جہاں کبھی کبھی جملے تمنائی شاعری کی حد میں داخل ہو گئے ہیں۔ "سرراہ" کہانی نئے انداز میں لکھی ہوئی ہے۔ اس کی خوبیاں پڑھنے کے بعد ہی اجاگر ہوتی ہے۔

"سریندر پرکاش سے ایک مختصر مکالمہ" کہانی کی طرح پھیلا ہوا ہے لیکن ہے خاصے کی چیز جسے پڑھ کر ذہن میں سجایا جا سکتا ہے۔ سریندر پرکاش کہتے ہیں:

"تمہاری کہانیوں میں کہیں مغرب نے مشرق کو جھٹلایا ہے تو کہیں وہ اس کے نزدیک آیا ہے۔۔۔ تم نے ٹھیک جانا۔۔۔ غیروں کی دھرتی پر رہ کر تارکین وطن کو کانوبل کمپلیکس اور سفید چمڑی کے احساس برتری سے نجات پانے کا موقع بھی نصیب ہوا۔۔۔ ورنہ فرنگی ہمارے ماں باپ رہے تھے اور ہم ان کے دست بستہ غلام۔"

یہ مختصر سا اقتباس ضروری تھا کہ اسے تبصرے کا حصہ بنایا جائے۔ اس سے سریندر پرکاش کی سوچ اور جتیندر بلو کی تحریری اٹھان دونوں واضح ہوتے ہیں۔

کلیم شوقی نے بہت خوبصورتی سے کتاب کو سجایا ہے۔ خاص بات یہ ہے کہ اس میں غلطیوں کا نمک نہیں ہے۔ صاف ستھری کتاب ہے۔ جلد بھی اچھی ہے۔



بیٹھے ہوئے (دائیں سے) سراج دلار، اسحاق خضر، ہارون بی اے (چیئرمین استقبالیہ کمیٹی) اظہار سلیم، ریاض احمد (سینٹرل مینا)۔
دوسری صف میں (دائیں سے) مسعود رمضان پینٹر، آصف سبحانی، عثمان غنی اسکس، خیال اثر مالیگانوی، عبداللہ لال مالیگ

MAHNAMA BE-BAAK
Vol.5 - No.56 - May 2011 Regn. No. MAHURD/2006/18722
Postal Regd. No. L.No. L.1/RNP/MGN-101/2008-2011

Printed, Published and Owned by HAROON B.A. and Printed at Aqsa Offset Press, Mulla Bada Road, Malegaon and Published at S.No.18/6/2, Old Agra Road, MALEGAON Editor : HAROON B.A.

